www.urdudigest.pk

وصی شاہ کا نیا کالم "موضوعِ سخن"

"تربیت ہی بشر کو انسان بناتی ہے...."

اُردو ڈائجسٹ

مسلسل اشاعت کے ۵۲ سال

مارچ ۲۰۱۲ء

صحت

کھیل

انکشافات

غیر ملکی ادب

تاریخی حیرتیں

نئی کتابیں

بزنس رول ماڈلز

سنسنی خیز کہانیاں

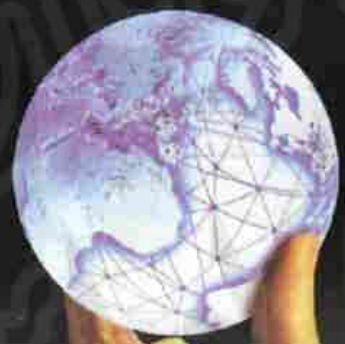

"ہم نے پہلی مرتبہ پنجاب کی آنکھوں میں آنسو دیکھے، اگرچہ یہ آنسو کانی آنکھ کے ہیں"

سردار عطا اللہ مینگل

وہ آج کی دنیا کا سب سے

مؤثر انسان

کیسے بنا؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

اللہ کن سے راضی ہوتا ہے

★ ''اگر خیرات ظاہر کر کے دو تو وہ بھی خوب ہے (اگر مقصد دوسروں کو ترغیب دینا ہو) اور اگر چھپا کر فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ بہت بہتر ہے (تاکہ لینے والا نہ شرمائے) اور (اس طرح دینے سے) تمہارے کچھ گناہوں کو بھی دور کر دے گا اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے۔ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے۔'' (بقرہ ۲۷۲۔۲۷۱)

(یعنی سود والے مال میں برکت نہیں ہوتی بلکہ اصل بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ خیرات دینے سے مال بڑھتا ہے جس سے خیرات بھی بڑھتی ہے)

★ ''جو دل پاک کرنے کے لیے اپنا مال دیتا ہے اور اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ دے۔ بلکہ اپنے رب کی، جو سب سے برتر ہے، رضا چاہتا ہے۔ اور وہ عنقریب راضی ہوگا۔'' (لیل۔۲۱۔۱۸)

★ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جو (مال) اپنا نائب کر کے تمہارے ہاتھ میں دیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو اور جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں اور خرچ کرتے ہیں ان کے لیے ثواب ہے۔'' (حدید۔۷)

★ ''اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق دو اور بے جا مت اڑاؤ۔ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔'' (بنی اسرائیل ۲۷۔۲۶)

★ ''اور اللہ نے رزق میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تو جن لوگوں کو فضیلت دی ہے وہ اپنا رزق ان کو جو ان کی ملکیت میں ہیں، نہیں پہنچاتے کہ سب اس میں برابر رہیں تو کیا اللہ کے فضل سے منکر ہیں۔'' (نحل۔۷۱)

★ ''اور وہ جو تم میں فضیلت والے اور صاحب ثروت ہیں، رشتہ داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (کسی بات پر) نہ دینے کی قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں۔ کیا تم اس کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہاری بخشش کرے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔'' (نور۔۲۲)

رسول ﷺ کا فرمان

مومن، توقعات، ذمے داریاں

★ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر ۶ حق ہیں۔
(۱) جب ملاقات کرے تو سلام کرے، (۲) جب وہ بلائے اس کی دعوت رد نہ کرے، (۳) جب وہ مشورہ چاہے تو نیک مشورہ دے، (۴) جب وہ چھینکے تو الحمدللہ کہے، (۵) جب وہ بیمار ہو تو عیادت کرے، (۶) اگر مر جائے تو جنازے میں شرکت کرے۔

★ بندۂ مومن اپنے دشمن پر ظلم نہیں کرتا۔ دوستوں کی رعایت میں گناہ گار نہیں ہوتا۔ امانت کو ضائع نہیں کرتا۔ لعن طعن اور حسد نہیں کرتا۔ نماز میں خشوع خضوع اور زکوٰۃ کی ادائی میں تجلت سے کام لیتا ہے۔ مصیبتوں میں باوقار اور نعمتوں پر شکر گزار ہوتا ہے۔ بخل اس کو نیک کاموں سے نہیں روکتا۔

★ علم مومن کا دوست ہے اور عقل اس کی راہنما، عمل اس کا ناظم، صبر سالار لشکر، نرمی و مہربانی اس کے ماں باپ اور آشتی و ملائمت اس کے بھائی ہیں۔

★ حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے جہاں سے ملے وہ اس کو لے لے اور یہ نہ دیکھے کہ کس طرف سے ظاہر ہو رہی ہے۔

★ مسلمان جب کسی مسلمان کی عیادت کرتا ہے تو جب تک وہ واپس نہ آئے جنت میں مقیم رہتا ہے۔

★ مومن کو اس کے ہر خرچ پر ثواب ملتا ہے لیکن جو مٹی اور تعمیر پر خرچ ہو اس پر اجر نہیں ملتا۔

★ خدا ایک مومن صالح کی وجہ سے اس کے سو پڑوسیوں کو بلا سے محفوظ رکھتا ہے۔

★ مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔

★ مومن میں بخل اور بدخلقی جمع نہیں ہوتی۔

★ مومن تلوار اور زبان سے جہاد کرتا ہے۔

انتخاب: حافظ افروغ حسن ماخوذ "رحمۃ اللعالمین کے احسانات"

سردار عطاء اللہ مینگل نے بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے باغی نوجوانوں کو کیا وارننگ دی تھی؟

اس شمارے میں

- کیا پاکستان میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی معجزانہ صلاحیت اسے انتشار اور ناکام ہونے سے محفوظ رکھے گی؟
- مشرقی پاکستان کی طرح بلوچستان اسمبلی اتنی بے اختیار اور غیر موثر کیوں ہے؟
- ۱۹۷۱ء اور آج کے بلوچستان کی صورتحال میں کس قدر فرق پایا جاتا ہے؟
- ۷ لاکھ کی آبادی کے صوبے میں ۳۰ لاکھ بلوچ ۱۷ لاکھ پختون اور ۱۵ لاکھ سندھی قبائل اور آبادکاروں کا کیا کردار ہے؟
- بلوچستان میں بے چینی ۳۰ میں سے صرف ۴ اضلاع میں کیوں ہے؟
- قوم پرستوں کو الیکشن میں کبھی ۵ فیصد سے زائد نشستیں کیوں نہیں ملتیں؟
- شورش پسندوں کے سرغنہ اپنے علاقوں تک میں کیوں نہیں جاسکتے؟
- جنرل ضیاء الحق کی عام معافی اور جنرل رحیم کے ترقیاتی کاموں کے جال سے بلوچستان کی زندگی معمول پر کیوں آگئی تھی؟
- نواز شریف کے عہد میں فاصلے سمٹے اور دل قریب ہوئے تھے۔ جنرل مشرف کی مہم جوئی نے کیسے نقشہ ہی بدل دیا؟
- بلوچ نوجوانوں کو لڑنے کے لیے بوڑھے سردار کی لاش دے کر جنرل مشرف نے فوجی افسروں کو مبارک کیوں دی تھی؟

ہم کہاں کھڑے ہیں؟

بلوچستان کے ماضی، حال اور مستقبل کے حالات، خطرات اور خدشات کا احاطہ کرتی ایسی جامع تحریر آپ نے پہلے نہیں پڑھی ہوگی۔

اردو ڈائجسٹ ۱۷

ایوب خان نے قرآن پہ حلف اٹھانے کے باوجود کس بلوچ راہنما کے ساتھی سولی پر لٹکا دیے؟

اس شمارے میں کیا کہاں ہے

اداریہ	کچھ اپنی زبان میں	الطاف حسن قریشی	۱۵
تجزیہ	ہم کہاں کھڑے ہیں	الطاف حسن قریشی	۱۷
بزنس رول ماڈل	میں اچھی ٹیم پہ یقین رکھتا ہوں	ظفر خان	۳۱
اسلامی زندگی کی کہکشاں	جن پہ ہے امت کو ناز	امیر الدین مہر	۳۵
موضوع سخن	تربیت ہی بشر کو انسان بناتی ہے	وصی شاہ	۵۴
عالمی منظر نامہ	یہ "امیر" ہیں کون؟	وقار صہبائی	۶۱
سیر و سیاحت	سات ملک سات کہانیاں	نوید اسلام صدیقی	۷۵
سرورق کی کہانی	کرۂ ارض کا مؤثر ترین انسان	سید عاصم محمود	۸۹
انوکھے واقعات	دلچسپ و عجیب واقعات	اقصیٰ فاطمہ	۹۷
مستقبلیات	۲۰۲۲ء میں خوش آمدید	سید عاصم محمود	۱۰۳
حیرت و اسرار	پانچ تاریخی بوالعجبیاں	رضوان علی شاہ	۱۱۱
یادش بخیر	سردار عطاء اللہ مینگل سے ملاقات	ظفر جمال بلوچ	۱۱۶
تاریخ	۲۱ سے ۲۳ مارچ۔ تین دن	نوید اسلام صدیقی	۱۲۰
تاریخی کیس	می لارڈ، وکیل صفائی درست فرماتے ہیں	اختر حسین شیخ	۱۲۵
کتاب بینی	کتابوں سے دوستی	صبا شفیق	۱۲۷

اس شمارے میں کیا کہاں ہے

سفر ہجاز	آیا ہے بلادِ دیارِ نبیؐ سے	حبیب اشرف صبوحی	۱۲۹
احتیاط	کم عمری میں ہارٹ اٹیک	اعجاز احمد ڈنگہ	۱۳۳
انکشافات	موساد/اسرائیل کی پہلی دفاعی لائن	میر بابر مشتاق	۱۳۴
سفر نامہ	یہ ذرا جاپان تک	نوید احمد زبیری	۱۴۱
کھیل کھلاڑی	کھیلوں کی دنیا	رانا محمد شاہد	۱۴۸
دکھ بصری باد	ماں میں نے تمہارے ساتھ جانا ہے	اعجاز شیخ	۱۵۲
سروے	دوسروں کے تہوار منانے میں اتنی بے تابی؟	فریدہ خانم	۱۵۳
ہندوستان سے	مسلمان بادشاہ گر بن گئے	رضوان علی	۱۵۷
حیران حیرت	دنیا کی پست قامت لڑکی	رخسانہ فضل	۱۵۹
	چیونٹی کا قاتل	سید قاسم محمود	۱۶۱
	وارث	اختر عباس	۱۶۹
	معافی	برنارڈ مالمود	۱۷۷
کہانیاں	گڑھا	فریڈرک فورسیتھ	۱۸۵
	سزا	ڈاکٹر نعمان مظہر	۱۹۳
	رہائی	لیو ٹالسٹائی	۱۹۸

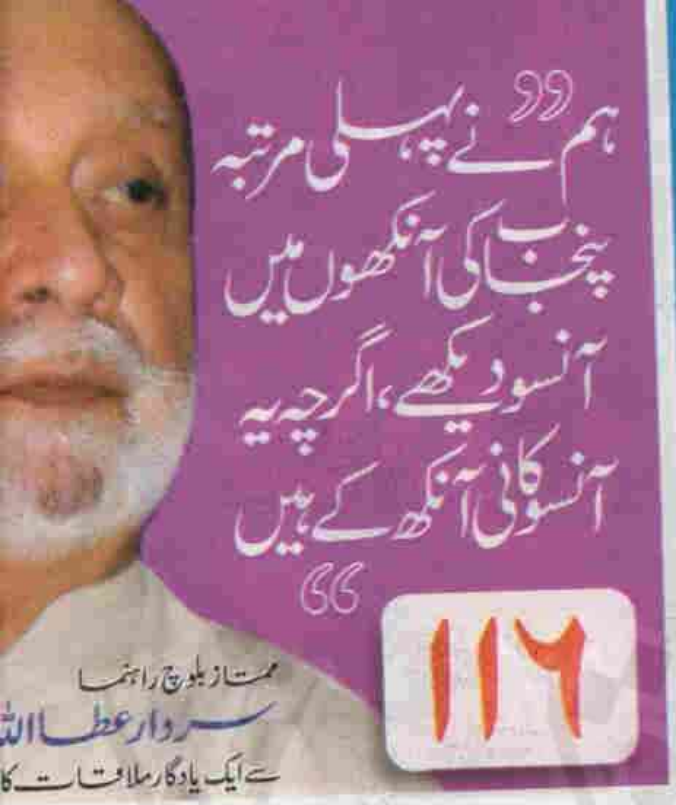

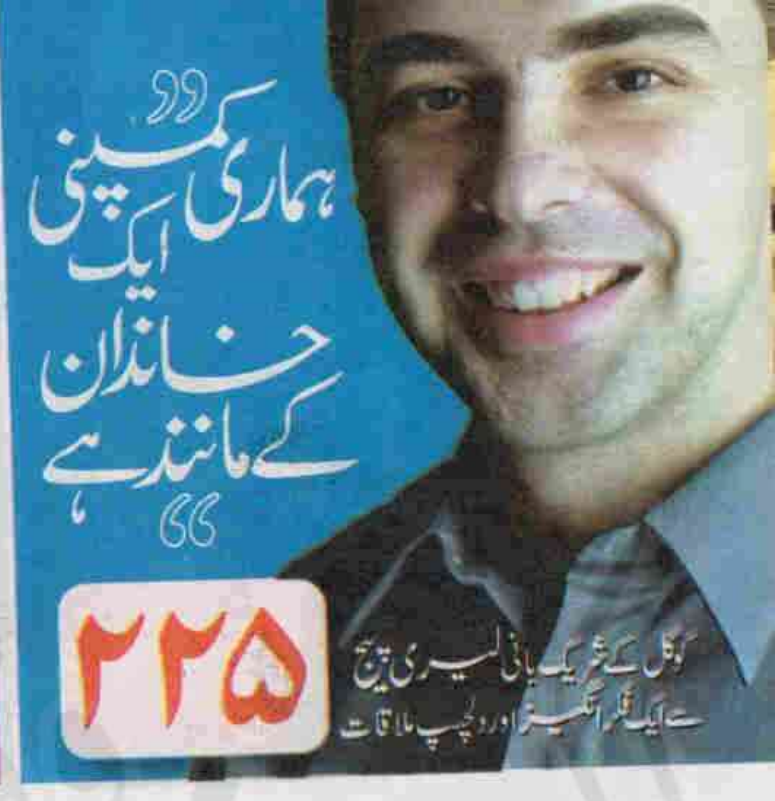

اس شمارے میں کیا کہاں ہے

	اللہ کی مرضی	جاوید بسام	۲۰۵
	مزارِ وفا	اختر حسین شیخ	۲۰۹
گوگل	ہماری کمپنی ایک خاندان کے مانند ہے	رچرڈ ہیرس	۲۲۵
الخدمت	یتیم بچوں کے لیے محبت بھری ''آغوش''	عمر ادریس	۲۲۹
ادبی گرفت	کشور ناہید کی ''شناسائیاں''	محمود احمد لئیق	۲۳۳
جوہرِ قابل	ہم کسی سے کم نہیں	تحریم حنا صدیقی	۲۳۸
مستقل کالم	مشورہ حاضر ہے	صغیرہ بانو شیریں	۲۴۴
خصوصی سروے	خواتین کی بے اختیاری	فریدہ خانم	۲۴۸
دنیائے صحت	صحت کی دُنیا	طاہرہ اعجاز ڈنگہ	۲۵۳
تحقیق و جستجو	قتل کے قدرتی گواہ کیڑے	عاطف مرزا	۲۵۷
بچوں کی صحت	اپنے بچوں کی آنکھوں کا خیال رکھیے	فوزیہ عباس	۲۶۰
اپنا وزن سنبھالیے	وزن کم کریں مگر صحت نہیں	نوشین ناز	۲۶۶
کتاب گھر	مطالعے کی میز پر	نوید اسلام صدیقی	۲۷۳
خطوط	چمنِ خیال	قارئین	۲۷۹
دردِ دل یہ دستک	ایسا کل میرے کس کام کا	اختر عباس	۲۸۵

کچھ اپنی زباں میں

حقیقی نمائندگی کا ایک قابلِ اعتماد نظام

ہماری سالمیت اور بقا جن خطرات سے دوچار ہے، ہمارے منتخب ادارے جس بے حسی کے ساتھ عوام کے بنیادی مسائل حل کرنے اور قومی زندگی کو اچھے قوانین کا فریم ورک مہیا کرنے میں ناکام چلے آرہے ہیں، ہماری سیاست میں جو آئے دن خوفناک بحران سر اُٹھاتے رہتے ہیں، ہم اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے بجائے اغیار سے بھیک مانگنے پر فخر محسوس کرنے لگے اور ہمارے معاشرے میں نفرتوں اور تشدد کا زہر سرایت کرتا چلا جا رہا ہے' اس کا سب سے بڑا سبب جمہوریت کے نام پر انتخابات کے ذریعے ایک سیاسی مافیا کا ملکی اقتدار پر قابض ہوجانا ہے۔ گزشتہ پانچ چھ عشروں میں اختیارات کا مالک وہ چھوٹا سا طبقہ چلا آرہا ہے جس نے فوجی طاقت یا ایک غیر منصفانہ اور فرسودہ انتخابی نظام کے بل بوتے پر عوام کی حقیقی نمائندگی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیا اور پاکستان کو ہولناک بحرانوں کے گرداب میں دھکیل دیا۔ اس اذیت ناک عذاب سے نجات پانے کے لیے نوجوان ایک حقیقی اور مخلص قیادت کی تلاش میں سرگرداں ہیں مگر خاندانی موروثیت کی بے ساکھیوں کے سہارے اپنا تام جام قائم رکھنے والے سیاسی زعما اس جستجو کی راہ میں دوررس اور کلیدی اہمیت کی انتخابی اصلاحات کے عمل میں رکاوٹ ثابت ہوئے ہیں۔

حال ہی میں سینیٹ کے انتخابات میں سیاسی جماعتوں نے جس غیر اخلاقی جوڑتوڑ کا مظاہرہ کیا، اس نے پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا کو ایک بدترین نامزدگی کا نمونہ بنا دیا ہے۔ آئین میں اس ادارے کے لیے جو انتخابی کالج متعیّن ہے، اس کے ارکان رائے دہی کے حق سے محروم کر دیے گئے اور زیادہ تر وہی افراد باقاعدہ انتخاب کے بغیر سینیٹر بنا دیے گئے جو پہلے سے اس ایوان میں موجود تھے یا وہ موروثی سیاسی قیادتوں کے منظورِ نظر تھے۔ اُن اُمیدواروں کو صوبائی الیکشن کمشنروں نے نامزدگی کے کاغذات منظور کرتے وقت یہ بھی نہیں بتایا کہ آپ کے اثاثے کروڑوں میں ہیں جبکہ آپ ٹیکس ہزاروں میں بھی ادا نہیں کرتے اور یوں ٹیکس چوری کے مرتکب ہونے کے سبب وہ آئین کی شق ۶۳/ کی زد میں آتے ہیں۔ سیاسی جعل سازی پر مبنی اس عمل سے

بے زار قوم کے باشعور طبقے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اس ادارے کے براہِ راست انتخابات ہونے چاہئیں تا کہ عوام اپنے حقیقی نمائندے ایوانِ بالا میں بھیج سکیں جو امریکی سینیٹ کی طرح ایک مؤثر کردار ادا کر سکے۔

ہمارے سیاسی قائدین ۲۰ ویں آئینی ترمیم کی متفقہ منظوری کو ایک تاریخی فتح سے تعبیر کر رہے ہیں، مگر اس ترمیم سے عوام کی حقیقی نمائندگی اور شفاف انتخابات کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے۔ سینیٹ کی بھاری اکثریت نے ۳۶ رکروڑ کے ترقیاتی فنڈز سیاسی بنیادوں پر حاصل کرنے کے بعد کسی غور وخوص کے بغیر انتہائی عجلت میں منظور کر لی ہے اور صرف جماعتِ اسلامی کے ۲ رسینیٹروں نے مخالفت میں ووٹ ڈالے ہیں۔ دراصل آئین میں درج الیکشن کمیشن کی ساخت پر نظرِ ثانی کی اشد ضرورت ہے جس کے مطابق چیف الیکشن کمشنر اور کمیشن کے ارکان سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس کے ریٹائرڈ جج صاحبان ہی سے لیے جا سکتے ہیں۔ وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے اپنی بھاری بھر کم ذمے داریاں خوش اسلوبی سے ادا نہیں کر پاتے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ انتظامی امور کی بجا آوری کا کوئی تجربہ نہیں رکھتے۔ جبکہ پورے ملک میں بیک وقت قومی اور صوبائی انتخابات کا انعقاد غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ اس تناظر میں سنجیدہ حلقے شدت سے محسوس کر رہے ہیں کہ الیکشن کمیشن کی بناوٹ کا دائرہ وسیع کیا جائے اور اس میں سول سروس کے اعلیٰ منتظمین بھی شامل کیے جائیں جیسا کہ بھارت میں شروع ہی سے سول سروس کے تجربے کار افراد ہی بڑی کامیابی اور ہنرمندی سے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات منعقد کراتے آئے ہیں۔

اب قومی حلقوں میں یہ سوچ بھی پرورش پا رہی ہے کہ عوام کی حقیقی نمائندگی کو یقینی بنانے کے لیے متناسب نمائندگی کا نظام بہت بہتر ثابت ہو سکتا ہے کہ اس میں ووٹ ضائع نہیں ہوتے اور چھوٹی سیاسی جماعتوں کو بھی نمائندگی کا موقع مل جاتا ہے۔ اگر جرمنی میں رائج متناسب نمائندگی کا نظام اپنا لیا جائے تو اس میں انتخابی حلقے بھی قائم رہتے ہیں اور سیاسی جماعتوں کو قابل اور تجربے کار شخصیات کو بھی پارلیمنٹ میں بھیجنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس نظام کی رو سے آدھی نشستیں انتخابی حلقوں کے لیے مخصوص ہوتی اور ڈالے ہوئے ووٹوں کے تناسب سے آدھی نشستیں سیاسی قیادتیں نامزد کرتی ہیں جن کی فہرستیں پہلے سے متعارف کرا دی جاتی ہیں۔ مجوزہ ناموں پر قومی بحث میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان کا استحقاق کیا ہے۔ عوامی بازپرس کے خوف سے سیاسی فہرستیں مرتب کرتے وقت اس امر کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے کہ ان میں کوئی ایسا نام شامل نہ ہونے پائے جو سیاسی اخلاقیات پر پورا نہ اترتا ہو۔ اس نظام کے تحت دو تین جماعتوں کی آمریت قائم نہیں ہو سکتی اور قومی فیصلوں میں زیادہ سے زیادہ سیاسی عناصر شامل ہوتے ہیں اور ملک کے اندر مخلوط حکومتوں کا کلچر فروغ پاتا ہے جس میں حقیقی مفاہمت اور قوتِ برداشت کا جوہر غالب رہتا ہے۔

الطاف حسن قریشی

ہم کہاں کھڑے ہیں

آنے والے حالات کا تجزیہ

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

مستقبل کے نازک مرحلے

ہم پر مشکل وقت آن پڑا ہے جسے حوصلے، دانش مندی اور ایثار سے عظیم امکانات میں تبدیل کیا جا سکتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے اندھیری رات میں چمکنے والے اَن گنت ستارے اپنے خون سے سحر پیدا کرتے ہیں

زندہ

قومیں آفات اور مسائل سے گھبرانے کے بجائے اُن کے اسباب کے سائنٹیفک تجزیے اور اُن کے حل پر اپنی توجہ مرکوز رکھتی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے وقت برصغیر کے مسلمانوں کو آگ وخون کے دریا عبور کرنا پڑے تھے اور تبھی سے اس کے وجود کو طرح طرح کے خطرات لاحق ہیں۔ اس کا نظریاتی تشخص، اس کا اسٹریٹجک محلِ وقوع، اس کی ایٹمی صلاحیت، اس کی عظیم فوجی طاقت اور اس کی بیش بہا افرادی قوت اسے عالمی برادری میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہیں جبکہ یہی اثاثے ہمارے لیے ایک چیلنج کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ نیا ملک جن علاقوں پر مشتمل تھا، وہ سیاسی، اقتصادی اور سماجی اعتبار سے بے حد پس ماندہ اور جاگیردارانہ نظام کے قبضے میں تھا جس نے جمہوری مزاج، جمہوری روایات اور جمہوری اداروں کو پنپنے اور مضبوط ہونے نہیں دیا۔ بدقسمتی یہ کہ خاندانی موروثیت نے سیاسی جماعتوں پر بھی غلبہ حاصل کر لیا۔ وہ سیاسی قیادت جس نے قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں کلیدی کردار ادا کیا تھا، وہ ابتدائی چند برسوں ہی میں دنیا سے رخصت یا وڈیروں اور سرداروں کی ریشہ دوانیوں کے سامنے بے بس ہو گئی۔ اس قومی حادثے اور بھارت کے معاندانہ رویے کے باوجود ہمارا ملک ترقی اور خوشحالی کی راہ پر چلتا رہا جبکہ ہماری قوم 'دیانت دار قیادت سے محروم رہنے کے باعث بہت پیچھے رہ گئی۔ آج ہمیں جن بڑے بحرانوں کا سامنا ہے' اُن کا بڑا سبب عوام کی بدحالی' بے چارگی اور تعلیم کی کمی جبکہ خواص کی بے حسی' خود غرضی اور حد سے بڑھی ہوئی مفاد پرستی اور اخلاقی پستی ہے۔

اَن گنت سیاسی اور نفسیاتی بیماریوں کے سبب ملکی معاملات پر سیاست دانوں کی گرفت کمزور ہونے سے فوج کو بار بار

اقتدار میں آنے کا موقع ملا۔ فوجی سوچ سیاسی سوچ سے یکسر مختلف ہے کیونکہ سیاسی عمل مشاورت کو فروغ اور فوجی اقتدار آمریت اور مرکزیت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ہماری ۶۵ سالہ تاریخ میں فوج کو براہِ راست تیس برس سے زائد حکومت کرنے کا موقع ملا ہے جبکہ پس پردہ فیصلہ سازی پر اثر انداز ہونے کی مدت اور بھی طویل ہے جس میں زیادہ تر سنگین اور تاریخ شکن بحران آتے رہے۔ فوجی آمریت نے ہمارے معاشرے کا سیاسی' اخلاقی اور سماجی تار پود بکھیر ڈالا' طاقت کے استعمال کا چلن عام کیا اور اس چلن کا اس قدر غلبہ ہوا کہ ہماری سول بیوروکریسی اور ہماری سیاسی قیادتیں بھی آمرانہ طور و طریق سے فیصلے کرنے لگیں۔ یہی ذہنیت آج بھی کارفرما ہے جو مسائل کے الاؤ کو ہوا دے رہی ہے۔

آج بلوچستان ایک انتہائی گمبھیر مسئلے کی شکل اختیار کر چکا ہے اور بین الاقوامی توجہ کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ پاکستان کا دوسرا بڑا بحران پاک امریکا تعلقات میں کشیدگی سے پیدا ہوا ہے جو خطرناک علاقائی اور عالمی مضمرات کا حامل ہے۔ سول اور فوج کے مابین تنے ہوئے روابط بھی داخلی اور خارجی چیلنج بنتے جا رہے ہیں۔ میوا ایشو بھی اسی چپقلش کا شاخسانہ ہے جس نے قومی سلامتی کے مسائل جنم دیے ہیں۔ لاپتا افراد کی تعداد میں روز افزوں اضافے سے جہاں پورے ملک میں ایک ہاہا کار مچی ہوئی ہے' وہاں بلوچستان کا زخم گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ ایگزیکٹو اور عدلیہ کے مابین بھی رسا کشی جاری ہے جس نے جناب وزیر اعظم کے مستقبل پر بڑے بڑے سوالات اُٹھا دیے ہیں۔ مزید براں شدت پسندی اور دہشت گردی نے پاکستان کا چہرہ مسخ کر ڈالا ہے اور عالمی برادری میں اسے ملامتوں اور نفرتوں کا سامنا ہے۔ ملکی وسائل کا ایک بڑا حصہ دہشت گردی کے خلاف جنگ پر اُٹھ رہا ہے اور امریکا نے سپورٹ فنڈ اور کیری لوگر بل کے تحت دی جانے والی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ کرپشن اور بدانتظامی نے گزشتہ چار برسوں میں آٹھ ہزار ارب سے زائد روپے چاٹ لیے ہیں جبکہ احتساب کے فقدان سے حکومت کی مشینری زنگ آلود ہو چکی ہے اور ڈیلیوری سسٹم بدترین نااہلی اور بدانتظامی کا شکار ہے۔ توانائی کے بحران سے لوگ بیروزگار ہوتے جا رہے ہیں اور غربت عام آدمی سے جینے کا حق چھین لینے پر تلی ہوئی ہے۔ عوام اپنے حکمرانوں سے شدید بیزار ہیں اور ایک مخلص اور دیانت دار قیادت کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔

مسائل اور مشکلات سے خوفزدہ ہمارے بعض دانش ور پاکستان کے بارے میں نا اُمیدی پھیلانے والی کتابیں شائع کرتے رہتے ہیں۔ ان میں جناب رویداد خان کی تصنیف ''وہ خواب جو بے کیف ہو گیا'' جناب طارق علی کی ''ایک ریاست کی موت'' جناب احمد رشید کی ''انتشار کی طرف نزول'' اور جناب شیر باز خاں مزاری کی ''پاکستان: حقیقت بینی کی طرف سفر'' قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے برعکس' ان دنوں کچھ ایسی کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں جو مسائل میں گھرے ہوئے پاکستان کی جوہری قوت اور اس کی عظمت کی گواہی دیتی ہیں۔ ان میں محترمہ فرزانہ شیخ کی تازہ تصنیف ''پاکستان کی معنویت'' اور اناطول لیون کی فکر انگیز کتاب ''ایک سخت جان ملک'' حقائق اور مسائل کا سامنا کرنے کا حوصلہ عطا کرتی اور قارئین کے اندر ٹھوس شہادتوں کے ساتھ یہ شعور اُبھارتی ہیں کہ پاکستان میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی معجزانہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اناطول نے پاکستانی معاشرے کی سخت جانی کا راز اس کے مضبوط اور مستحکم خاندانی نظام کی یک جہتی میں دریافت کیا ہے جو ریاست کو ناکام ہونے سے محفوظ رکھے ہوئے ہے۔

بیشتر سیاسی زعما یہ کہنے میں قدر سے حق بجانب ہیں کہ بلوچستان میں مشرقی پاکستان جیسے حالات پیدا کیے جا رہے ہیں اور ہمارے حکمرانوں نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا اور وہی غلطیاں دہراتے چلے آ رہے ہیں جن کے باعث ہمارا ملک

۱۹۷۱ء میں دولخت ہوا تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ کی اصل وجہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں اعتماد کا فقدان تھا جو دشمنی کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔ اس بے اعتمادی کا بیج مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ان بیوروکریٹس نے بویا تھا جو مشرقی بنگال کو اپنی کالونی سمجھتے اور اس صوبے کے شہریوں سے غلاموں جیسا سلوک روا رکھتے تھے۔ دوسرا بڑا مسئلہ آئینی حقوق اور منصفانہ سیاسی نمائندگی کا حصول تھا۔ مشرقی بنگال کی آبادی مغربی پاکستان سے زیادہ تھی جو اُسے قومی اسمبلی میں اکثریت کا حق دیتی تھی۔ وزیر اعظم محمد علی بوگرا نے غیر معمولی سیاسی بصیرت اور بامعنی گفت و شنید سے ایک ایسا آئینی فارمولا وضع کر لیا تھا جس کے مطابق ایوانِ زیریں میں مغربی بنگال اور ایوانِ بالا میں مغربی پاکستان کی اکثریت تھی اور اہم قومی امور کا فیصلہ دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں کیا جانا تھا۔ یہ آئین تیسری خواندگی کے بعد ۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء کو نافذ ہونا تھا' مگر یہ ساری محنت ایک بہت بڑی سازش کی نذر ہو گئی۔

جنرل ایوب خاں پہلی دستور ساز اسمبلی میں دستور پر بحث کے وقت لندن کے ایک آرام دہ ہوٹل میں اپنے طور پر پاکستان کے دستور کے خدوخال مرتب کر رہے تھے۔ اس میں ون یونٹ کا قیام اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان برابری (پیریٹی) کا اصول تجویز کیا گیا تھا۔ فوجی قیادت کی طرف سے اشارہ پا کر فائج زدہ گورنر جنرل غلام محمد ملک نے ۲۴ اکتوبر کی شام دستور ساز اسمبلی توڑ ڈالی جو ہماری تاریخ کا ایک سیاہ باب ثابت ہوا۔ مختلف مراحل طے کرنے کے بعد اسی بنیاد پر دوسری دستور ساز اسمبلی نے نیا دستور منظور کیا جو ایوب خاں کی آئینی اسکیم کے اندر فراہم کی گئی تھی۔ مشرقی پاکستان کے عوام نے قوم کے وسیع تر مفاد میں ۸ سال کے شدید انتظار کے بعد دستور کے نفاذ پر بہت خوشی کا اظہار کیا' مگر اُنہیں اپنی اکثریت چھن جانے کا ہمیشہ بہت قلق رہا تھا۔ دو سال بعد جب جنرل ایوب خاں کی حمایت سے صدر اسکندر مرزا نے ۱۹۵۶ء کا دستور ہی ختم کر ڈالا' تو وہ بنیاد بھی منہدم ہو گئی جس پر ایک ساتھ رہنے کا عمرانی معاہدہ وجود میں آیا تھا۔ اس حادثے کے بعد مشرقی پاکستان میں آئینی اور سیاسی حقوق کی پامالی کا احساس مختلف شکلیں اختیار کر گیا اور علٰحدگی کے رجحانات تقویت پاتے رہے، دونوں بازوؤں کے درمیان جدائی کا فیصلہ کن مرحلہ اس وقت آیا جب ۱۹۷۰ء کے انتخابی نتائج سے قومی اسمبلی میں مشرقی پاکستان کو اکثریت حاصل ہو گئی' تو یحییٰ خاں نے اس کا اجلاس غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیا اور اس اقدام کے خلاف عوام اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بغاوت فرو کرنے کے لیے طویل عرصے تک فوجی آپریشن جاری رہا جس میں فوج کو شکست ہوئی اور پاکستان دولخت ہو گیا۔

جنرل ایوب خاں کے دستوری نقشے پر عمل پیرا ہونے سے مغربی پاکستان میں بھی سنگین مسائل پیدا ہوئے۔ ون یونٹ کے قیام سے فائدے کم اور نقصانات بے حساب ہوئے۔ وسیع و عریض مغربی پاکستان کو ایک انتظامی یونٹ میں تبدیل کرنے اور لاہور کو اس کا صدر مقام بنا دینے سے عوام کی گوناگوں مشکلات اور پنجاب کے خلاف نفرتوں میں بے پناہ اضافہ دیکھنے میں آیا۔ پنجاب، جس کا مغربی پاکستان اسمبلی میں حصہ آبادی کے لحاظ سے باون فی صد بنتا تھا' نے ایثار کا ثبوت دیتے ہوئے ۴۰ فیصد پر قناعت کی' لیکن وہ چونکہ اختیارات کے منبع کی حیثیت اختیار کر گیا تھا' اس لیے خیبر سے لے کر مکران کے ساحل تک اس کے خلاف شدید بے زاری اور عداوت کے جذبات پیدا ہوئے۔ صوبوں کو اپنی شناخت اور اپنے اختیارات کے چھن جانے کا بہت غم تھا' چنانچہ اُن کے اندر مزاحمتی تحریکیں زور پکڑتی گئیں۔ بلوچستان میں بار بار بغاوتیں ہوئیں اور فیلڈ مارشل صدر ایوب کی حکومت نے بغاوت کے بنیادی کردار نوروز خاں کے ساتھ قرآن تکیم پر حلف

اُٹھانے کے باوجود اُس کے ساتھی سولی پر لٹکا دیے۔ ون یونٹ کے زمانے ہی میں سندھ کے نوجوان اپنی تہذیبی شناخت اور سیاسی حقوق کی جنگ میں شامل ہوئے اور پنجاب کی بالادستی کے خلاف شعلے اُگلنے لگے۔ صوبہ سرحد میں پختون عصبیت میں غیر معمولی شدت آئی اور مرکز گریز رجحانات روز بروز طاقت ور ہوتے گئے۔ ۱۹۶۸ء میں جب ایوب خانی حکومت کے خلاف ایک بلا خیز طوفان اُٹھا، تو اُس میں انہی عصبیتوں اور نفرتوں کے تمام عناصر کارفرما تھے۔ جنرل یحییٰ خاں جب ۱۹۶۲ء کا دستور روند کر برسرِ اقتدار آئے، تو انہوں نے ون یونٹ توڑنے اور پیریٹی کا اصول ختم کرنے کا اعلان کیا جس پر پورے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، مگر پنجاب جسے ایک سامراج کے طور پر ۱۵ سال تک پیش کیا جاتا رہا تھا، اس کے مضر اثرات آج بھی ہماری سیاسی نفسیات میں غالب ہیں اور بلوچستان کے بحران کو گہرا کرنے میں ایک بہت بڑا منفی کردار ادا کر رہے ہیں۔

بادی النظر میں بلوچستان اور مشرقی پاکستان کے حالات میں خاصی مشابہت پائی جاتی ہے جو انتہائی سنجیدہ غور و فکر اور مؤثر اقدامات کا تقاضا کرتی ہے۔ مشرقی پاکستان آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ تھا جبکہ بلوچستان کو رقبے کے لحاظ سے یہی اعزاز حاصل ہے۔ مشرقی پاکستان کی طرح بلوچستان کے ساتھ بھی سول اور عسکری بیوروکریسی کے ہاتھوں بڑی زیادتیاں اور ناانصافیاں ہوتی رہی ہیں جن کے خلاف اب جذبات کا ایک آتش فشاں پھٹ پڑا ہے۔ دونوں صوبوں کے حالات کے درمیان یہ مشابہت بھی پائی جاتی ہے کہ مشرقی پاکستان کی اسمبلی کی طرح بلوچستان کی اسمبلی بھی بے اختیار اور بڑی حد تک غیر مؤثر ہے۔ اقتصادی لحاظ سے مشرقی پاکستان بھی پس ماندہ تھا اور بلوچستان بھی درماندگی کی تصویر بنا ہوا ہے' حالانکہ وہ قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ وہاں مسائل کا فوجی حل تلاش کرنے کی ضد میں حالات قابو سے باہر ہوئے تھے اور یہاں بھی طاقت کے بے جا اور ظالمانہ استعمال سے معاملات بگڑتے جا رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ایک بیرونی طاقت نے مکتی باہنی کو جنم دیا تھا جبکہ بلوچستان میں بھی بیرونی طاقتیں بلوچ گوریلوں کی پشت پر ہو سکتی ہیں۔

ان چند مماثلتوں کے باوجود ۱۹۴۷ء اور آج کی صورتِ حال میں کئی اعتبار سے بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ سب سے بڑا فرق جغرافیائی وحدت اور علاقائی تسلسل کا ہے۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے مابین ایک ہزار میل کا فاصلہ تھا اور ان کے درمیان بھارت واقع تھا۔ اس جغرافیائی دوری کی وجہ سے عوام کے مابین مضبوط رابطے قائم نہ ہو سکے۔ زبان کا اختلاف بھی راستے میں حائل رہا۔ دو اطراف سے بھارت میں گھرے ہوئے مشرقی پاکستان کے لیے خود کفیل دفاعی انتظامات بھی بڑے دشوار تھے۔ اس کے برعکس بلوچستان پاکستان کے ساتھ جغرافیائی وحدت میں جکڑا ہوا ہے' جدید ذرائع مواصلات نے فاصلے کم کر دیے ہیں اور لوگ آپس میں کاروبار بھی کر رہے ہیں اور وسیع تر سیاسی عمل میں بھی شریک ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا نے قومی یک جہتی کو بہت فروغ دیا ہے اور خدمتِ خلق کے متعدد ادارے باہمی رشتوں میں استحکام پیدا کر رہے ہیں۔ دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ بلوچستان میں بلوچوں کے علاوہ پشتون اور آبادکار بھی رہتے ہیں جو تعلیم یافتہ ہونے کی بدولت خوشحال بھی ہیں اور اپنے صوبے کی معیشت میں زبردست کردار ادا کر رہے ہیں۔

ایک سروے کے مطابق بلوچستان کی کُل آبادی بہتر لاکھ نفوس پر مشتمل ہے جس میں ۳۰ لاکھ بلوچ، ۲۷ لاکھ پختون اور ۱۵ لاکھ آبادکار اور سندھی قبائل ہیں جن کا بڑا حصہ اپنا مستقبل پاکستان کے بندوبست محفوظ سمجھتا ہے اور اپنے حقوق سیاسی جدوجہد کے ذریعے حاصل کرنے پر یقین رکھتا ہے۔ زیادہ تر بے چینی ۳۰ اضلاع میں سے فقط چار پانچ اضلاع

کوئٹہ، سبی، ڈیرہ بگٹی، خضدار اور تربت کی چند تحصیلوں میں پائی جاتی ہے۔ ان پر بھرپور توجہ مرکوز کر دینے اور جائز مطالبات کسی حیل و حجت کے بغیر تسلیم کرنے سے مذاکرات کی راہ نکل سکتی ہے اور ناراض اور برگشتہ بھائیوں کو دلیل سے قائل کیا جا سکتا ہے۔ مشرقی پاکستان اور بلوچستان کی صورتِ حال میں ایک اور بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ مشرقی پاکستان میں آئینی اور سیاسی حقوق کی جنگ لڑنے والوں کو شروع ہی سے عوام کی تائید حاصل تھی۔ وہاں ۱۹۵۴ء میں پہلے انتخابات ہوئے جن میں حکمران مسلم لیگ عبرت ناک شکست سے دوچار ہوئی اور اُسے صرف ۹ نشستیں مل سکیں۔ اس کے بعد جتنے بھی انتخابات ہوئے' ان میں عوامی لیگ کی طاقت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے برعکس بلوچستان میں ۱۹۸۵ء سے لے کر اب تک جتنے بھی انتخابات ہوئے ہیں' اِن میں نام نہاد قوم پرست جماعتوں کو ۵ فیصد نشستیں بھی نہیں ملیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ عوام کی بھاری اکثریت مسلح جدوجہد اور علٰحدگی پسند رجحانات کے حق میں نہیں۔ آج زمینی حقائق یہ ہیں کہ شورش پسندوں کے سرغنہ اپنے علاقوں میں نہیں جاتے کہ انہوں نے اپنے لوگوں پر جبر و استبداد کی انتہا کر دی تھی۔

قیامِ پاکستان سے پہلے بلوچستان دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصہ برٹش بلوچستان کہلاتا تھا جو برطانوی حکومت کے زیرِ نگیں تھا۔ اس میں پشتون، کاکڑ قبیلے کے علاوہ مری اور بگٹی قبائل کے علاقے بھی شامل تھے جن کے سیاسی امور کوئٹہ میونسپل کمیٹی اور پشتون اور بلوچ سرداروں کی نمائندہ تنظیم "شاہی جرگے" کی مشاورت سے چلائے جاتے تھے۔ دوسرا حصہ ۴ ریاستوں کی کنفیڈریشن پر مبنی تھا جس میں قلات، لسبیلہ، خاران اور مکران شامل تھے۔ تشکیلِ پاکستان کے وقت برٹش بلوچستان میں ۲۹ جون ۱۹۴۷ء کو ہونے والے ریفرنڈم میں کامل اتفاقِ رائے سے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ ہوا۔ اس فیصلے میں نواب اکبر بگٹی کے چچا نے بھی حصہ لیا تھا۔ پاکستان بن جانے کے بعد ان ریاستوں کا معاملہ سامنے آیا جن کے برطانوی حکومت کے ساتھ نیم داخلی خود مختاری کے معاہدے تھے۔ خان آف قلات کے قائدِ اعظمؒ سے اچھے مراسم تھے جسے انہوں نے پاکستان میں شامل ہونے کا مشورہ دیا۔ اُس نے سبی دربار کے موقع پر فروری ۱۹۴۸ء میں پاکستان سے الحاق کے اعلان کا وعدہ کیا، مگر وہ بیماری کا عذر کر کے غائب ہو گیا۔ لسبیلہ، خاران اور مکران کے نوابین جو کنفیڈریشن میں شامل تھے' وہ ریاست قلات کے وزیرِ اعظم سر سر شمس الدین کی بدانتظامیوں اور دست درازیوں سے حد متنفر تھے اور اُن کے خلاف 'دشمس گردی' کے نام سے کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ یہ تینوں نواب بہت پہلے پاکستان سے الحاق کرنا چاہتے اور قائدِ اعظم سے ملاقات کے خواہش مند تھے۔ قائدِ اعظم کی یہ خواہش تھی کہ الحاق کا اعلان خان آف قلات کے ساتھ کیا جائے، لیکن جب خان آف قلات نے وعدہ خلافی کی، تو قائدِ اعظم نے تینوں ریاستوں کے نوابین کو کراچی میں ملاقات کا وقت دیا جس میں اُنہوں نے پاکستان سے الحاق کا اعلان کر دیا تھا۔

بلوچستان کی ساحلی پٹی کے پاکستان سے الحاق کے بعد خان آف قلات کے لیے الحاق کی دستاویز پر دستخط کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اُس نے ۲۷/ مارچ ۱۹۴۸ء کو پاکستان سے الحاق کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ قلات ۱۸۷۶ء کے معاہدے کے تحت برطانوی زیرِ حفاظت ایک باجگزار ریاست تھی اور ویسی ریاستوں کے بارے میں ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی سیکرٹری فار اسٹیٹ نے پالیسی بیان دیا کہ انہیں آزاد ممالک کے طور پر تسلیم نہیں کیا جائے گا اور وہ اپنی جغرافیائی اور مذہبی وابستگی کے حوالے سے پاکستان یا بھارت سے الحاق کر سکتی ہیں۔ اس قطعی اعلان کے بعد خان آف قلات کے لیے اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھنا اب ممکن نہیں رہا تھا اور پاکستان سے الحاق اس لیے ناگزیر ہو گیا تھا

کہ ریاست کی ۹۸ فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ الحاق کے دوسرے روز پرنس عبدالکریم ناراض ہوکر افغانستان چلا آیا جس نے اقوام متحدہ میں پاکستان کی رکنیت پر اعتراض کیا تھا۔ دراصل یہ بھائیوں کی تخت نشینی کا قضیہ تھا۔ پرنس عبدالکریم افغانستان سے ایک چھوٹے سے لشکر کے ساتھ واپس آیا اور شورش بپا کرنے کی اپنی سی کوشش کی جسے ایک مختصر سے فوجی آپریشن سے ناکام بنادیا گیا۔ دراصل ریاست قلات کے حکمران پٹھان تھے اور اُن کی قلمرو میں بلوچوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اور بڑے بڑے بلوچ قبائل اس ریاست سے باہر آباد تھے جن میں بگٹی، مری اور ڈومکی قابل ذکر ہیں۔ پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ خان قلات احمد یار خان وزیرِ اعظم بھٹو کے دور میں بلوچستان کے گورنر بھی رہے جو اس کا بیّن ثبوت تھا کہ ان کا وفاق کے ساتھ کوئی تنازع نہیں تھا اور وہ پاکستان کے ساتھ اپنی ریاست کے الحاق پر پوری طرح مطمئن تھے۔ اُن کے بیٹے سلیمان داؤد نے گزشتہ چند سال سے یہ تنازع کھڑا کر دیا کہ پاکستان نے ریاست قلات پر زبردستی قبضہ کیا تھا اور وہ اس کی آزادی کا اعلان کرنے میں حق بجانب ہیں۔ وفاق نے انہیں ایک معقول راستہ اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کی علانیہ اور درپردہ کوشش کی لیکن وہ سرکش پہاڑ پر اتر آئے اور ناراض ہوکر ملک سے باہر چلے گئے۔

بلاشبہ بلوچستان کی داستانِ الم بڑی دردناک اور بے حد اضطراب انگیز ہے مگر بحران کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے ہم ۱۹۷۰ء کے بعد کے چند اہم واقعات کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں جب اسے پہلی بار صوبے کا درجہ حاصل ہوا۔ انتخابات ہوئے تو اے این پی برسرِ اقتدار آئی' سردار عطاء اللہ مینگل نے حکومت بنائی اور بلوچ قیادت نے ۱۹۷۳ء کے آئین کی منظوری میں قابل قدر حصہ لیا، صرف جناب خیر بخش مری نے آئین پر دستخط نہیں کیے تھے۔ شروع شروع میں وزیرِ اعلیٰ عطاء اللہ مینگل نے آبادکاروں کے ساتھ معاندانہ طرزِ عمل اپنایا' مگر انہیں جلد احساس ہوگیا کہ ان کارروائیوں سے صوبے کو نقصان پہنچ رہا ہے' تو انہوں نے آبادکاروں کو بے دخل کرنے کی پالیسی ختم کر دی۔ بدقسمتی سے مسٹر بھٹو جن کی سیاسی تربیت فوجی آمر جنرل ایوب خاں کی آغوش میں ہوئی تھی' وہ اختلافِ رائے برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے سردار عطاء اللہ مینگل کی وزارت برطرف کر ڈالی اور نواب اکبر خاں بگٹی کو بلوچستان کا گورنر مقرر کر دیا۔ اس اقدام کے ردعمل میں بلوچ مزاحمت کار پہاڑوں پر چلے گئے اور حکومت کو ان کے خلاف بہت بڑا فوجی آپریشن کرنا پڑا جس میں ۲ ڈویژن حصہ لے رہے تھے۔ عالمی میڈیا میں اس آپریشن کے بارے میں سنسنی خیز خبروں کا سلسلہ کئی سال جاری رہا۔ انہی دنوں پاکستان میں عراقی سفارت خانے سے اسلحے کی پیٹیاں پکڑی گئیں اور حکومت نے الزام یہ لگایا کہ یہ اسلحہ روس کی طرف سے بلوچ باغیوں کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس پروپیگنڈے کے بعد بلوچ لیڈرشپ کی گرفتاریاں عمل میں آئیں اور اس کا حیدرآباد جیل میں ٹرائل شروع ہوگیا۔ اسی دوران ۱۹۷۴ء میں یہ المیہ بھی پیش آیا کہ عطاء اللہ مینگل کے صاحبزادے اسد مینگل کراچی میں جناب سردار شیر باز خان مزاری کے گھر سے گرفتار کیے گئے اور انہیں دلائی کیمپ میں بے حد تشدد سے موت کی نیند سلا دیا گیا۔ یہ تمام واقعات بلوچستان میں ایک تصادم کی فضا پیدا کر رہے تھے اور زخم گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

جنرل ضیاء الحق برسرِ اقتدار آئے' تو انہوں نے عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے سارے مقدمات واپس لے لیے اور حیدرآباد ٹریبونل ختم کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بلوچستان میں امن قائم ہوگیا اور زندگی معمول پر آگئی۔ جنرل رحیم الدین خاں جو صوبے کے گورنر مقرر ہوئے' تو انہوں نے ترقیاتی منصوبوں کا ایک جال بچھا دیا اور انہی کے زمانے میں پہلی بار کوئٹہ شہر کو گیس فراہم کی گئی اور انفراسٹرکچر کی تعمیر پر بھرپور توجہ دی گئی۔ جنرل ضیاء الحق کے ۱۱ برسوں میں بلوچستان

قومی یک جہتی کے فروغ میں بہت مثالی کردار ادا کرتا رہا جس کے نتیجے میں قوم پرست عناصر قومی دھارے میں آگئے۔ ایک مرحلے پر نواب اکبر بگٹی نے صدارت کے انتخابات میں حصہ بھی لیا تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۹۰ء میں نواب خیر بخش مزاری جو غالباً ۱۹۷۳ء میں کابل چلے گئے تھے اور سوویت یونین کی شکست کے بعد ان کے لیے وہاں قیام عذاب جاں بن گیا تھا تو آئی ایس آئی نے انہیں طیارہ بھیج کر وطن واپس بلایا اور ان کی خاطر مدارات کا بہت خیال رکھا۔ مگر ان کے ہوائی اڈے پر اُترتے ہی بی ایس او کے نوجوانوں نے پاکستان کا پرچم جلایا اور نواب نے اس رقم کی فوری ادائی کا مطالبہ کیا جو انہیں ''معاش'' کے نام پر بھارت سے فراہم کی جاتی تھی۔ ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں سردار اختر مینگل مسلم لیگ (ن) کی حمایت سے کامیاب ہوئے اور بلوچستان کے وزیرِ اعلیٰ بنے۔ سیاسی عمل سے پنجاب اور بلوچستان میں اس قدر قربت پیدا ہوئی کہ جب ۱۹۹۷ء میں موٹروے کا افتتاح ہوا اور وزیرِ اعظم میاں نواز شریف اُس کے راستے لاہور روانہ ہوئے' تو اُن کی کار سردار اختر مینگل چلا رہے تھے۔ جمہوریت کے فروغ سے فاصلے سمٹتے اور دل قریب آتے گئے' مگر جنرل پرویز مشرف کی فوجی مہم جوئی نے پورا منظرنامہ ہی بدل ڈالا، جمہوریت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کے علاوہ قومی وحدت پر کاری ضرب لگائی اور پاکستان کا وقار اور خودمختاری امریکا کے ہاتھوں فروخت کر ڈالی۔ امریکی جنگ کو اپنی جنگ قرار دینے سے پاکستان میدانِ کارزار بن گیا اور خودکش حملوں میں ہزاروں سویلین اور فوجی شہید ہوئے۔ ان کی حد سے بڑھی ہوئی خوداعتمادی اور خودسری کا سب سے بڑا نقصان بلوچستان کو پہنچا جس کی تلافی اب شاید آسانی سے نہ کی جاسکے گی۔

جنرل پرویز مشرف ہر مسئلے کا فوجی حل چاہتے تھے۔ اُن کا زعم تھا کہ بندوق کی طاقت سے بلوچستان کے سرداروں کا قلع قمع کر کے عوام کو باختیار بنایا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے اس خبط کا برملا اظہار بھی کرتے۔ غالباً ۲۰۰۴ء کا ذکر ہے کہ کونسل آف نیوز پیپر ایڈیٹرز نے انہیں لاہور میں ظہرانے کی دعوت دی جس میں قومی مسائل زیرِ بحث آئے۔ ذیرہ بگٹی میں بدامنی کا ذکر چھڑا' تو انہوں نے کسی تامل کے بغیر کہا کہ ہم ان سرداروں کو اس طرح ہٹ کریں گے کہ انہیں کچھ پتا ہی نہیں چلے گا کہ اُن کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔ غالب گمان یہ ہے کہ اُن کی سوچ کے عین مطابق بیاسی سالہ نحیف وزار بلوچ سردار نواب اکبر بگٹی غار کے اندر میں سے اُڑا دیے گئے جہاں وہ اپنے حریف قبیلے کے علاقے میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ جنرل صاحب نے اسی رات اس 'عظیم' کارنامے پر فوجی افسروں کو مبارک باد پیش کی۔ ہم نے اس وقت لکھا تھا کہ بلوچ نوجوانوں کو آزادی کی جنگ لڑنے کے لیے ایک بوڑھے سردار کی لاش میسر آگئی ہے اور اس بار مزاحمت کا رنگ یکسر جدا ہوگا جو ملکی سالمیت کے لیے ایک بڑے خطرے کی شکل اختیار کر جائے گا۔ اُنہی کے دور میں مزاحمت کار لاپتا ہونے لگے جن کی تعداد بعض تحقیقاتی اداروں کے مطابق سیکڑوں کی حد سے گزر کر ہزاروں تک جا پہنچی ہے۔ لوگوں نے دیکھا کہ خفیہ ایجنسیوں کے کارندے 'ناپسندیدہ' شہریوں کو گھروں' دکانوں اور دفتروں سے اُٹھا لے جاتے اور انہیں غائب کر دیتے ہیں۔ معروف قانون دان جناب علی احمد کرد لاپتا افراد کی بازیابی کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور انصاف کی بھیک مانگتے رہے' مگر ظلم کا بازار گرم ہی رہا۔ صوبے کو کیسی تباہی سے دوچار کرنے کے لیے پرویز مشرف نے یہ کیا کہ ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں جعل سازی کے ذریعے بلوچستان اسمبلی میں ایسے افراد پہنچا دیے جو عوام کے حقیقی نمائندے نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو اسمبلی وجود میں آئی اور جو حکومت قائم ہوئی' اُس نے بلوچستان کے معاملات سدھارنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اُن کی ساری توجہ لوٹ مار اور سالانہ ۲۵ کروڑ کی ترقیاتی گرانٹ پر لگی رہی۔ اس پر امن و امان تباہ و برباد ہوتا رہا'

قتل وغارت کا مکروہ کھیل جاری رہا' ٹارگٹ کلنگ ہوتی رہی اور یوں بلوچستان پاکستان کا مسئلہ نمبر ایک بن گیا ہے۔

بلوچستان میں خرابی اور تعمیر کے کام ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ایک طرف قتل اور غارت گری جاری ہے اور دوسری طرف چھاؤنیوں کے بجائے تعلیمی شہر آباد کیے جا رہے اور نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا ہونے لگے ہیں۔ قبائلی جھگڑوں کی وجہ سے مری قبیلے کے علاقے چمالانگ میں سالہا سال سے کوئلے کی کانیں بند پڑی تھیں' فوج کی مصالحانہ کوششوں سے اُن میں دوبارہ کام شروع ہوگیا ہے اور اُن کی آمدنی کے ایک حصے سے بلوچ طالب علم پاکستان بھر کے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ ترقیاتی منصوبوں کے لیے ۱۶۰/ارب کے وسائل فراہم کیے جا چکے ہیں اور سوئی گیس کی واجب الادا رائلٹی بھی ادا کی جا رہی ہے۔ صوبائی خودمختاری کا دیرینہ بنیادی مطالبہ تسلیم کرلیا گیا ہے اور تمام زیرِ زمین قدرتی وسائل پر صوبوں کا حق تسلم کرلیا گیا ہے۔ لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ بلوچ نوجوان پھر بھی بپھرے ہوئے ہیں اور عسکریت پسندی کی طرف مائل ہیں۔ اُن کی بنیادی شکایت یہ ہے کہ بلوچستان کے بارے میں فیصلے عوام سے مشورے اور منظوری کے بغیر کیے جا رہے ہیں' فوج اور خفیہ ایجنسیاں اُن پر حکمرانی کر رہی ہیں اور اُن کی نسل کشی ہو رہی ہے۔ ان شکایات کے ازالے میں ہمارے اربابِ اختیار نے مجرمانہ غفلت سے کام لیا ہے اور حالات میں بہتری لانے کے نہایت قیمتی مواقع ضائع کر دیے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی تاریخ میں ایک ایسا موڑ آیا تھا جب مذاکرات کے لیے فضا قدرے سازگار ہو چلی تھی' مگر جنرل یحییٰ خاں نے مصالحت کا ہاتھ بڑھانے کے بجائے غراہٹ سے کام لیا جس کے بعد ملکی حالات پوائنٹ آف نو ریٹرن تک پہنچ گئے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے آپریشن کے دوران قومی اسمبلی میں عوامی لیگ کی بھاری اکثریت بھارت فرار ہوگئی تھی اور جلاوطن حکومت قائم کرلی تھی' لیکن درپردہ مصالحتی کوششوں کے نتیجے میں عوامی لیگ کی قیادت واپس مشرقی پاکستان میں آجانے اور مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کے لیے آمادہ ہوگئی تھی' لیکن جنرل یحییٰ خان کی جولائی ۱۹۷۱ء کی تقریر نے تمام کوششوں پر پانی ڈال دیا جس کے باعث بھارت کو فوجی مداخلت کا جواز حاصل ہوگیا تھا۔

پرویز مشرف نے بھی بلوچستان کی تاریخ کے ایک انتہائی نازک موڑ پر اُسی قسم کی خردماغی کا مظاہرہ کیا۔ یہ ۲۰۰۳ء کی بات ہے جب نواب اکبر بگٹی اور وفاقی حکومت کے مابین تعلقات بڑے کشیدہ ہوگئے تھے۔ چودھری شجاعت حسین چند ماہ کے لیے وزیرِاعظم بنے' تو اُنہوں نے بلوچستان پر پارلیمانی کمیٹی قائم کرنے کا اعلان کیا جس کا مینڈیٹ حالات کے سدھار کے لیے آئینی اور سیاسی سفارشات پیش کرنا تھا۔ جناب وسیم سجاد اور جناب مشاہد حسین سید نے بڑی دماغ سوزی اور اپنی دقتِ نظر سے تجاویز مرتب کیں اور عمل درآمد کے لیے جنرل پرویز مشرف کو ارسال کردیں۔ اسی دوران ڈیرہ بگٹی میں امن و امان کی صورتِ حال بہت خراب ہوگئی۔ اس کڑے وقت میں چودھری شجاعت اور مشاہد حسین سید' نواب اکبر بگٹی سے ملنے گئے اور طویل گفت وشنید کے بعد معاملات طے پاگئے' اکبر بگٹی اسلام آباد آنے کے لیے رضامند ہوگئے اور وہ کوئٹہ ہوائے اڈے پر کئی گھنٹے خصوصی طیارے کا انتظار کرتے رہے۔ طیارہ نہ آنے کی وجہ سے معاملات بہت بگڑ گئے اور جنرل مشرف نے طاقت استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا اور نواب اکبر بگٹی شہید کردیے گئے۔ اس حادثے کے ردِعمل میں بلوچ نوجوانوں نے علمِ بغاوت بلند کردیا۔ اس کے بعد ہی براہداغ بگٹی، ہربیار مری اور خان آف قلات نے سرکشی اختیار کی اور اُن کے حمایتیوں نے ایسی فضا پیدا کردی جس میں پاکستان کا پرچم لہرانا اور پاکستان کا قومی ترانہ بجانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہوتا چلا گیا۔ مجھے وہ منظر آج بھی یاد ہے کہ میں ۱۴/اگست ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں تھا

اور یومِ پاکستان کے موقع پر پاکستان کا پرچم پورے شہر میں صرف دو چار مقامات پر لہراتا ہوا نظر آیا تھا۔

حالات کو آخری سطح تک پہنچنے سے روکنے کے لیے ہمارے حکمرانوں کو غیر معمولی سنجیدگی اور دوربینی کا ثبوت دینا اور وقت کی نزاکت کا پورا احساس رکھنا ہوگا۔ مارچ ۲۰۰۸ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی اور ستمبر میں جناب آصف علی زرداری صدر منتخب ہوئے' جنھوں نے بلوچ سردار ہونے کے حوالے سے ماضی کی غلطیوں پر بلوچستان کے عوام سے معافی مانگی تھی اور وزیرِاعظم سید یوسف رضا گیلانی کی طرف سے آل پارٹیز کانفرنس بلانے کا اعلان ہوا تھا' مگر مسائل کی تہ تک پہنچنے اور بلوچ قیادت سے مذاکرات کی راہ ہموار کرنے کے لیے ان دونوں اعلیٰ شخصیتوں نے بلوچستان میں چند روزہ قیام بھی پسند نہیں کیا۔ پھر ایک شام بلوچستان کے اسٹیک ہولڈرز سے مشاورت کے بغیر ''آغازِ حقوقِ بلوچستان پیکج'' کا اعلان کردیا گیا جس کے ۲۹/نکات میں سے بیشتر روشن مستقبل کی نوید دیتے تھے' مگر بلوچستان میں اُسے اپنانے کے لیے کوئی قابلِ ذکر گروپ آمادہ نہیں تھا۔ سب سے بڑی خرابی اس کے نام کے اندر مضمر تھی۔ آغازِ حقوقِ بلوچستان کے نام سے یہی تاثر قائم ہوا کہ اس بدنصیب صوبے کو حقوق دینے کا پہلی بار آغاز ہوا اور اس سے پہلے وہ بے گوش اور بے اختیار علاقہ تھا۔ حکومت اگر اس پیکج پر عمل درآمد میں واقعی سنجیدہ ہوتی' تو بلوچستان میں اس کام کے لیے ایک خصوصی نمائندہ مقرر کرتی جو اسٹیک ہولڈرز کے تعاون سے ترقیاتی منصوبوں کی نگرانی کرتا اور سیاسی مشاورت کو فروغ دیتا۔ محض شعبدہ بازی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بلوچستان کے عوام شدید احساسِ محرومی کا شکار ہیں۔ وفاق کی طرف سے جو بھی وسائل فراہم کیے گئے وہ ارکانِ اسمبلی، بیوروکریسی اور بڑے چھوٹے سرداروں کی جیبوں میں چلے گئے۔

بلوچستان کے مسئلے کی سنگینی سب سے پہلے جناب نواز شریف نے محسوس کی۔ وہ کراچی میں سردار عطاء اللہ مینگل سے ملے اور اُن سے بگڑے ہوئے حالات میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی استدعا کی۔ سردار صاحب نے اعتراف کیا کہ ان کے ہاتھ سے معاملات نکل چکے ہیں اور اب مذاکرات پہاڑوں کا رُخ کرنے والے ناراض نوجوانوں سے کرنا ہوں گے۔ اسی کے بعد میاں صاحب کوئٹہ میں چند اور بلوچ زعما سے ملے اور پاکستان سے محبت کرنے والے عناصر سے تاریخ کے نازک موڑ پر استقامت سے کام لینے کی دعوت دی۔ وہ بلوچستان پر آل پارٹیز کانفرنس بلانے کا عندیہ بھی دے چکے تھے' مگر ۲۰ مروین آئینی ترمیم کے جھمیلوں میں پھنس گئے۔ امریکی کانگرس میں بلوچستان کی آزادی اور عظیم بلوچستان کی قرارداد پیش ہونے پر ہمارے بلند قامت وزیرِاعظم نے انگڑائی لی اور ۴/سال بعد آل پارٹیز کانفرنس بلانے کی دوبارہ تجویز پیش کی ہے جسے قوم پرست قیادت نے مسترد کردیا ہے اور جناب نواز شریف نے ۲/بنیادی شرائط عائد کی ہیں کہ مذاکرات کی کامیابی کے لیے اعتماد سازی کے اقدامات ضروری ہیں جن میں نواب اکبر خاں بگٹی کے قاتل جنرل پرویز مشرف کی گرفتاری اور لاپتا افراد کی بازیابی سرِفہرست ہیں۔ ان دونوں مطالبات پر پورے بلوچستان کی سیاسی اور مذہبی قیادت کا اتفاق پایا جاتا ہے اور یوں نظر آتا ہے کہ دفاعِ پاکستان کونسل نے ۲۷/فروری کو بلوچستان میں آل پارٹیز کانفرنس بلانے کا جو اعلان کیا ہے' اس میں غالباً بھی اسٹیک ہولڈرز شرکت کریں گے اور رستے ہوئے زخموں پر مرہم رکھنے کی تدبیر کریں گے۔

آزاد بلوچستان کی امریکی کانگرس میں قرارداد پر ہمارے دفترِ خارجہ کے علاوہ تمام سیاسی اور دینی جماعتوں نے شدید ردِعمل ظاہر کیا ہے' تینوں صوبائی اسمبلیوں نے مذمت کی قراردادیں منظور کی ہیں' مگر بلوچستان اسمبلی کی خاموشی پر قومی حلقے

حیرت زدہ ہیں۔ ہمارے بھی ٹی وی چینلز مختلف پہلوؤں سے بلوچستان کی صورتِ حال کا جائزہ لے رہے ہیں اور گمبھیر مسئلے کا حل زیرِ بحث لا رہے ہیں۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ پنجاب کی طرف سے بلوچستان کے عوام کے ساتھ گہری وابستگی کا اظہار کیا جائے، وفاقی حکومت کی سطح پر نمائشی اعلانات کے بجائے عملی اقدامات کی ترجیحات طے کی جائیں اور تاریخ کی روشنی میں غلط مفروضوں کا پردہ چاک کیا جائے۔ معافی مانگنے، غیر سنجیدہ مکالموں اور سیاسی ڈراموں کا وقت گزر چکا ہے۔ ہمارے وزیرِ اعظم بلوچستان کی ناراض قیادت کو دور بیٹھے مذاکرات کی دعوت دیتے رہے، مگر اس کے ساتھ رابطوں کے لیے سرے سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ شاید اب انہیں معاملات کی سنگینی کا احساس ہوا ہے، مگر مشکل یہ آن پڑی ہے کہ پُلوں کے نیچے سے بہت پانی بہہ چکا اور اعتماد کے رشتے ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ ہمارے داخلی معاملات میں غیر ملکی طاقتوں کے ملوث ہونے سے حالات ایک خطرناک رُخ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ جن پر قابو پانے کے لیے اجتماعی دانش اور مضبوط قوتِ ارادی برائے کار لانا ہوگی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مطالبات کا ایک انبار لگتا جا رہا ہے، لیکن اصل بات باہمی اعتماد کو فروغ دینے کی ہے۔ اعتماد سازی کے لیے جنرل پرویز مشرف کے خلاف ریاست کی طرف سے ایف آئی آر کا اندراج اور اُن کی انٹر پول کے ذریعے گرفتاری ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔ اسی ایک اقدام سے حکومت کی سنجیدگی اور کومٹ منٹ کا صحیح پیغام جائے گا۔ اسی طرح خفیہ ایجنسیوں کا سیاسی کردار ایک قلم ختم کرنا اور سول اداروں کو آزادی اور ذمے داری سے اپنے فرائض ادا کرنے کے مواقع فراہم کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ یہ شکایت عام ہے کہ حکومتِ بلوچستان بالکل بے اختیار ہے جس پر غیر منتخب اداروں کی طرف سے فیصلے مسلّط کیے جا رہے ہیں۔ بلاشبہ سیاسی طور پر آفت زدہ صوبے میں فوج کا بہت زیادہ عمل دخل رہا ہے، جسے سرحدوں کے تحفظ تک محدود کر دینے سے شہریوں کا اعتماد بحال ہوگا۔ خوش قسمتی سے جنرل کیانی ایک متوازن اور صحت مند سوچ کے مالک ہیں اور وہ ڈیڑھ سال پہلے ہی فوجی آپریشن ختم کرنے اور آیندہ نئی چھاؤنی کی تعمیر سے دست بردار ہو جانے کا اعلان کر چکے ہیں۔ انہوں نے یہ مژدہ بھی سُنایا تھا کہ جن علاقوں میں چھاؤنیاں بنانے کے منصوبے تیار تھے، وہاں تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں گے۔ عسکری قیادت نے یہ عندیہ بھی دیا تھا کہ فوج میں ہر صوبے کی آبادی کے تناسب سے جوان بھرتی کیے جائیں گے تاکہ صحیح معنوں میں وہ ایک قومی فوج بن جائے۔ بلوچستان کے حصے میں ۲۰ ہزار افراد آئے ہیں جن میں سے ۱۵ ہزار جوان بھرتی کیے جا چکے ہیں اور مزید ۵ ہزار اسی سال ریکروٹ کیے جائیں گے۔ ان بڑے مثبت اقدامات کے ساتھ روشن مستقبل کی تعمیر عمل میں آ رہی ہے، مگر حالات ہماری حکومتوں کی بے انصافی، بے تدبیری اور طاقت آزمائی کے سبب جس نہج تک آ پہنچے ہیں، وہ برق رفتار اور ایقان افروز حکمتِ عملی کے متقاضی ہیں۔ ہمیں سب سے پہلے پوری دیانت داری سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنا اور ماضی اور حال کے نقصانات کے ازالے کے لیے غیر معمولی ایثار اور سیاسی پیش قدمی سے کام لینا ہوگا۔ اسلام آباد کے تخت نشین حکمرانوں نے بلوچستان کے حقوق بُری طرح پامال کیے ہیں، جن کا زمینی حساب دینا ہوگا اور اپنا مائنڈ سیٹ بدلنا ہوگا۔ اس مائنڈ سیٹ کی تبدیلی ہی سے باہمی اعتماد نشو و نما پائے گا۔ اعتماد کے رشتے فوری طور پر مضبوط کرنے کے لیے آئی ایس آئی کے علاوہ تمام خفیہ ایجنسیوں کو براہِ راست کی بمبن اور بھانجی کے قاتلوں کا بڑی خلفشاری سے سراغ لگانا اور انہیں انصاف کے کٹہرے میں لانا ہوگا۔ بلوچ خواتین کی ہلاکت کا جو خونیں منظر سامنے آیا ہے، وہ شدید ترین مذمت کے علاوہ پاکستان دشمن اور سفاک درندوں کو

کیفرِ کردار تک پہنچانا بلوچ بھائیوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے بے حد مدد گار ثابت ہوگا۔

بلوچستان میں پاکستان سے محبت کرنے اور اس کا مستقبل سنوارنے کا عزم رکھنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ بگٹی، مری اور مینگل، ریسانی، مگسی، جوگیزئی اور زہری قبائل میں ہزاروں نوجوان اپنے وطن کی قدر و قیمت سے پوری طرح آگاہ ہیں اور بزنجو قبیلہ پاکستان کے ساتھ تعلق کی ایک روشن تاریخ رکھتا ہے۔ جناب محمود خاں اچکزئی، مولانا عبدالغفور حیدری، حافظ حسین احمد، ڈاکٹر عبدالمالک، سردار ثناء اللہ زہری پاکستان کی سوچ کو پروان چڑھانے میں بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن کی جمعیت علمائے اسلام ایک بہت بڑی سیاسی اور مذہبی طاقت ہے اور جماعتِ اسلامی کا بھی اپنا ایک مضبوط حلقہ موجود ہے۔ نیشنل پارٹی سرداروں کے خلاف اور عوام کے حقوق کے لیے بہت سرگرم ہے جبکہ پختونخواہ عوامی ملی پارٹی بڑے اثر و رسوخ کی مالک ہے۔ ان تمام قوتوں کو یکجا کرنے اور مشاورت کا دائرہ مزید بڑھانے کی اشد ضرورت ہے۔ گوریلوں کی تعداد ایک ڈیڑھ ہزار بتائی جاتی ہے جنھیں حُسنِ تدبیر اور سٹراٹیجک منصوبہ بندی کے ذریعے راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شورش پسندوں کے ۵/ بڑے لیڈر بلوچستان کے سب سے دولت مند افراد میں شمار ہوتے ہیں جن کو عوام کی غربت اور بدحالی کا غم کھایا جا رہا ہے۔ بلوچ عوام کے وہ حقوق جو ماضی میں چھینے جاتے رہے ہیں، انہیں احساسِ ندامت اور فراخ دلی سے لوٹا دینا لازم آتا ہے۔ اس میدان میں سیاسی جماعتوں کو وقت ضائع کیے بغیر پیش قدمی کرنا ہوگی اور فوج اور خفیہ ایجنسیوں کو سیاسی معاملات سے بے دخل کر دینا ہوگا، البتہ انہیں قومی سلامتی کے تحفظ کے لیے پوری طرح چوکس رہنا اور عوام کے اعتماد پورا اُترنا ہوگا۔ بدلے ہوئے حالات میں دہشت گردوں اور تخریب کاروں کی گرفتاری، تفتیش، پراسیکیوشن اور گواہوں کی شہادت کے مناسب قوانین پارلیمنٹ کو جلد منظور کرنے اور آرمی ایکٹ میں نئے تقاضوں کے مطابق ترامیم کرنی چاہئیں تاکہ خفیہ ایجنسیوں کو حدود میں رکھا جا سکے اور پولیس کو اپنی ذمے داریاں پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ ادا کرنے کا پابند بنایا جا سکے۔

بلوچستان میں انسانی ہلاکتوں کے مہیب سلسلے سے امریکی کانگرس میں ۳/ ارکانِ پارلیمنٹ نے جو آزاد اور عظیم بلوچستان کے بارے میں قرارداد پیش کی ہے، وہ ہمارے لیے ایک چیلنج بھی ہے اور اپنے اندر بنیادی تبدیلی لانے کا نادر موقع بھی۔ چیلنج اس معنی میں کہ یہ ایک بہت کارآمد سیاسی حربہ ہو سکتا ہے جسے مسز اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے سے پہلے آزمایا تھا اور بڑی طاقتوں کے دارالحکومتوں میں جا کر پاک فوج کے ہاتھوں بنگالیوں کی نسل کشی کی دہائی دی تھی۔ اس زہریلے پراپیگنڈے نے اس وقت عالمی برادری میں پاکستان کو تنہا کر دیا تھا، لیکن اب اصل حقائق سامنے آنے لگے ہیں اور بنگلہ دیش کے محقق اور مورخ کتابوں پر کتابیں شائع کر رہے ہیں کہ ۳۰ لاکھ انسانوں کا قتل اور لاکھوں خواتین کی بے حرمتی بہت بڑا مبالغہ اور ایک بے حقیقت تھا جبکہ بنگالیوں نے غیر بنگالیوں پر ناقابلِ بیان ظلم ڈھائے تھے۔ دشمنی سے پاکستان اُس وقت دنیا کو باور کرانے میں ناکام رہا تھا کہ فوجی آپریشن میں قانونی اور اخلاقی ضابطوں کا خیال رکھا گیا تھا۔ بلوچستان کے حوالے سے سیکورٹی اور انٹیلی جنس اداروں کو اپنی پوزیشن بلا تاخیر صاف کر دینی چاہیے تاکہ عالمی رائے عامہ گمراہ نہ ہونے پائے۔ اوباما انتظامیہ پاکستان کو تواتر کے ساتھ یقین دلا رہی ہے کہ اس کا قرارداد سے کوئی تعلق نہیں اور وہ بھاری اکثریت سے مسترد ہو جائے گی۔ یہی امریکی اعلیٰ عہدے دار بھی کہہ رہے ہیں کہ ہم پاکستان کی خود مختاری اور علاقائی سالمیت کا بہت احترام کرتے اور اس کے ساتھ روابط ہمارے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

موجودہ حالات میں ان یقین دہانیوں کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ ان کا فائدہ ضرور اُٹھانا چاہیے' مگر اُن پر مکمل اعتبار کرنے سے پہلے بہت کچھ سوچنا ہوگا کہ یہ قرارداد اسی روز کیوں پیش کی گئی جس وقت اسلام آباد میں پاکستان' ایران اور افغانستان کی سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی اور پاکستان کی طرف سے یہ اعلان کیا جا رہا تھا کہ ایران پر حملے کے لیے وہ اپنی سرزمین استعمال نہیں ہونے دے گا اور گیس پائپ لائن کا منصوبہ ضرور مکمل کیا جائے گا۔

اس ضمن میں حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں کو مسئلے کی سنگینی کا احساس ہو گیا ہے اور بڑی سیاسی اور دینی جماعتیں بلوچ عوام کے ساتھ وسیع پیمانے پر یک جہتی کا اظہار کر رہی ہیں۔ اس ماحول میں علیحدگی کے امکانات حد درجہ محدود ہو گئے ہیں۔ یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ علیحدگی پسند عناصر کو عوام کی حمایت حاصل نہیں جو ناانصافیوں کے گہرے زخم کھانے کے باوجود پاکستان کے بندوبست میں اپنا مستقبل محفوظ سمجھتے ہیں۔ بلوچ حلقوں میں یہ سوال بھی زیرِ بحث آ رہا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد اسے قائم بھی رکھا جا سکے گا یا کسی بڑی طاقت کی غلامی قبول کرنا پڑے گی۔ بلوچوں کے بزرگ لیڈر سردار عطاء اللہ مینگل نے بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے مسلح نوجوانوں سے بھی یہی سوال کیا تھا اور وارننگ دی تھی کہ تم کسی اور طاقت کے غلام بن جاؤ گے۔ تمام سنجیدہ بلوچ لیڈروں نے اس حقیقت کا ادراک کیا اور وہ اپنے باغی نوجوانوں سے اتفاق نہیں کر رہے۔ پاکستان کی ریاست اگر اپنی ذمے داریاں ٹھیک طور پر خیال کرتی اور اپنے شہریوں کی جان' مال اور آبرو کے تحفظ میں کامیاب رہتی اور اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے سازگار ماحول اور منصفانہ نظام فراہم کرتی ہے' تو علیحدگی کی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکے گی اور عظیم تر بلوچستان کا واہمہ کبھی حقیقت کا روپ نہیں دھار سکے گا' کیونکہ ایرانی بلوچ مذہبی اعتبار سے بڑے انقلابی ہیں جبکہ پاکستانی بلوچ سیکولر مزاج نظریات کے حامل ہیں۔ پاکستان کو گمبھیر مسائل کے بھنور سے نکلنے کے لیے امریکا سے برابری اور خودمختاری کی بنیاد پر ازسرِنو تعلقات استوار کرنا' سول ملٹری روابط کو ہموار اور متوازن بنانا' ایگزیکٹو اور عدلیہ کے درمیان غیر ضروری چپقلش پر قابو پانا اور کرپشن اور بدترین بدانتظامی کے قلع قمع پر نہایت سنجیدگی سے توجہ دینا ہوگی۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ سیاسی جماعتوں اور قومی سلامتی کے اداروں کو قانون اور اخلاق کی عملداری کے تحت لانا ہوگا۔ عدلیہ عوام کے مفاد میں بڑے دوررس فیصلے کر رہی ہے جن سے لاپتا افراد کے درپردہ معاملات بھی سامنے آ رہے ہیں اور انتخابات کے ذریعے عوام کی حقیقی نمائندگی کا حصول بھی ممکن دکھائی دیتا ہے۔ ہم یقیناً بالغ نظری' میانہ روی' ایثار کیشی اور احترامِ باہمی کے ذریعے مشکل وقت کو نئے امکانات میں تبدیل کر سکتے ہیں اور ایک ایسا بندوبست وجود میں لا سکتے ہیں جس میں شہریوں کے لیے بے حد کشش پائی جاتی ہو۔ امریکا اور بھارت نے بلوچستان پر بہت کام کیا ہے اس لیے ہمیں کسی خوش فہمی میں رہنے کے بجائے جلد سے جلد معاشرتی عدل کا اہتمام اور جمہوری سیٹ اپ میں عوام کی فعال شراکت کی ضمانت دینا ہوگی۔ پاکستان کی ان حقیقی ضمانتوں کے ساتھ لیڈروں کا زور ٹوٹ جائے گا اور انہیں عالمی قانون اور عظیم ریاست کے سامنے سرنڈر کرنا پڑے گا کیونکہ ٹی وی چینلز پر اُن کا بھرم کھل چکا ہے اور یہ حقیقت سامنے آ چکی ہے کہ اُن کے مطالبات میں کوئی تاریخی حقیقت نہیں اور وہ باہر کی طاقتوں کا آلۂ کار بنے ہوئے ہیں، تاہم شائستگی اور متانت کے ساتھ گفتگو کا دروازہ نا صرف کھلا بلکہ اپنی حدود میں رکھنا ہوگا ورنہ یہ ڈر ہے کہ اُن کی بے سروپا باتوں سے ردِعمل کے طور پر پختون حقوق کی نئی بحث بھی شروع ہو جائے گی۔

"ہم یہاں بیٹھ کر امریکیوں کے برابر کما رہے ہیں"

۴۱۲ فیصد سالانہ کی رفتار سے ترقی کرنے والی پاکستانی کمپنی

"صوفی زار" کے سربراہ ظفر خان کی باتیں

اہلِ مغرب کی کاروباری کامیابیوں کی داستانیں پڑھ پڑھ کر خوشی سے زیادہ ایک بے نام سی کیفیت کا تحفہ ملتا ہے جو تادیر بے چین رکھتا ہے۔ آخر اُن میں ایسا خاص کیا ہے کہ جسے دیکھو زمین سے اٹھتا ہے اور چند ہی سالوں میں آسمان کو چھونے لگتا ہے۔ پھر اپنی کامیابیوں کی داستانیں سنانے، چھپوانے اور بکوانے کی راہ پر نکل کھڑا ہوتا ہے اور رول ماڈل ٹھہرتا ہے۔ اتنے سال یونیورسٹیوں میں پڑھانے کے دوران مغربی، امریکی، یورپی جس جس مصنف کو بھی پڑھا اور پڑھایا، کچھ باتوں پہ سب کا اتفاق پایا۔ بڑے بڑے خواب دیکھو، خود پیسے مت کماؤ، پیسے کو پیسا کمانے پر لگاؤ۔ کاروبار کو ہر صورت میں اقدار (Ethics) کے ساتھ لے کر چلو۔ اقدار کے بنا کوئی کامیابی نہیں ملتی۔ تخلیقی ذہن کے ساتھ سوچو، مینیجر مت بنو، بزنس لیڈر بنو، رول ماڈل بنو، وژن کے ساتھ اگر ویلیوز نہ ہوئیں تو سب

ختم ہوجائے گا۔ انسانوں کی عزت کرو، ان کو اپنا اثاثہ جانو، خوب پڑھو، نیا سیکھو، پھر پڑھاؤ اور کر دکھاؤ۔

دل کی بات کہوں تو ان میں کوئی بھی بات جھوٹی یا بے وزن نہیں۔ اہم اس لیے کہ کہنے والے کر کے دکھا رہے ہیں اور اپنی باتیں منوا رہے ہیں۔ سوچا ہماری سیاسی بے چینیاں اپنی جگہ پر انتظامی کمزوریاں بھی بہت مگر یہ اپنا ملک، یہ اپنے لوگ خدا نے تو زرخیز بنانے میں ذرا کمی نہیں رکھی۔ ہم ہی ہمیشہ چوک جاتے ہیں۔ جہاں تنقید کرنی چاہیے وہاں پاؤں پڑ جاتے ہیں۔ جہاں تعریف کا موقع آتا ہے وہاں کیڑے نکالنے لگتے ہیں۔ اس لیے جو حاصل کرنا چاہیے جو سیکھنا چاہیے اکثر اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔

زندگی تنقید کرنے سے خوش حال ہونے والی ہوتی تو تنقید نگار ادب اور نقطہ چیں زندگی میں بہت کامران ٹھہرتے۔ مگر دونوں ہی کچھ عرصے بعد پہچانے نہیں جاتے۔ اردو ڈائجسٹ میں چند ماہ سے پاکستان کی نئی بزنس ایمپائرز کے سرکردہ لوگوں کو ڈھونڈنے اور آپ سے ملانے کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اب وہ باقاعدہ بزنس رول ماڈلز کی تلاش بن گیا ہے اور خود ہمارے لیے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی لا رہا ہے۔ پاکستان کی تیزی سے ترقی کرنے والی ۲۵ رشفاف کمپنیوں کا تذکرہ اس جستجو کو اور مہمیز کر گیا۔

دنیائے کمپیوٹر کی ایک بہت بڑی کمپنی ڈیل (Dell) کے سربراہ، مائیکل ایس ڈی کی ایک چھوٹی سی بات نے ہاتھ پکڑا کہ ''کامیابی چاہیے یا کوئی مختلف اور منفرد کام کرنا ہو تو سب سے پہلا کام یہ کریں کہ دکان سے خریدا ہوا نقشہ (Map) پھینک کر اپنا نقشہ خود بنائیں۔''

اس ماہ کے مہمان، ظفر خاں سے ملنے روانہ ہوئے تو اس انٹرویو کے سوالات کا نقشہ پھاڑ چکا تھا۔ ہمارا نوعمر فوٹو گرافر عرشیان ایک رات پہلے ظفر خان کی سو سے زیادہ تصاویر بنا لایا تھا۔ ان تصاویر کو ذہن سے جھٹکا اور ڈیفنس فیز کے کارنر پہ واقع اس پلازے پہ نظریں جمادیں جس کے پہلے فلور پہ ٹیکس اینڈ بیکس تھی اور اوپر کے دونوں فلور پہ ''صوفی زار'' کے دفاتر۔ یہ کیلیفورنیا بیسڈ پاکستانی کمپنی ہے جس کے سی ای او ظفر خان ہیں۔ انھوں نے کیلیفورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے انجینئرنگ کی، ان کے والدین اور اعزا و اقارب سب وہیں آباد ہیں۔

۲۰۰۴ء میں انھوں نے ایک ڈرامائی فیصلہ کیا اور اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر پاکستان آگئے۔ اسی سال انھوں نے ایک اور منفرد کام کیا، صوفی زار کا آغاز کیا۔ یہ کمپنی کرتی کیا تھی مجھے بہت دیر سمجھ نہ آسکی۔ طیب صاحب کا خیال تھا کہ ای مارکیٹنگ کرتی ہے۔ عاطف کا اصرار تھا یہ نیٹ پہ Optimization کرتی ہے۔ حیرت اس بات پہ تھی کہ ۲۰۰۷ء میں اس نے ایم آئی ٹی ایکسلریشن ایوارڈ بھی جیت لیا جو بڑی وقعت کا حامل ہے پھر دنیا کے قابل اعتبار ترین تعلیمی اداروں میں سے ایک ایم آئی ٹی کے ۳ر پروفیسروں نے صوفی زار کا ایڈوائزر بننے کا فیصلہ کیا۔ اس کمپنی کا گروتھ ریٹ ۴۱۲ رفیصد سالانہ ہے۔ کبھی کبھی تو ۸۰۰ رفیصد سے بھی زیادہ۔ کمپنی نے ۲۰۰۹ء میں ۱۰ رملین ڈالر کمائے۔ ۲۰۱۰ء میں صوفی زار پاکستان کی ۲۵ تیز رفتار کمپنیوں کا حصہ بن گئی۔

ظفر خان سے ملاقات تیسرے فلور پہ ہوئی۔ ایک چھوٹا سا دفتر جس پہ کاغذ چپکا تھا ''Z''۔ ساتھ میں پورے ہال میں بڑی تعداد میں لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ کل ۷۰ رکے قریب لوگ تھے۔ ٹیپ ریکارڈ آن کرنے سے پہلے میں نے حیرت سے اپنی کرسی کی طرف دیکھا۔ وہ لکڑی کی تھی۔ غور کیا تو ہر کرسی کی سیٹ، یا فوم غائب تھا۔ میری حیرت دیکھ کر بولے یہ آرام دہ ہیں اور بائی ڈیزائن ایسی ہیں۔ لمبی نشست میں بھی تھکاتی نہیں ہیں۔ میں انمانے دل سے بیٹھ تو گیا مگر آخر تک نہیں جان سکا کہ لکڑی آرام دہ کیسے ہوسکتی ہے۔

ظفر خان پاکستان آنے سے پہلے چین/ہانگ کانگ میں کام کر چکے ہیں۔ چینی زبان انہیں خوب آتی ہے۔ یہ انہوں نے تعلیم کے دوران سیکھی۔ جب ۱۰ رسال پہلے امریکا میں اس کے پروفیسر نے انہیں کہا کہ جرمن مت سیکھو، ماضی کی بات اور زبان ہے۔ آنے والا وقت چین کا

ہے۔ چینی زبان سیکھو اور ظفر نے اچھے ماننے والے شاگرد کی طرح استاد کی بات دل سے مان لی اور پھر سالوں بعد خوب فائدہ اٹھایا۔

صوفی زار کی ۴ ویلیوز ہیں جو میں نے وہاں پہنچنے سے پہلے دھرالی تھیں۔ آج کی دنیا میں جس ادارے کا لکھا ہوا وژن اور سوچی سمجھی ویلیوز نہیں، وہ بزنس ادارہ بہر حال نہیں اور کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

☆ Integrity and Ethics
☆ Utmost respect for Employees
☆ Innovation not Irritation
☆ Stay unsatisfied

آیئے! ملتے ہیں ظفر خان سے۔ ایک نئے بزنس رول ماڈل سے سوال ہمارے، جواب اُن کے، نتائج آپ خود نکالیے۔

س: اتنا بڑا ادارہ، اتنے ڈھیر سے کام، ۱۰۰ر کے لگ بھگ عملہ، آپ کتنے گھنٹے روزانہ کام کر لیتے ہیں؟

ج: میں روزانہ ۱۲ء سے ۱۴ء گھنٹے کام کرتا ہوں لیکن یہ وضاحت کر دوں کہ میں اس عرصے کے دوران کوئی ایک کام نہیں کرتا۔ مختلف کام انجام دیتا ہوں۔ اس وقت ہمارے ۲ کاروبار، ۲ فرمز ہیں۔ کچھ گھنٹے میں اپنے فارم پر گزارتا ہوں اور کچھ گھنٹے دفتر میں صرف کرتا ہوں۔ ہمارا کاروبار ترقی کر رہا ہے جس کے باعث ہمارے پاس جگہ کم پڑ گئی ہے، اس لیے ہم مزید جگہ حاصل کرنے کی کوشش میں ہیں۔ ہم اپنی کمپنی میں بہت سے لوگ بھی بھرتی کرنے والے ہیں کیونکہ ہم موبائل گیمز کے ایک نئے کاروبار کی شروعات کر رہے ہیں۔ ہماری ترقی کے مزید امکانات موجود ہیں اور ہم ترقی بھی کر رہے ہیں۔

س: تو اس سال آپ کی گروتھ ۲۱۲ء فیصد سے بڑھ جائے گی؟

ج: اِن شاء اللہ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ گروتھ اس سے بھی زیادہ ہو۔

س: آپ Sofizar لفظ کیسے ادا کرتے ہیں؟

ج: ہماری شادی پاکستان میں ہوئی تھی مگر ہماری بیگم

"زیادہ بونس دیں، تو لوگ تنخواہ سے زیادہ کام کرتے ہیں"

یورپ کی ہیں۔ چونکہ ہماری بیگم دوسرے کلچر کی ہیں، اس لیے ہم جانتے تھے کہ ہمارے بچوں کے نام ایسے ہوں جو دونوں کلچر میں کامیاب ہوں۔ ہم نے بچوں کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے نام سوچ ہوئے تھے۔ ایک نام ہم نے صوفیہ اور دوسرا نذر سوچا ہوا تھا۔ اس طرح ہم نے نذر کا ''زز'' اور صوفیہ کا صوفی لے کر اپنی کمپنی کا نام Sofizar رکھا۔ صوفیہ چھوٹی ہے اور نذر بڑا بیٹا ہے۔

س: شادی کب ہوئی؟

ج: شادی ۲۰۰۴ء میں ہوئی اور کمپنی بھی ۲۰۰۴ء میں قائم ہوئی۔ شادی کے اگلے ہی دن ہم نے یہ کمپنی قائم کی۔ بعد کے سالوں میں ہمارے ہاں ایک اور بیٹا پیدا ہوا جس کا نام زکریا رکھا، جس کے نام سے زکی فارم بنایا۔ میری بیگم نومسلم ہیں اور وہ ۹/۱۱ کے بعد مسلمان ہوئی تھیں۔

س: آپ کی وجہ سے مسلمان ہوئیں یا حالات دیکھ کر مسلمان ہوگئیں؟

ج: میری بیگم وکیل ہیں۔ چونکہ ۹/۱۱ کے بعد اسلام کے خلاف بہت باتیں ہوئیں۔ اس لیے میری بیگم نے اپنے طور پر اسلام کے متعلق بہت تحقیق کی اور انھوں نے کہا کہ یہ تو بہت اچھا مذہب ہے۔ وہ پھر عیسائی سے مسلمان ہوگئیں۔

س: آپ سے ملاقات کہاں ہوئی؟

ج: میں سوئٹزرلینڈ میں کام کرتا تھا اور وہ وہیں وکیل تھیں۔ میری ملاقات ان سے کسی دوست کے ذریعے ہوئی۔ انھوں نے ان کا تعارف مجھ سے کروایا کہ یہ مسلمان ہیں اور چاہتی ہیں کہ ان کی شادی کسی مسلمان ہی سے ہو۔ پھر ان دوستوں سے ہمیں ملایا۔ میں نے اپنے والدین سے اجازت لی۔ انھوں نے اجازت دے دی اور یوں ہماری شادی ہوگئی۔

س: Love in first sight والا معاملہ تو نہیں ہوا؟

ج: ایسی چیز نہیں تھی۔

س: کیوں اچھا لگا یہ تعلق بنانا؟

ج: ہماری گپ شپ ہوئی۔ اسلام اور زندگی کے بارے میں ہمارا نکتہ نظر کافی ملتا جلتا تھا۔ اس طرح ہم ملنے لگے۔

س: عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں کی اقدار میچ ہو جاتی ہیں ان کی پارٹنرشپ ہو جاتی ہے؟

ج: بالکل درست۔

س: پہلی ملاقات میں ان کی کیا خوبی آپ کو بھائی؟

ج: دیانتداری۔ جو بات کرتی ہیں، اپنے اندر سے کرتی ہیں۔ ایمانداری اور خلوص سے کرتی ہیں۔ عام طور پر ہم مسلمان روایتی طور پر مسلمان ہوتے ہیں بعض کو ان کے والدین نے سکھایا ہوتا ہے اس پر عمل کرتے ہیں۔ میری بیگم نے سوچ سمجھ کر اور تحقیق کے بعد اسلام قبول کیا۔ حالانکہ سارے لوگ ان کے مخالف تھے اور انہوں نے یہ فیصلہ اپنی مرضی سے کیا۔ میری بیگم چونکہ وکیل ہیں، اس لیے انھوں نے پورے اسلامی قانون کو پڑھا اور محسوس کیا کہ اسلام میں عورتوں کے لیے سب سے زیادہ آزادی

ذکی فارم پر حیرتوں کا سامنا

کھیتوں کے بیچ میں بنا ہوا فش فارم نہ صرف صاف ستھرا تھا بلکہ اُس کے چاروں طرف پودے بھی لگے ہوئے تھے اور فارم کے کنارے چھلیوں کے لیے زیادہ آکسیجن کی فراہمی کے لیے ''سولر پینل'' نصب تھا، جس کی مدد سے بننے والی بجلی کی مدد سے پانی کے اندر اضافی آکسیجن جا رہی تھی۔ غیر موسمی سبزیوں کے لیے صاف ستھری کیاریاں اور اُن کے اوپر نفاست سے لگی ہوئی پلاسٹک شیٹیں پودوں کو سردی سے بچانے اور زیادہ پیداوار دینے کے لیے مدد فراہم کر رہی تھیں۔ ملازمین کو اپنے کھانے پکانے کے لیے بائیو گیس اور گیس سے چلنے والے چولہوں کی سہولت بھی تھی۔

اور تحفظ موجود ہے۔

س: انہیں اتنے سالوں میں ظفر خان کی کون سی بات اچھی لگی؟

ج: یہ تو آپ اُن سے ہی پوچھ لیجیے۔

س: اتنے سالوں کے تعلق کی خوبصورتی اور مضبوطی کی وجہ کیا تھی؟

ج: باہمی احترام۔ انہیں یہ بات بھی محسوس ہوتی ہے کہ میں بہت زیادہ فعال اور کام کرنے والا شخص ہوں اور دوسروں کا خیال رکھنے والا بھی ہوں۔

بچے ہم دونوں کے ساتھ مانوس ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ ہمارے بچے ایک اسلامی ملک میں رہیں۔ میری بیگم یورپ سے ہیں لیکن وہ حجاب پہنتی اور بچوں کو بھی اسلامی ماحول میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ آپ توقع نہیں کر سکتے کہ میری بیگم اس وقت کہاں ہوں گی۔ وہ اس وقت واپڈا کے دفتر میں ہیں اور بلز کے بعض معاملات دیکھ رہی ہیں۔

ہمارا ایک اصول ہے کہ ہم رشوت نہیں دیتے۔ ہمارے فارم ہاؤس کا بجلی کا بل بہت زیادہ آ گیا تو ہم نے رشوت دینے کے بجائے حکومتی دستاویزات کی بنیاد پر قانونی نکات کے ذریعے واپڈا حکام سے اپنا حق وصول کیا اور زائد رقم واپس لی۔ یہ سب کام میری بیگم ہی نے کیا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تمام قوانین موجود ہیں۔ لیکن عام آدمی ان کا مطالعہ نہیں کرتا۔ اس لیے لوگ اپنے حقوق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ہماری پالیسی یہ تھی کہ نہ تو ہم نے رشوت دینی ہے نا ہی ہم نے فون کروانا ہے اور پاکستان میں کام انہی ۲/ ذریعوں سے ہوتے ہیں۔ اس دوران ہم پر دباؤ ڈالنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن ہم نے حوصلہ برقرار رکھا۔ اس طرح برکی کے گاؤں والے بھی جب اس صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں تو میری بیگم کے پاس آتے ہیں اور وہ ان کا مسئلہ حل کرا دیتی ہے۔

س: آپ کے یہ دونوں کاروبار یکسر مختلف ہیں۔ آپ ان دونوں میں کس طرح توازن قائم کرتے ہیں؟ کیسے کامیابی سے چلاتے ہیں؟

”مجھے اپنے کمپیوٹر پر صبح، دوپہر، شام ہر گائے کے دودھ کی مقدار کا علم ہو جاتا ہے“

ج: اصل میں اچھی ٹیم پر یقین رکھتا ہوں کہ آپ کے مینیجر بہترین لوگ ہونا چاہیں۔ آپ ان پر اعتماد کریں ان کی نگرانی کریں۔ ان کے کام میں مداخلت نہ کریں۔ ان میں آہستہ آہستہ اعتماد پیدا ہوتا جائے گا۔ انہیں بہت اچھی تنخواہ دیں۔ ان کا اتنا اچھا خیال رکھیں۔ انہیں اس قدر بونس دیں پھر وہ اپنی تنخواہ سے کہیں زیادہ کارکردگی دکھائیں گے۔ اگر آپ ان کے کام میں مداخلت کریں گے تو ان کے کام میں اعتماد پیدا نہیں ہوگا۔ میں ایک دو ہفتے کے لیے امریکا چلا جاتا ہوں لیکن ٹیم مینیجمنٹ کے ذریعے تمام کام بخوبی چلتا رہتا ہے۔ ہم نے اپنے فارم میں ہر گائے کی دودھ کی پیداوار کا سافٹ ویئر بنایا ہوا ہے جس کے ذریعے صبح، دوپہر، شام ہر گائے کی دودھ کی پیداوار کے بارے میں مجھے معلوم ہوتا رہتا ہے۔ ہر گائے کو ایک خاص نمبر دیا گیا ہے اور صبح، دوپہر، شام ہر ایک گائے کی ایک وقت کی پیداوار معلوم ہو جاتی ہے۔

س: آپ نے اپنے ٹاپ مینیجرز کو کہاں سے ڈھونڈا؟

ج: میں نے انہیں شروع میں بطور کنسلٹنٹ رکھا، ان کی کارکردگی کا جائزہ لیا یہ لوگ محنتی تھے انہیں اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔

س: فارم کا کاروبار کس طرح شروع کیا؟

ج: میں نے پہلے چھوٹے پیمانے پر کام شروع کیا اور مقامی جانوروں کو استعمال کیا۔ اس کے بعد ہم نے آسٹریلیا سے گائیں منگوائیں۔ ہم نے اپنے فارم پر گائیوں کو مناسب

صاف ستھرے اور علحدہ علحدہ شیڈ

۶۰/ سے زائد آسٹریلین گائیوں کا شیڈ نہ صرف صاف ستھرا تھا بلکہ تازہ ہوا کے لیے اُس میں بڑے بڑے پنکھے لگے تھے، جو گرمیوں میں شاور کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ صاف ستھرا چارہ ٹانکر پر دھرا تھا، جس تک گائے کا صرف منہ پہنچتا تھا، پاؤں نہیں۔ آرام کرنے کی جگہ ریت اور مٹی بچھی تھی اور یہ کھانے کی جگہ سے کچھ دُور تھی۔ اُصول یہ ہے کہ گائے کو آرام کا جس قدر زیادہ وقت ملے گا اسی قدر دودھ زیادہ دے گا۔

ہر گائے کے کان میں ایک ٹیگ (Tag) پرویا ہوا تھا، جس پر اُس کا وہ نمبر درج تھا، جس سے اُس کا کمپیوٹر میں اندراج ہوتا ہے۔ دودھ دینے والی گائیوں کے ۲/ بڑے شیڈ تھے جبکہ اُن سے کافی دُور چھوٹے بچھڑوں، اُن سے بڑی ہوتی بچھڑیوں اور گائے بننے کی منتظر بچھڑیوں کے شیڈ الگ الگ تھے۔ بالکل نوزائیدہ بچوں کے لیے لوہے کے محفوظ ڈبے تھے تاکہ اُن سے تھوڑے بڑے بچھڑے اُن کو تنگ نہ کریں۔ ان میں سے اکثر بچوں کا باپ ایک دیوہیکل آسٹریلین بیل تھا، جس کی مالیت ۱۰/ لاکھ سے زیادہ کی تھی۔ فارم کے مینیجر جو ایک ویٹرنری ڈاکٹر ہیں نے بتایا کہ ایسے مخصوص بیلوں کی قیمت ایک کروڑ تک جا پہنچتی ہے۔ فارم پر ہر گائے ۲/ بار مصنوعی نسل کشی (ٹیکے کی مدد سے) کے عمل سے گزرتی ہے جس میں ۹۹/ فیصد تک مادہ بچے پیدا ہوتے ہیں۔

اصل مہیا کرنے کے لیے بہت بڑے بڑے پنکھے لگائے ہوئے ہیں۔ جن کے باعث انھیں گرمی محسوس نہیں ہوتی۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اعلیٰ معیاری کام کریں۔ ہم شیڈ کی دیواروں میں تین دفعہ صفائی کرتے ہیں۔ ہماری قدر یہ ہے کہ کوئی چیز ضائع نہ ہو۔ گوبر نہایت اہم Asset ہے۔ اسے ہم کسی طرح ضائع نہیں کرتے۔ اس سے ہم بائیوگیس بناتے ہیں جو کھانے کے کام آتی ہے۔ بقایا فصلوں کے لیے کھاد کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ۵۶/ ایکڑ میں سے ۳۰/ سے ۴۰/ ایکڑ پر گائے فارم اور بقایا رقبے پر سبزیاں لگائی ہوئی ہیں۔ ہمارے پاس ۶۰ بھیڑیں بھی ہیں جنھیں کیلے کہا جاتا ہے۔ ہمارا اصول یہ ہے کہ ہم جو چیزیں پیدا کریں اپنے، گاؤں والے اور اردگرد رہنے والوں کے استعمال کے لیے ہوں۔ Community Supported Agriculture پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم نے ڈیفنس میں ایک سٹور بھی بنایا ہے جہاں دودھ فروخت ہوتا ہے۔ سبزی کا ایک پیکٹ ۳/ کلو کا ۱۰۰/ روپے میں دیتے ہیں۔ ہمارا مقصد زیادہ منافع نہیں

بلکہ صارفین کو معیاری مصنوعات فراہم کرنا ہے۔ میں نے اپنے دونوں کاموں کے لیے ایک ٹیم رکھی ہوئی ہے جس کی نگرانی میں خود کرتا ہوں۔

س: جب صوفی زار کا کاروبار شروع کیا آپ نے دفتر کہاں بنایا؟

ج: سب سے پہلا دفتر اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بنایا۔ جب کاروبار بڑا ہوا تو اوپر کی منزل لے لی۔ پھر ایک اور گھر کرائے پر لے لیا۔ اب ہم مزید جگہ کی تلاش میں ہیں۔ مجھے ڈرائیونگ سے بہت الرجی ہے اس لیے میں نے کوشش کی کہ دفتر نزدیک ہو۔

س: صوفی زار کا اصل بزنس کیا ہے؟

ج: ہماری ویب سائٹ پر Seller اپنی چیزیں بیچتے ہیں۔ ہم اپنی کمیشن رکھ لیتے اور Seller کو رقم ادا کر دیتے ہیں اور پھر Seller خریدار کو سامان بھجوا دیتا ہے۔ دراصل زکی فارم اور صوفی زار کا کوئی مقابلہ نہیں۔ دراصل زکی فارم کا کاروبار خدمتِ خلق کے طور پر کر رہے ہیں۔ وہاں سے ہم جتنا ایک ماہ میں کماتے ہیں یہاں سے ہم ایک دن میں کما لیتے ہیں۔ جب ہم نے زکی فارم کا کاروبار شروع کیا تھا تو ہمارا خیال تھا کہ ہمارے بچوں کو خالص غذا ملے گی۔

مزید براں میرے خیال میں پاکستان کا مستقبل ہمارے لوگ Human Capital ہے۔ ماشاء اللہ ہمارے لوگ اتنے ہی ذہین ہیں جتنے امریکی۔ اسے ہم Flat World Concept کہتے ہیں کہ ہم پاکستان میں بیٹھ کر وہی کام کر سکتے ہیں جو ہم امریکا میں کر سکتے ہیں۔ ہم امریکیوں کے برابر کما سکتے ہیں اور اپنی مصنوعات دوست ہمسایوں کو فروخت کر سکتے ہیں۔ یہ خیال مجھے اس لیے آیا کہ ہم نے ایک Fraud Detection Software بنایا۔ جس کے ذریعے اصلی اور جعلی خریدار اور Seller کی نشاندہی ہو سکتی تھی۔ Online Selling کے ذریعے ہم تین ارب روپے سالانہ کما لیتے ہیں۔

س: آپ آل ورلڈ نیٹ ورک کی نظر میں کب آئے؟

”ہم سالانہ تین ارب روپے کما لیتے ہیں“

ج: ہم ۲۰۱۱ء میں پاکستان کی تیزی سے ترقی کرنے والی ۲۵ انٹرپرینیوئرز میں شامل ہوئے۔ ہم MIT کا بزنس ایکسلریشن کا اعزاز بھی نومبر ۲۰۰۷ء میں جیت چکے ہیں۔

س: پاکستان آنے کا فیصلہ، اصل محرک کیا تھا؟

ج: میرے والدین امریکا میں ہیں۔ میرا تمام خاندان امریکا میں ہے مجھے یہ شوق تھا کہ ہم اسلامی ملک میں رہیں۔ مجھ سے زیادہ میری بیوی کو زیادہ شوق تھا کہ ہم یورپ میں کیوں رہیں بلکہ اسلامی زندگی گزارنے کے لیے کسی اسلامی ملک میں رہیں۔ میری بیگم کسی بھی اسلامی ملک جانے کو تیار تھیں۔ مگر میں نے کہا کہ پاکستان چلتے ہیں۔ میرے والدین بھی ملنے آتے ہیں۔ میرے والد چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ کیونکہ وہ اعداد و شمار کے آدمی ہیں۔ میری والدہ بھی حیات ہیں۔ میری بہن شاعرہ ہیں جن کا کلام چھپ چکا ہے۔ میرے بھائی سافٹ ویئر کا کام کرتے ہیں۔

س: اپنی اور اپنے کاروبار کی ترقی کا راز بتا سکیں گے؟

ج: میرا اس بات پر یقین ہے کہ دیانتداری اور اقدار (Ethics) کے بغیر کاروبار ممکن ہی نہیں۔ میرے کاروبار کی ترقی کا راز اخلاقی اقدار ہیں۔ میرا اصول ہے کہ نہ میں خود غلط کام کروں اور نہ دوسروں کو غلط کام کرنے دوں۔ ایک وقت آیا کہ ہمارا منافع بہت کم ہو گیا اور میں نے امریکا جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن پھر یہ سوچا کہ میرے پاس لوگ بہت اچھی نوکریاں چھوڑ کر آئے ہیں۔ اگر میں چلا گیا تو وہ

کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ میں نے اخلاقی رویہ اپنایا ہے۔ یعنی اپنے فائدے کے ساتھ ساتھ دوسروں کا فائدہ بھی۔

ہم نے اپنا یہ اصول بنایا کہ رشوت دے کر کام نہیں کرنا۔ ہم نے اتنی رقم کا پٹرول خرچ کر دیا جتنی رقم ہم رشوت کے لیے دے سکتے تھے۔ مگر کام غلط نہیں کیا۔ کیونکہ لوگوں کو مثال ملنی چاہیے کہ پاکستان میں صحیح طریقے پر بھی کام ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے پوری توجہ اور دیانتداری کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی گاؤں کے لوگ ہم سے خوش ہیں۔

س: بچے کہاں پڑھ رہے ہیں؟

ج: بیٹا ایچی سن میں اور بیٹی کڈز کیمپس میں ہے۔ میں بھی ایچی سن سے تعلیم حاصل کر چکا ہوں۔ پھر امریکہ اور کیلیفورنیا سے۔ میرے والدین پشاور میں تھے اور میں نے ایلیوں کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور آنے کی خواہش کی۔ مجھے شروع ہی سے Out of the box دیکھنے کی عادت تھی۔

س: آپ کے دوستوں کا حلقہ کیا ہے؟

ج: میرے دوست بھی سافٹ ویئر کمپنیوں کے مالک owners ہیں۔

س: کبھی کس وجہ سے اپنے Believes پر ڈگمگائے؟

ج: پولیس اور واپڈا کی وجہ سے بہت مشکلات پیش آئیں۔ لیکن جب آپ ایک مرتبہ اپنی Dedication اور دیانتداری کے ساتھ معاملات حل کر لیتے ہیں تو پھر ذرا جھجک ختم ہو جاتی ہے اور آپ کے کام بھی درست طور پر ہونے لگتے ہیں۔ شروع میں ہر شخص یہی کہتا ہے کہ آپ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ پھر مثالیں دیتے ہیں کہ جس کام کو چیف منسٹر بھی نہیں کروا سکا وہ آپ نے کروا لیا۔ دراصل میری بیوی میری طاقت ہے۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ اس بات پر قائل ہے کہ غلط کام نہیں کرنا بلکہ صحیح کام کرنا ہے۔ میں جب کبھی ڈگمگاتا ہوں تو میری بیوی مجھے حوصلہ دیتی ہے۔

پاکستان کے لوگ مغربی کلچر اپنا رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ رشیا کے لوگ یہ کلچر اپنا کر کس قدر نقصان اٹھا چکے ہیں

یوکرائن (سابق روس) سے تعلق رکھنے والی اہلیہ رخسانہ خان کی باتیں

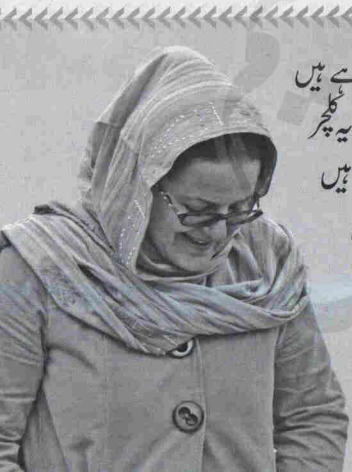

میرا تعلق یوکرائن سے ہے۔ یوکرائن وسطی اور مشرقی یورپ میں واقع ہے۔ میں اس وقت پیدا ہوئی جب یہ سابق سوویت یونین کا حصہ تھا۔ ۱۹۹۱ء میں آزاد ہوا۔ میں نے ۱۹۹۰ء میں میٹرک کیا۔ پوسٹ گریجویشن بین الاقوامی تعلقات ۱۹۹۹ء میں حاصل کی۔ یوکرائن میں انشورنس اور

س: آپ کی بیگم اسلامی ملک کا تصور لے کر آئی تھیں تو یہاں آ کر انہوں نے کیسا محسوس کیا؟

ج: وہ بہت خوش ہیں۔ انھوں نے اپنی دنیا تخلیق کر لی ہے۔ پاکستان میں ہونے والے خودکش دھماکوں کی وجہ سے ہم بہت پریشان تھے کہ ہمارے بچے کسی بھی وقت حادثے کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں امریکا واپس چلے جانا چاہیے۔ لیکن اب حالات اچھے ہیں اور اب ہم اپنی خوشی سے یہاں رہ رہے ہیں۔ میں دوبارہ کہتا ہوں کہ میری بیوی ہی میری طاقت ہے۔

س: ۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ ہمارے نوجوانوں خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوانوں کا Believe System بہت کمزور ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: اسے Generalize نہیں کیا جا سکتا۔ جب ہم انٹرویو اور ٹیسٹ لیتے ہیں تو ہر قسم کے سوالات پوچھتے اور مجموعی نتیجہ اخذ کرتے ہیں تو ان سوالات کے ذریعے یہ

میری بیوی کو بہت شوق تھا زندگی کسی اسلامی ملک میں بسر کرنے کا

معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی اقدار کیا ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہمارے ملازمین ہمارے پاس پانچ دس سال رہیں اور ہم ان سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔ ہم وہ ملازم رکھتے ہیں جو سیکھنے میں ہوشیار اور مستعد ہوں اور مستقبل میں کمپنی کا اثاثہ بن سکیں۔ کیونکہ ان کی گروتھ ہی ہماری گروتھ ہے۔

س: یہ خیال آپ کو کیسے آیا؟ کاروباری لوگ تو عام ٹرانسپورٹ سمیت کئی کمپنیوں میں کام کیا۔ اس کے بعد اقوام متحدہ میں اپنے ملک کی ٹرانسپورٹ انڈسٹری کے نمائندے کی حیثیت سے بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ ظفر خان سے ملاقات سوئٹزرلینڈ میں ہوئی۔ ہماری شادی ارینجڈ میرج تھی۔

جب میں پیدا ہوئی تو میرا ملک سیکولر ملک تھا لیکن مذہبی لوگوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ میرے دادا مذہبی آدمی تھے۔ مذہب کی ابتدائی باتیں گھر سے سیکھنے کا موقع ملا۔ پھر میری دلچسپی مذہب کی تاریخ اور فلاسفی میں بھی بڑھنے لگی۔ میں نے یونیورسٹی کے زمانے میں سچائی کی تلاش کا سفر شروع کیا۔ صوفی ازم میں بھی دلچسپی رہی۔ مشرق کے مختلف فکری نظاموں کا بھی مطالعہ کیا۔ ہمارے ہاں اسلامک کلچرل سنٹر بھی تھا۔ میں وہاں باقاعدگی سے جانے لگی۔ یہاں لائبریری میں بھی وقت گزارتی رہی۔ سنٹر میں اُردن، کویت، سعودی عرب، مصر اور مختلف ملکوں سے لوگ آتے تھے۔ ان سے بھی بات چیت جاری رہی۔ اس طرح آہستہ آہستہ میں اسلام کی طرف مائل ہوگئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اسلام پہلے سے موجود مذاہب کی قدرتی Continuation ہے۔

میرا تعلق زرعی گھرانے سے تھا۔ میں ان چیزوں سے ابتدا سے ہی واقف تھی۔ ظفر کی بھی جانوروں میں دلچسپی تھی۔ فارم ہاؤس شروع کرتے وقت ہمارے ذہن میں دو چیزیں تھیں، ہم یہ چاہتے تھے کہ ہمارے گھر میں جو غذا آئے وہ معیاری ہو۔ دوسری، ظفر آئی ٹی کے علاوہ کسی ایسے سیکٹر میں بھی کام کرنا چاہتے تھے جو یہاں نظرانداز ہو رہا تھا۔ ہم نے ایک نئے قسم کی فارمنگ شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم چاہتے تھے کہ پڑھے لکھے لوگ فارمنگ کے شعبے میں آئیں اور دوسرے لوگوں کے لیے مثال بنیں۔

میں نے ایک چیز نوٹ کی ہے کہ جو چیزیں ہم کھاتے ہیں وہ کیسے اُگائی جاتی ہیں۔ یا جو چیز ہم کھا رہے ہوں اس کا معیار کیا ہے۔ ہم ان باتوں پر بالکل توجہ نہیں دے رہے۔ اس معاملے میں ہم ان پڑھ لوگوں کے رحم و کرم پہ ہوتے ہیں۔ ہمارے فارم پر اب طالب علم بھی آتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ان کو بتایا جائے کہ کوئی پیشہ حقیر نہیں۔ ہاتھ سے کام کرنے والوں کو بھی عزت دینی چاہیے۔

میں دین کو زندگی سے علیحدہ نہیں سمجھتی۔ میں چاہتی ہوں کہ طالب علموں کو بتایا جائے کہ صفائی کا خیال رکھا جائے اور وہ کوئی ہنر (Skill) سیکھ کر باعزت زندگی گزاریں۔ دین، نماز، روزہ اور صدقہ خیرات کے علاوہ ایک طرزِ زندگی کا بھی نام ہے۔

پاکستان میں تعلیمی نظام میں سماجی کام (Community Work) کا کوئی تصور نہیں۔ تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ طالب علم اپنے فائدے کے علاوہ اپنی کمیونٹی کے بارے میں بھی سوچیں اور سماجی بھلائی کے چھوٹے چھوٹے کاموں پر بھی توجہ دیں۔ ہمارے بچوں کو چاول اور فارم اچھے لگتے ہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ گالف اور کرانے بھی کھیلتے ہیں۔ بچے اچھے اداروں میں پڑھ رہے ہیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ وہ اپنے ہاتھوں سے زراعت کے چھوٹے چھوٹے کام خود کر سکیں۔ مستقبل میں اپنی زندگی کے بارے میں خود فیصلہ کریں۔

یوکرائن میں بھی فیملی سسٹم مضبوط ہے۔ میری والدہ ہر سال ہمیں ملنے پاکستان آتی رہتی ہیں۔ ہم بھی ہر سال یوکرائن جاتے ہیں۔ میری والدہ کو جو چیز اُداس کرتی ہے وہ یہاں کی غربت ہے۔ یوکرائن جب سوویت نظام کا حصہ تھا تو اس کی یہ بات اچھی تھی کہ حکومت تعلیم، رہائش اور لوگوں کی دیگر بنیادی ضرورتوں کا خیال رکھتی تھی۔

یوکرائن کی زبان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پنجابی زبان سے قربت رکھتی ہے۔ لوگ اس حوالے سے تحقیق بھی کر رہے ہیں۔ پنجاب کا لفظ ہمارے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں Pyatirichcha کا لفظ بولا جاتا ہے جس کا مطلب ہے ۵ دریاؤں کی سرزمین۔

پاکستان میں لوگ مغربی کلچر کو اپنا رہے ہیں لیکن سوویت یونین کے لوگوں نے بھی مغربی کلچر کی نقالی کی اور اپنے لیے صرف اپنے لیے سوچتے ہیں۔

ج: میں اپنے لیے بھی سوچتا ہوں اور ان کے لیے بھی سوچتا ہوں۔ اگر ان کا فائدہ نہیں سوچوں گا تو جسے ہم نے تربیت دی ہے وہ ہمیں چھوڑ کر چلا جائے گا۔ ہمیں اس کا سوچنا چاہیے کہ اگر ہمارا فائدہ ہو رہا ہے تو ہم اس شخص کا بھی ہونا چاہیے۔ ہم بھی لانگ ٹرم سوچتے ہیں جس طرح اُردو ڈائجسٹ کی عمر ۵۲ سال ہے اور اس کے لیے بھی لانگ ٹرم منصوبہ بندی کی گئی ہوگی۔ ہمارا مؤقف یہ ہے کہ بیسٹ فرینڈز لوگ ہمارے لیے اچھی خدمات فراہم کریں گے۔

س: ۔ جب کمپنی گروتھ میں ہوتی ہے تو توجہ آمدن پر ہوتی ہے۔ اس دوران آپ نے اپنی اقدار اور وژن کو اسٹیبلش کیا۔ یہ ارادی تھا یا اتفاقیہ؟

ج: یہ سب ارادی تھا۔ میں نے Jim Colins کی کتاب Built to Last پڑھی جس میں مختلف کمپنیوں کا تقابل کیا گیا تھا۔ اس میں بتایا گیا کہ جن کمپنیوں نے اپنے لیے Clear Core Values مقرر کیں اور ان پر عمل بھی کیا وہ کامیاب رہیں۔ اس طرح ہم نے بھی اپنے لیے بنیادی اقدار مقرر کیں اور انہیں اپنے ہاں رائج کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر بطور اسی او میں ان اقدار پر عمل نہیں کروں گا تو دوسرے بھی نہیں کریں گے۔

س: آنے والے سالوں کے لیے کیا منصوبے ہیں؟ آپ کون سا نیا کاروبار شروع کرنے والے ہیں؟

ج: ۔ موبائل گیمز۔ میرے اس کاروبار کی بنیاد Flat World Business ہے۔ یعنی میں اپنے آدمیوں کے ذریعے پاکستان میں بھی وہی کچھ کما سکتا ہوں جو امریکا میں۔

س: ملازمین کے لیے ریوارڈ سسٹم پر یقین رکھتے ہیں؟

ج: میں ریوارڈ سسٹم پر بہت زیادہ یقین رکھتا ہوں۔ آپ کا فائدہ بھی ہوتا ہے جب آپ کے ملازمین کا فائدہ ہوتا ہے۔ یہ نہایت عملی بات ہے۔ ہمارے ہاں جب کوئی

ملازم نئی کامیابی حاصل کرتا ہے تو اسے بونس دیا جاتا ہے اور یہ چیز سکرین پر دکھائی جارہی ہوتی ہے۔ پھر سب ملازمین دیکھتے ہیں کہ کس کی کارکردگی اچھی ہے اور کس کی کم۔ زیادہ کارکردگی والا ملازم خوش ہوتا ہے اور کم کارکردگی والا شرمندہ ہوتا ہے اور زیادہ اچھی کارکردگی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان میں سیٹھو ذہنیت ہوتی ہے سوچتا ہے کہ کوئی یہ نہ دیکھ سکے کہ مالک کتنے پیسے کما رہا ہے۔ ہمارے ہاں ایسا نہیں۔ سب کو سکرین سے پتا چل جاتا ہے کہ کمپنی کو کتنی آمدنی ہو رہی ہے۔ پھر نئی کامیابی حاصل کرنے پر ملازم کو ۵۰ فیصد بونس ملتا ہے۔ ملازمین کا احترام ہماری بنیادی اقدار کے عین مطابق ہے۔ اگر ہم ملازمین کی عزت کریں گے تو وہ بھی ہمارے لیے اچھا کام کریں گے۔

ہمارے فارم پر جب بھی دودھ کی پیداوار میں ۱۰۰ لیٹر کا اضافہ ہوتا ہے تو پھر ملازمین کو بونس دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملازمین وقت پر کام کرتے ہیں

"سارے لوگ مخالف تھے، میری بیوی نے سوچ سمجھ کر اسلام قبول کیا"

اور بغیر نگرانی کے کام کرتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی اور خوشی سے ہر کام وقت پر انجام دیتے ہیں۔ اس طرح ریوارڈسسٹم سے کام چور ملازم بھی نہایت محنت سے کام کرتے ہیں کہ پیداوار زیادہ ہو اور انھیں انعام ملے۔

میں اپنے ملازمین سے خوش اخلاقی سے پیش آتا ہوں اور وہ بھی میرے وفادار ہوتے ہیں۔

ہمارے فارم پر کل ۲۰ ملازمین ہیں۔ باغبان بھی

نقصان اٹھایا۔ یہاں کی ایک تبدیلی اچھی ہے کہ اب لوگ ماحولیاتی تحفظ کے بارے میں بات کرنے لگے ہیں اور کئی اچھے منصوبے بھی شروع کیے جارہے ہیں۔ ہر ایجرالاہور کی باتیں بھی سننے میں آرہی ہیں۔ ہمارے یوکرائن کے لوگ بہت محنتی ہوتے ہیں۔ یہاں کے لوگ مظلوم بنے رہتے ہیں۔ خود کو بے بس سمجھتے ہیں۔ حکومتوں کو طاقتور سمجھتے ہیں۔ اگر وہ محنت سے اپنی تقدیر بدلنے کی کوشش کریں تو سب کچھ ممکن ہے۔ ہم قدرت کی نعمتوں کی قدر نہیں کرتے۔ وسائل کو دانشمندی سے استعمال نہیں کرتے۔ اس حوالے سے آگہی پھیلانے کی ضرورت ہے۔ جب لوگوں کو بہتر روزگار ملے گا تو وہ ماحول کے تحفظ جیسے معاملات کے بارے میں ذمے دار بنیں گے۔ پاکستان میں چیزوں کو استعمال کے بعد Recycle کرنے پر توجہ نہیں دی جاتی۔ کوڑا کرکٹ کو مناسب طریقے سے ٹھکانے نہیں لگایا جاتا۔

ایک مرتبہ واپڈا کے ساتھ مسئلہ بنا تھا تو میں نے قانونی طریقے سے ۲ لاکھ روپے ان لوگوں سے واپس لیے۔ پاکستان میں پولیس، عدالتوں اور واپڈا جیسے اداروں میں رشوت اور سفارش کا کلچر ہے۔ ان اداروں میں لوگوں کو احترام نہیں ملتا۔ لوگ اپنے حقوق سے بھی بے خبر رہتے ہیں۔ اس لیے انھیں زیادہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مجھے کئی اداروں میں جانا پڑتا ہے۔ غیر ملکی ہونے کے باعث فائدہ بھی ہوتا ہے لیکن اس بات کا دکھ ہوتا ہے کہ یہاں کے شہریوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ اب میں عنقریب Energy Efficient گھر بنانا چاہتی ہوں جو بجلی، گیس جیسی توانائی کی ضروریات کے لیے حکومتی اداروں کا محتاج نہ ہو۔ اپنے فارم پر ہم بائیوگیس سے اپنی ضروریات کے لیے بجلی پیدا کر رہے ہیں۔ یہاں کی تعمیر کے طریقوں کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے گھر اور پلازے ایسے ہیں جنھیں گرمیوں میں ٹھنڈا رکھنے کے لیے اے سی پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور سردیوں میں ہیٹر استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ اپنے طرز تعمیر کو تبدیل کرکے

ہیں۔ ڈاکٹر بھی اور دوسرا عملہ بھی ہے۔

س: گملے کو یونیفارم دیتے ہیں یا نہیں؟

ج: ہم نے یہ تجربہ کیا لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ چونکہ ملازمین کا تعلق دیہی پسماندہ ماحول سے ہے اس لیے وہ ابھی اس طرف نہیں آسکے۔ لیکن ہم انہیں ایجوکیٹ کر رہے ہیں کہ پہلے اپنے کپڑے صاف رکھیں، اپنے بدن کی صفائی رکھیں تاکہ بیماریوں سے بچ سکیں پھر آہستہ آہستہ ہم انہیں یونیفارم کی طرف لے کر آئیں گے۔

س: فارم کے لیے کیا منصوبے ہیں؟

ج: میں فارم کا کاروبار اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اور دوسرے لوگوں کو معیاری اور خالص کھانا مل سکے۔ ہم نے برکہ نامی گاؤں کے طالب علموں کو گاؤں کی صفائی پر لگایا، درخت بھی لگوائے، پھر ہم نے ۲ پرائمری سکولوں کے درمیان گندی جگہ کو صاف کروایا تاکہ بیماریاں نہ پھیلیں۔ ہمارے گاؤں کے لوگ ہم سے بہت خوش ہیں۔ ہم چاہ رہے ہیں کہ ہم یہیں اپنا گھر اور دفتر بھی بنائیں۔ اس گاؤں میں بچوں کے لیے قرآن پاک کی تعلیم کا انتظام کریں۔ بچیوں کے لیے کشیدہ کاری کا سکول کھولیں اور جوڈو کراٹے جیسی صحت مند سرگرمیاں شروع کرنے کے لیے انسٹرکٹر بھی یہاں لائیں۔

گفتگو یہاں تک پہنچی تو فیصلہ ہوا کہ پہلے فارم ہاؤس چلا جائے۔ جو کچھ کہہ رہے ہیں ذرا گلے ہاتھوں مشاہدہ بھی ہوجائے۔ ایک مشاہدہ کرنے گئے اور مشاہدات کی پوری دنیا دیکھ آئے جس میں کئی حیرتیں پوشیدہ تھیں۔

ظفرے سے ملاقات کے دوران میں یہی سوچتا رہا کہ ہمیں برنس میں جن رول ماڈلز کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ہمارے آس پاس ہی یہیں موجود ہوتے ہیں۔ ہم بے وجہ سات سمندر پار انہیں ڈھونڈتے اور سراہتے اپنی عمر عزیز کے کتنے ہی سال ضائع کر بیٹھتے ہیں اور وہ کامیابی بھی نہیں چکھ پاتے، جس کے خواب دیکھنے آنکھیں جلنے لگتی ہیں اور تعبیر نظر نہیں آتی۔

ہم اپنی توانائی کی ضرورتوں کو پورا کریں گے۔ ٹیوب ویل کے گرم پانی سے ہم پورے گھر کا ٹمپریچر نارمل رکھیں گے اور اس پر خرچ بھی کچھ نہیں ہوگا۔

ہم صبح جلدی اٹھنے کے عادی ہیں۔ صبح میں بچوں کو سکول چھوڑنے کے بعد فارم پر چلی جاتی ہوں۔ وہاں تین چار گھنٹے گزرتے ہیں۔

میری خواہش ہے کہ لاہور کے لوگ صبح جلدی اٹھیں، دکانیں اور کاروبار بھی صبح جلدی کھل جائیں تاکہ ہم جیسی خواتین صبح جلدی خریداری کرسکیں اور بعد میں آرام کے ساتھ بچوں کے لیے لنچ بنا سکیں۔

ہم لوگ ۷ بجے شام کا کھانا کھا لیتے اور ۸ بجے سو جاتے ہیں۔ یہ صحت بخش معمول سب کو اپنانا چاہیے۔

میں بریانی، شامی کباب جیسی ڈشیں بنا لیتی ہوں۔ ہمارے یوکرائن میں کھانوں میں مرچیں کم ہوتی ہیں۔ یہاں کے کھانوں پر مرچوں کا اثر غالب رہتا ہے۔

سب سے بڑا مسئلہ جو ہمیں درپیش ہے کہ ہر سال ویزے کی تجدید کروانی پڑتی ہے۔ ہم جیسی خواتین کو یہاں Visa پر رہنا پڑتا ہے۔ گرین کارڈ جیسی سہولت میسر نہیں۔ اگر ہمارا یہ مسئلہ حل ہوجائے تو ہر سال ہم یہاں سکون کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔ اس طرح ہمیں ویزے کے ختم ہونے کا ڈر نہیں ہوگا۔

یوکرائن میں جو پاکستانی جا کر آباد ہوتے ہیں انہیں گرین کارڈ کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔ ڈیفنس میں میری طرح یوکرائن کی کافی لڑکیاں بیاہی ہوئی ہیں۔ ہم اکثر شام کو ملتی اور باتیں کرتی ہیں۔

میری والدہ بھی اِن دِنوں پاکستانی آئی ہوئی ہیں۔ انہیں بھی یہ ملک اور یہاں کے لوگ اچھے لگتے ہیں۔

یہاں آکر میں نے واجبی اُردو کے ساتھ ساتھ خوش رہنا سیکھ لیا ہے۔ یہاں زندگی پرسکون ہے۔ یوکرائن میں گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ساتھ متحرک رہنا پڑتا ہے۔ یہاں آپ اس پابندی سے آزاد ہیں۔

وقت اور طریقۂ کار کی پابند

آسٹریلین گائیاں

ایک لڑکا مسلسل چارہ ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ جونہی ۳ر بجے ایک بٹن دبانے سے شیڈ کا ہائیڈرالک دروازہ اپنے آپ کھلا اور تمام گائیاں سکون سے چلتی ہوئی کچھ دور اس جگہ پر ترتیب سے کھڑی ہوگئیں جہاں ان کا دودھ دھویا جاتا تھا۔ یہ ایک ناقابلِ تصور اور ناقابلِ یقین منظر تھا اگر آنکھوں سے خود نہ دیکھا ہوتا، تو کبھی یقین نہیں آتا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے ان کے تھنوں پر مشینی ہاتھ چڑھا دیے جنھوں نے فوری طور پر دودھ نکالنا شروع کردیا۔ اس مشین کے اندر یہ نظام موجود ہے کہ ایک مرتبہ دودھ نکلتا اور ایک مرتبہ تھن کو سہلایا جاتا ہے۔ جس سے گائے کو بہت سکون اور تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ ہر گائے کی ۳،۳ر منٹ میں ملکنگ مکمل ہوگئی۔ ہر گائے کے ساتھ ایک چھوٹی سکرین والا مونیٹر لگا ہوا تھا جس پر دودھ کی مقدار اور وقت آرہا تھا۔ یہی اعداد و شمار ظفر کے لیپ ٹاپ پر بھی جارہے تھے۔ یہ ایک حیران کن منظر تھا، نہ کسی کا تھن کو ہاتھ لگا، نہ کسی نے دودھ کو چھوا۔ یہ اَن چھوا دودھ اپنے آپ پائپوں سے چلر تک پہنچ گیا۔ جونہی ملکنگ مکمل ہوئی دودھ دھونے والا آلہ اپنے آپ ایک خلا میں گر گیا۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر تمام تھنوں کو ایک دوا لگائی اور بتایا کہ دودھ میں سب سے جلدی بیکٹیریا پیدا ہوتا ہے اور خدا کی قدرت یہ ہے کہ دودھ دینے کے بعد بھی گائے کا تھن آدھے گھنٹے تک کھلا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے اُس میں بیکٹیریا پیدا ہونے کا خطرہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ یہ دوائی فوری طور پر تھن کا منہ بند کردیتی ہے جس سے ان کے نپل میں انفیکشن یا بیکٹیریا پیدا ہونے کا امکان ختم ہوجاتا ہے۔ دودھ دوہنے کے کچھ دیر بعد سارے پائپ پریشر اور پانی سے اپنے آپ دھل جاتے ہیں تاکہ اگلے وقت تک پائپوں میں پُرانے دودھ کا موجود کوئی قطرہ دودھ کی کوالٹی خراب کرنے کا باعث نہ بن سکے۔

ملاقات: اختر عباس　　شریک گفتگو: طیب اعجاز قریشی، عاطف مرزا　　تصاویر: محمد عرشیان طیب

مدینہ

منورہ میں ایک نابینا عورت رہتی تھی جس کے گھریلو کام کاج کرنے حضرت عمرؓ آتے تھے۔ چند روز بعد انھیں معلوم ہوا کہ ان سے پہلے کوئی اور شخص آکر عورت کے تمام کام کر جاتا ہے۔ انھیں یہ معلوم کرنے کا اشتیاق ہوا کہ یہ شخص کون ہے؟ ایک شب وہ چھپ کر بیٹھ رہے۔ یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ شخص حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے جو خلیفہ ہونے کے باوجود چھپ کر نابینا عورت کے گھر آتے اور اس کے گھریلو کام کر جاتے تھے۔

ابتدائے اسلام میں سب سے زیادہ شفقت و رحمت والے سیدنا ابوبکر صدیقؓ ہی تھے۔ آپؓ ایک دیانت دار تاجر اور کپڑوں کا کاروبار کرتے تھے، اس لیے جلد ہی مال دار بن گئے۔ آپؓ شروع سے حلیم الطبع، نرم دل، غریبوں اور مسکینوں کا خیال کرنے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے تھے۔ جب اسلام لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم نقد تھے جو سارے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیے۔

غلاموں کی آزادی

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مکہ مکرمہ میں ان غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جن پر کفار بے حد ظلم اور جبر کیا کرتے تھے تاکہ وہ دوبارہ کافر ہو جائیں۔ ان غلاموں میں حضرت بلالؓ بن رباح، عامرؓ بن فہیرہ، ابوفکیہہؓ، حضرت لبینہؓ، حضرت زنیرہؓ، حضرت نہدیہؓ اور ام عبیس رضوان اللہ علیہم شامل ہیں۔ سیرت نگار لکھتے ہیں کہ یہ نام ایسے غلاموں کے ہیں جو مشہور تھے، ان کے علاوہ بھی انھوں نے بے شمار غلام آزاد کیے۔

ابن دُغنہ کی گواہی

آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو حبش کی طرف ہجرت کا حکم دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ آنحضرت ﷺ کی جدائی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ چونکہ یہ ہجرت مصائب و شدائد سے بچنے کے لیے نہیں بلکہ آزادی کے ساتھ عبادت الٰہی کرنے اور دعوت و تبلیغ کی غرض سے تھی، اس بنا پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی حبشہ کی جانب ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ لیکن ابھی برک الغماد جو مکہ سے یمن کی جانب ۵/دن کی مسافت پر ہے، پہنچے تھے کہ قبیلہ قارہ کے سردار، ابن دغنہ سے ملاقات ہوئی۔ ابن دغنہ نے پوچھا ''ابوبکر کہاں کا ارادہ ہے؟''

حضرت صدیقؓ نے کہا ''میری قوم نے مجھے مکے سے نکال دیا ہے، اس لیے چاہتا ہوں کہ سیاحت کروں اور اپنے رب کی آزادی سے عبادت کروں۔''

ابن دُغنہ بولا ''تم جیسے شخص کو کیسے شہر بدر کیا جا سکتا ہے اور نہ تمھیں وہاں سے نکلنا چاہیے۔ تم غریبوں کو مالی امداد دینے اور صلہ رحمی کرتے ہو۔ اپاہجوں کا سہارا ہو اور حق کی راہ میں آنے والے حوادث کا مقابلہ کرتے ہو۔ چلو میں تمھیں اپنی پناہ میں لیے واپس مکے کے لیے چلتا ہوں۔ وہاں تم اپنے رب کی آزادی سے عبادت کرنا۔''

چنانچہ ابن دُغنہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنے ساتھ مکے لے آیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اوصاف کا حوالہ دے کر قریش سے کہا ''غضب خدا کا تم ایسے شخص کو شہر میں رہنے نہیں دیتے۔''

قریش نے کہا کہ اگر وہ چھپ کر عبادت کریں تو وہ ان سے تعرض نہیں کریں گے۔ سو حضرت ابوبکر صدیقؓ کچھ دن تک تو پوشیدہ عبادت کرتے رہے لیکن آخر ان سے رہا نہ گیا اور گھر کے صحن میں مسجد بنالی۔ آپ نماز پڑھتے اور قرآن مجید کی بلند آواز میں تلاوت کرتے، تو قریش کی عورتیں، نوجوان اور چوراہے اردگرد جمع ہو جاتے اور اثر لیتے۔ قریشیوں نے ابن دُغنہ سے شکایت کی کہ ابوبکر معاہدے کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ اگر انھیں تمھاری پناہ میں رہنا ہے تو معاہدے کے مطابق عبادت اور تلاوت چھپ کر کریں۔ اگر وہ رضامند نہ ہوں تو تمھاری پناہ سے دست کش ہو جائیں۔ ابن دُغنہ نے حضرت ابوبکرؓ سے یہی بات کہی۔ آپؓ نے فرمایا:

''مجھے تمھاری پناہ کی ضرورت نہیں، اب میں اللہ کی

پناہ میں آتا ہوں۔''

غریب خاندانوں کی مالی امداد

حضرت ابوبکر صدیقؓ ایسے خاندانوں کی مدد کرتے تھے جو معاشی لحاظ سے غریب اور نادار ہوں۔ ان میں سے ایک حضرت مسطحؓ آپ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ یہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ لہٰذا ابوبکر صدیقؓ نے ان کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ حضرت عائشہؓ پر افک کی الزام تراشی ہوئی تو وہ سادگی کی وجہ سے مخالفین میں شامل ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ کو ان کا رویے سے بہت دکھ پہنچا اور ماہانہ وظیفہ بند کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

ترجمہ: تم میں سے مالدار اور کشادگی رکھنے والے لوگ قسم نہ کھائیں کہ وہ غریبوں، مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو کچھ نہیں دیں گے بلکہ ان کو چاہیے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھارے گناہ معاف کر دے۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (۲۲:۲۴)

ابوبکرؓ نے جب یہ آیت سنی تو پکار اٹھے ''ہاں میں چاہتا ہوں کہ اللہ مجھے معاف کر دے۔''

یہ کہہ کر آپ نے مسطحؓ کا وظیفہ دوبارہ جاری کر دیا۔

(تفسیر ابن کثیر)

بدر کے قیدیوں پر شفقت

ہجرت کے دوسرے سال مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان معرکۂ بدر برپا ہوا۔ اس میں مسلمانوں کو شاندار فتح ملی اور کفار بُری طرح شکست کھا گئے۔ اس میں تقریباً ۷۰ کفار قتل ہوئے اور اتنے ہی قیدی بنے۔ قیدیوں کے بارے نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے رائے طلب فرمائی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ازراہ شفقت و رحمت اپنی رائے دی ''یا رسول اللہ! یہ آپ کے رشتے دار اور عزیز و اقارب ہیں، لہٰذا انھیں فدیہ لے کر آزاد کر دیجیے۔''

اس بارے میں مختلف آراء آنے کے بعد فدیہ لے کر انھیں آزاد کر دیا گیا جو حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق تھا۔

جنگی حالات میں رحمت و شفقت

حضرت ابوبکرؓ نے جہاں زمانۂ امن اور عام حالات میں انفرادی و اجتماعی رحمت و شفقت کا مظاہرہ کیا، وہیں حالتِ جنگ میں بھی انسانی جانوں کے احترام، سلامتی اور حفاظت کی تاکید فرمائی۔ ایک لشکر روانہ کرتے وقت آپؓ نے فوجیوں کو اہم نصیحتیں کیں۔ ان میں سے چند کا تذکرہ درج ذیل ہے:

''اے لوگو! ذرا رُکو، میں تم کو ۱۰/ہدایتیں کرنا چاہتا ہوں۔ انھیں اپنے دل میں جگہ دو۔ (۱) خیانت نہ کرنا (۲) دھوکے سے مال نہ کھانا (۳) اپنے امیر کی نافرمانی نہ کرنا (۴) کسی کا مثلہ (انسانی جان کی بے حرمتی) نہ کرنا (۵) کسی بچے، بوڑھے یا عورت کو قتل نہ کرنا (۶) کھجور یا دوسرے پھل دار درخت نہ کاٹنا (۷) غذائی ضرورت کے سوا بکری، گائے یا اُونٹ ذبح نہ کرنا (۸) تمھارا گزر ایسے لوگوں پر ہوگا جو دنیا چھوڑ کر عبادت گاہوں میں گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ وہ جس اللہ کی رضا کی خاطر خلوت میں بیٹھے ہیں، اس کی خاطر انھیں ہاتھ نہ لگانا (۹) تم کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جو قسم قسم کے طعام تم کو پیش کریں گے، بار بار ایسے طعام کھا کر اللہ کو بھول نہ جانا (۱۰) تم کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جن کے سر کے بال درمیان سے کٹے ہوئے ہوں گے اور اردگرد چوٹیاں چھوڑ رکھی ہوں گی، ایسے لوگوں کو تلواروں سے ذرا دینا لیکن قتل نہ کرنا۔ اب اللہ کا نام لے کر آگے بڑھو، اللہ تعالیٰ آپ کو نیزوں اور تلواروں سے محفوظ رکھے۔'' (البدایہ والنہایہ)

یہ نصیحتیں پڑھ کر آج کے جنگی قوانین اور ان کی عملی صورت دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ دور کتنا اعلیٰ و ارفع اور سنہرا تھا۔ اس کا آج تصور کرنا بھی مشکل ہے۔

بے سہارا لوگوں کی دیکھ بھال

حضرت ابوبکر صدیقؓ اگرچہ نہایت جلیل القدر خلیفہ تھے لیکن غریبوں اور ضرورت مند لوگوں کا معمولی کام کرنے میں بھی انھیں دریغ نہ تھا۔ وہ نہایت خاموشی سے ایسے کام کرنے میں مسرت محسوس کرتے تھے۔

مسندِ خلافت پر جلوہ افروز ہونے سے پہلے آپ محلے کی بعض لڑکیوں کی بکریوں کا دودھ دوہتے تھے۔ خلیفہ ہونے کے بعد ایک بھولی بھالی لڑکی کو فکر لاحق ہوئی کہ اب ہماری بکریوں کا دودھ کون دوہے گا؟ حضرت ابوبکرؓ نے سنا تو فرمایا ''اللہ کی قسم! میں اب بھی بکریوں دوہوں گا، خلافت مجھے خدمتِ خلق سے باز نہیں رکھ سکتی۔

(ابن کثیر ص ۲۹۱۔ طبقات ابن سعد)

غُربا کا خاص خیال رکھنا

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں ''جب ابا جان کے انتقال کا وقت قریب آیا تو مجھ سے پوچھا، رسول اللہ ﷺ کو کتنے کپڑوں میں کفنایا گیا تھا؟ میں نے کہا، ۳ر کپڑوں میں۔ آپ اس وقت ۲ر پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ''تو بس میرے یہ دونوں کپڑے کافی ہیں۔ ایک تیسرا کپڑا بازار سے خرید کر مجھ کو کفن دے دینا۔''

میں نے کہا ''ابا جان! ہم تینوں کپڑے بازار سے خرید سکتے ہیں۔'' ارشاد ہو: ''بیٹی! زندہ لوگ مُردوں کی نسبت نئے کپڑوں کے زیادہ مستحق ہیں۔ کفن کے دونوں کپڑے تو لہو، پیپ اور خراب ہونے کے لیے ہیں۔''

سبحان اللہ! آخری لمحات میں بھی مسکینوں، حاجت مندوں اور غریبوں کا کتنا خیال تھا۔

صدیق اکبرؓ نے ۲۲ر جمادی الثانی ۱۳ھ بروز شنبہ (پیر) مغرب اور عشا کے درمیان وفات پائی اور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ روضۂ اطہر میں دفن ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دورِ خلافت ۲ر سال، ۲ر ماہ اور چند دن پر مشتمل رہا۔ اس عرصے میں آپ کو ملک و ملت کے گمبھیر مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر آپ انھیں خداداد بصیرت، دانش اور نبی ﷺ سے ملی ہوئی تعلیم و تربیت سے حل نہ کرتے تو اسلامی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے آپ کو خدمتِ خلق کا زیادہ موقع نہیں مل سکا۔ پھر بھی اجتماعی اور انفرادی طور پر جو کچھ کیا، اس کی ایک جھلک مذکورہ بالا واقعات میں دیکھی جا سکتی ہے۔

حضرت عمرؓ اور رفاہِ عامہ

اسلامی حکومت کی ابتدائی تاریخ میں جن صحابہ کرام نے خدمتِ خلق اور رفاہِ عامہ کے انفرادی و اجتماعی کام کی بنیادیں رکھیں، ان میں حضرت عمرؓ کا نام سرِفہرست ہے۔ آپؓ نے انفرادی طور پر خدمتِ خلق کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ سرکاری سطح پر بھی رفاہِ عامہ کے زبردست کارنامے انجام دیے۔ آپ کے انفرادی کاموں کی تفصیل کم ملتی ہے، تاہم نمونے کے طور پر کچھ واقعات درج ذیل ہیں۔

حضرت عمرؓ بن خطاب ۵۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب نبی ﷺ سے عدی بن کعب پر ملتا ہے۔ آپ نسب دانی، شہسواری، سپہ گری، پہلوانی اور تقریر کے فن میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ آپ نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ قریش کی سفارت کاری بھی کی۔

(الفاروق مولانا شبلی)

غلاموں کو اہمیت دینا

اکثر غلاموں کو بلا کر آپ ساتھ کھانا کھلایا کرتے۔ حاضرین کو سنا کر کہتے، اللہ اب لوگوں پر لعنت کرے جنھیں غلاموں کے ساتھ کھانے سے عار ہے۔ سردارانِ فوج کو لکھ بھیجا کہ تمھارا کوئی غلام کسی قوم کو امان دے تو وہ امان تمام مسلمانوں کی طرف سے بھی جائے گی اور فوج کو اس کا پابند ہونا ہوگا۔

(الفاروق مولانا شبلی)

غلامی کا رواج کم کرنا

حضرت عمرؓ نے اگرچہ غلامی کو معدوم (بالکل ختم) نہیں کیا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے مختلف طریقوں سے یہ رواج کم کر دیا۔ جس قدر قائم رکھا، وہ بھی اس خوبی سے کہ وہ غلامی نہیں بلکہ برابری اور ہمسری رہ گئی۔ عرب میں تو انھوں نے سرے سے اس کا استیصال کر دیا۔ چنانچہ حکومت سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو عربی قبائل مرتد ہونے کے بعد لونڈی اور غلام بنائے گئے تھے، سب آزاد کر دیے۔ ساتھ یہ اصول قائم کر دیا کہ اہل عرب کسی کے غلام نہیں ہو سکتے۔ ان کا یہ قول منقول ہے

لَا یَسْتَرِقُّ عَرَبِیٌّ (عربی کو غلام نہیں بنایا جا سکتا)

انھوں نے پھر حکم دیا کہ غلاموں کو قریبی عزیز و اقارب سے جدا نہ کیا جائے لہٰذا باپ بیٹا، ماں بیٹی اور بیٹا اور سگے بھائی بہنیں ایک ساتھ فروخت ہونے لگے۔ حضرت عمرؓ کا غلاموں کے ساتھ مساوات، احترام اور عزت و برتاؤ کا نتیجہ تھا کہ غلاموں میں بڑے ائمہ حدیث، فقیہ اور عالم سامنے آئے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے جب مصر میں فسطاط شہر آباد کیا تو سرکاری عمارتوں کے ساتھ ایک مکان خاص حضرت عمرؓ کے لیے تعمیر کرایا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے لکھ بھیجا ''یہ میرے کس کام کا ہے؟ اسے کسی اجتماعی کام میں لگایا جائے۔'' چنانچہ وہاں بازار آباد کرایا گیا۔ یہ ان کی اجتماعی سوچ کی ایک جھلک ہے۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کی امتیازی خصوصیات میں رفاہِ عامہ کے وہ کام شامل ہیں جو آپ نے بڑے وسیع پیمانے پر کرائے۔ وہ طویل عرصے تک لوگوں کو نفع دیتے رہے۔ یہی کام آنے والے خلفاء، سربراہانِ مملکت اور بادشاہوں کے لیے نمونہ بنے۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ درج ہے:

(الف) نہرِ ابی موسیٰ: بصرہ میں میٹھے پانی کی سخت کمی تھی۔ ۶ر میل دُور سے پانی لایا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کی شکایت پر حضرت ابوموسیٰ اشعری کو دجلہ سے نہر کھود کر پانی لانے کا حکم دیا۔ چنانچہ دجلہ سے ۹ر میل لمبی نہر کھود کر بصرہ لائی گئی اور گھر گھر میٹھا پانی پہنچایا گیا۔

(ب) نہرِ مَعْقِل: یہ نہر بھی دجلہ سے کاٹ کر لائی گئی۔ اس کی تیاری کا کام معقل بن یسار کے ذمے تھا، اسی لیے ان کے نام سے مشہور ہوگئی۔

(ج) نہرِ سعد: یہ نہر انبار والوں کے مطالبے پر نکالی گئی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (وفات ۵۵ھ) نے اپنی گورنری کے زمانے میں حضرت عمرؓ کے حکم پر کھدوائی۔ ان کے نام پر نہرِ سعد کے نام سے مشہور ہوئی۔

(د) نہرِ امیر المومنین (نہرِ سویز): مصر میں سب سے بڑی مفید نہر جو حضرت عمرؓ کے خاص حکم سے بنی۔ یہ نہر امیر المومنین کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسی نہر کے ذریعے دریائے نیل کو بحرِ قلزم سے ملایا گیا۔ یہ نہر ۶۹ر میل لمبی تھی اور ۹ر ماہ میں تیار ہوگئی۔ یہ تجارتی اور سواری کے جہازوں کے استعمال میں رہی۔ اس سے مصر اور عرب کے لوگوں کو بہت فائدہ ہوا، تجارت بڑھی اور قحط کے دنوں میں اناج پہنچتا رہا۔

عمارتوں کی تعمیر

حضرت عمرؓ نے مملکت میں مختلف نوعیت کی عمارتیں بنوائیں اور مساجد تعمیر کرائیں جن کی تعداد ۴ر ہزار ہے۔ یوں تو ان عمارتوں میں فوجی چھاؤنیاں، دفاتر، دارالامارہ، قید خانے وغیرہ شامل تھے مگر ان میں سے صرف ان کا تذکرہ درج ذیل ہے جو رفاہِ عامہ اور سماجی خدمات سے متعلق تھیں۔

مہمان خانے

یہ اس لیے تعمیر ہوئے کہ بیرونِ شہر سے آنے والے مہمان ان میں ٹھہر سکیں۔ کوفہ میں جو مہمان خانہ بنا، اس کی نسبت احمد بلاذری (وفات ۸۹۲ء) نے لکھا ''انھوں (حضرت عمرؓ) نے حکم دیا کہ جو لوگ دُور دراز علاقوں سے آتے ہیں، ان کے قیام کے لیے مکان بنایا جائے۔'' (فتوح البلدان) مدینہ منورہ میں مہمان خانہ ۱۷ر ہجری میں تعمیر ہوا۔ ابن حبان نے کتاب الثقاہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ علم میں رہے کہ تب سادگی کا زمانہ تھا، لہٰذا یہ تمام عمارتیں بن گئیں۔

سڑکوں اور پلوں کا انتظام

حضرت عمرؓ نے رفاہِ عامہ کے لیے سڑکیں اور پل بنانے کا خاص اہتمام کیا۔ یہ کام ۴ر طریقوں سے کیا گیا۔ ایک بیت المال کے ذریعے، دوسرا مفتوحہ اقوام کی طرف سے۔ ان قوموں سے باقاعدہ معاہدہ ہوتا کہ وہ سڑک، پل وغیرہ اپنے خرچ سے بنوائیں گی۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے شام فتح کیا تو شرائط میں یہ کام بھی شامل تھا۔

مکہ سے مدینہ تک چوکیاں اور سرائیں

مکہ مکرمہ اگرچہ مدتوں سے قبلہ گاہ خلائق تھا لیکن اس کے راستے ویران اور بے آب و گیاہ تھے۔ حضرت عمرؓ ۱۷ہجری میں جب مکہ مکرمہ گئے تو انھیں یہ ویرانی محسوس ہوئی۔ چنانچہ آپ نے ہر منزل پر چوکیاں، سرائیں اور چشمے تیار کرنے کا حکم صادر کیا۔ شاہ ولی اللہؒ نے ازالۃ الخفاء میں لکھا ہے:

''جس سال حضرت عمرؓ نے عمرے کی غرض سے مکہ مکرمہ کا سفر کیا تو واپسی پر حکم دیا کہ وہ سفری منزلیں جو حرمین کے درمیان ہیں، ان میں سایہ و آرام کرنے کے لیے جگہ کا بندوبست کیا جائے۔ وہ کنویں جو مٹی سے اَٹ گئے ہیں، انھیں صاف کیا جائے اور جہاں پانی کے کنوئیں نہیں، وہاں کنوئیں کھودے جائیں تاکہ حجاج کو سفر میں سہولتیں حاصل ہوں۔''

آپ نے اکثر شہروں میں لنگر خانے تعمیر کرائے جہاں مسافروں کو بیت المال کی طرف سے کھانا ملتا تھا۔ مدینہ منورہ میں جو لنگر خانہ تھا، اکثر وہاں خود جا کر اپنے اہتمام سے کھانا کھلواتے۔

غریبوں اور مسکینوں کے لیے وظیفے

حضرت عمرؓ نے اہتمام کیا تھا کہ مسکینوں میں جس قدر اپاہج، بوڑھے اور مفلوج وغیرہ ہوں، ان کے لیے تنخواہیں بیت المال سے مقرر کر دی جائیں۔ چنانچہ ہزاروں شہریوں کو گھر بیٹھے خوراک ملنے لگی۔ یہ وظیفہ ان کی غذائی ضروریات کے لیے کافی تھا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ کیا غلام کے لیے بھی؟ فرمایا ''ہاں غلام کے لیے بھی۔'' غربا اور مساکین کے لیے بلا تخصیص مذہب حکم تھا کہ بیت المال سے ان کے روزینے (وظیفے) مقرر کیے جائیں۔ انھوں نے بیت المال کے عامل کو لکھ کر بھیجا کہ خدا کے اس قول کہ ''انما الصدقات للفقراء والمساکین'' میں فقراء سے مسلمان اور مساکین سے اہل کتاب مراد ہیں۔

گمنام بچوں کو مائیں شاہراہ پر ڈال جاتی تھیں۔ ان کے لیے ۱۸ہجری میں یہ انتظام کیا کہ جہاں اس قسم کا کوئی لاوارث بچہ ملے، اس کے دودھ پلانے اور دیگر مصارف کا انتظام بیت المال سے کیا جائے۔ چنانچہ ان مصارف کے لیے ۱۰۰ درہم سالانہ مقرر ہوئے۔ پھر سال بہ سال ان میں اضافہ ہو جاتا۔

یتیموں کی پرورش کے لیے اگر ان کی جائیداد ہوتی، تو اس کی حفاظت کا نہایت اچھا اہتمام کرتے۔ اکثر تجارت کے ذریعے اسے ترقی دیتے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حکم بن ابی العاص سے کہا ''میرے پاس یتیموں کا جو مال جمع ہے وہ زکوٰۃ نکالنے کی وجہ سے گھٹتا جا رہا ہے۔ تم اس کو تجارت میں لگاؤ اور جو نفع ہو، واپس کردو۔'' چنانچہ ۱۰ہزار کی رقم حوالے کی جو بڑھتے بڑھتے ۱ لاکھ تک پہنچ گئی۔

قحط میں انتظام

۱۸ہجری میں جب عرب میں قحط پڑا تو حضرت عمرؓ خدمتِ خلق کے کاموں میں ہمہ تن مصروف رہے۔ اوّل بیت المال کا تمام نقد و غلہ صرف کیا۔ پھر صوبوں کے افسروں کا لکھا کہ ہر جگہ سے غلہ روانہ کیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہؓ نے ۴ہزار اونٹ غلے سے لدے بھیجے۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے بحرِ قلزم کی راہ سے ۲۰ جہاز روانہ کیے۔ حضرت عمرؓ ان جہازوں کو ملاحظہ کرنے خود بندرگاہ تشریف لے گئے جو مدینہ منورہ سے ۳ منزل پر واقع تھی۔ بندرگاہ میں ۲ بڑے بڑے مکان بنوائے اور زیدؓ بن ثابت کو حکم دیا کہ قحط زدوں کا نقشہ بنائیں۔

چنانچہ ناموں اور مقدار غلہ کا رجسٹر تیار ہوا۔ ہر شخص کو چیک (پرچہ) تقسیم کیا گیا جس کے مطابق اسے روزانہ غلہ ملتا۔ چیک پر حضرت عمرؓ کی مہر ثبت ہوتی۔ اس کے علاوہ ہر روز ۲۰ راونٹ خود اپنے اہتمام سے ذبح کراتے اور قحط زدوں کو کھانا پکوا کر کھلاتے۔ یہ واضح رہے کہ حضرت عمرؓ کو اگرچہ شہریوں کی پرورش اور پرداخت کا بہت خیال تھا لیکن ان کی فیاضی ایسی نہ تھی جس کے باعث کاہلی اور مفت خوری کو رواج ملتا ہے۔

حضرت عمرؓ کی نکتہ سنجی

ایشیائی سلاطین و امرا کی فیاضیوں کا ذکر عموماً بڑے ذوق و شوق سے کیا جاتا ہے۔ لیکن لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ اس سے جہاں بادشاہ کی مدح نکلتی ہے، دوسری قوم دریوزہ گر (بھکاری) ہو جاتی اور انعام و بخشش پر لو لگائے بیٹھے رہتی۔ یہی فیاضیاں تھیں جس نے ہماری قوم میں ایسے لاکھوں لوگ پیدا کر دیے جو ہاتھ پاؤں ہلانا نہیں چاہتے اور نذر و نیاز وغیرہ پر اوقات بسر کرتے ہیں۔

لیکن حضرت عمرؓ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ وہ سخت کوشش کرتے کہ لوگوں میں کاہلی اور مفت خوری کا مادہ پیدا نہ ہونے پائے۔ انھوں نے جن لوگوں کی تنخواہیں اور خوراک مقرر کی، وہ ایسے لوگ تھے جن سے بھی فوجی خدمت کی توقع ہو سکتی تھی یا جنھوں نے پہلے کوئی نمایاں خدمت دی تھی اور اب وہ ضعف اور بیماری کی وجہ سے خود کسبِ معاش نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کسی اور قسم کی فیاضی روا نہیں رکھتے تھے۔ علامہ ماوردی نے الاحکام السلطانیہ میں لکھا ہے کہ محتسب کا فرض ہے کہ ایسے لوگوں کو جو کھانے کمانے کے قابل ہونے کے باوجود صدقہ اور خیرات لیتے ہوں، تنبیہ و تادیب کرے۔ اس کے بعد علامہ موصوف نے اس کی سند میں حضرت عمرؓ کے عمل سے استدلال کیا۔

آپ کا معمول تھا کہ جب کسی شخص کو ظاہر میں خوشحال دیکھتے تو دریافت فرماتے، یہ کوئی پیشہ بھی کرتا ہے؟ اب لوگ کہتے کہ نہیں، تو فرماتے، یہ شخص میری آنکھ سے گر گیا۔ ان کا مقولہ تھا ''ذلیل پیشہ بھی لوگوں سے سوال کرنے کی نسبت اچھا ہے۔'' علماء کو انھوں نے علانیہ مخاطب کر کے کہا ''مسلمانوں پر اپنا بار نہ ڈالو۔''

(سیرۃ العمرین لابن الجوزی)

جزئیات پر توجہ

حضرت عمرؓ کی زندگی یہ عجیب بات عیاں کرتی ہے کہ اگرچہ انھیں ہمیشہ بڑے اہم امور سے سابقہ رہا، تاہم چھوٹے چھوٹے کام بھی وہ خود انجام دے لیتے۔ اس کے لیے ان کو وقت اور فرصت کی تنگی محسوس نہ ہوتی۔ ان میں ایسے کام بھی شامل ہوتے جن کا اختیار کرنا بظاہر شانِ خلافت کے خلاف تھا لیکن آپؓ عار محسوس نہ کرتے۔ مثال کے طور پر ضرورت مندوں کے جو روزینے مقرر تھے، اکثر خود جا کر تقسیم کرتے۔ مدینہ سے کئی منزل کے فاصلے پر ۱ر قصبے قبیلہ خزاعہ کے لوگ آباد تھے۔ آپ ان دونوں مقامات پر خود تشریف لے جاتے۔ روزینہ داروں کا دفتر ہاتھ میں ہوتا۔ آپ کو دیکھ کر چھوٹے بڑے سب لوگ گھروں سے نکل آتے۔ حضرت عمرؓ خود اپنے ہاتھ سے روزینے تقسیم کرتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ دارالصدقہ میں جاتے، ایک ایک اونٹ کے پاس کھڑے ہو کر دانت گنتے اور ان کا حلیہ قلم بند فرماتے۔

طبری نے ابوحذیفہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کا معمول تھا، مجاہدین کے گھر جاتے اور عورتوں سے کہتے کہ کچھ بازار سے منگوانا ہو تو لادوں؟ وہ لونڈیاں ساتھ کر دیتیں۔ حضرت عمرؓ خود چیزیں خریدتے اور ان کے حوالے کرتے۔ میدانِ جنگ سے قاصد آتا اور لشکریوں کے خطوط لاتا تو خود ان کے گھر پہنچا آتے اور کہتے، فلاں تاریخ تک قاصد واپس جائے گا، جواب لکھوا رکھو تاکہ روانہ ہو جائے۔ کاغذ، قلم اور دوات خود مہیا کر دیتے۔ جس گھر میں کوئی حرف شناس نہ ہوتا، خود چوکھٹ کے پاس بیٹھتے اور گھر والے جو لکھواتے، لکھتے جاتے۔

حضرت عمرؓ نے انسانی فطرت، ضرورت اور خواہش کا

ایک بڑھیا کا حسن طلب

حضرت قیس بن سعد عبادہؓ معروف صحابی ہیں اور ایک زمانہ تک مصر کے گورنر رہے ہیں، موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک بڑھیا ان کے پاس آئی اور کہنے لگی:

''مجھے یہ شکایت ہے کہ میرے گھر میں کیڑے مکوڑے بہت کم ہیں۔''

حضرت قیسؓ نے فرمایا ''کیا اچھا کنایہ ہے، اس کا گھر روٹی، گوشت، کھی اور کھجور سے بھر دو۔''

(اقتباس: کتاب 'تراث'، از جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی)

لحاظ کرتے ہوئے فوجیوں، مجاہدوں اور سرکاری کاموں میں گھروں سے دور رہنے والوں کو ۴ ماہ بعد چھٹی دینے کا رواج شروع کیا تاکہ وہ اپنے گھر والوں کی خیروعافیت معلوم کرنے اور ان کے ساتھ رہنے آسکیں۔

رعایا کی شکایتوں سے واقفیت

حضرت عمرؓ کی سب سے زیادہ توجہ اس بات پر مبذول رہتی تھی کہ رعایا کی ہر شکایت ان تک پہنچ جائے۔ یہ معمول بنا رکھا تھا کہ ہر نماز کے بعد صحنِ مسجد میں بیٹھ جاتے۔ جس کو ان سے جو کہنا سننا ہوتا، کہہ دیتا۔ کوئی نہ ہوتا تو تھوڑی دیر انتظار کر کے اٹھ جاتے۔

(کنز العمال جلد دوم ص ۲۳۰)

راتوں کو دورے کیا کرتے۔ سفر میں راہ چلتوں سے حالات پوچھتے۔ بیرونی اضلاع سے جو سرکاری قاصد آتے، ان سے ہر قسم کی پرسش خود کرتے۔

اضلاع سے ہر سال سفارتیں آتی تھیں، انھیں وفد کہتے تھے۔ یہ عرب کا قدیم دستور تھا لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں سفارتوں سے وہ کام لیا جو آج کل جمہوری سلطنتوں میں رعایا کے نمائندے انجام دیتے ہیں۔ یعنی آپ وفد کے علاقے سے متعلق سوالات پوچھتے اور تمام ضروری معلومات لیتے۔

شام کا سفر اور رعایا کی خبرگیری

ان تمام باتوں پر بھی تسلّی نہ ہوتی، فرماتے ''عمال رعایا کی پروا نہیں کرتے اور ہر شخص مجھ تک پہنچ نہیں سکتا۔'' اس بنا پر ایک بار ارادہ کیا کہ شام، جزیرہ، کوفہ اور بصرہ کا دورہ کریں اور ہر جگہ دو دو مہینے ٹھہریں لیکن موت نے فرصت نہ دی۔ تاہم آخری مرتبہ جب شام کا سفر کیا تو ایک ایک ضلع ٹھہر کر لوگوں کی شکایتیں سنیں اور داد رسی کی۔ اس سفر میں ایک عبرتناک واقعہ پیش آیا۔ دارالخلافہ واپس آ رہے تھے کہ راہ میں ایک خیمہ دیکھا۔ سواری سے اتر کر خیمہ کے قریب گئے تو ایک بوڑھی عورت نظر آئی۔ اس سے پوچھا ''عمر کا کچھ حال معلوم ہوا؟''

اس نے کہا ''ہاں شام سے روانہ ہو چکا لیکن اللہ اس کو غارت کرے، آج تک مجھے اس کے ہاں سے ایک جُبہ بھی نہیں ملا۔''

حضرت عمرؓ نے کہا ''اتنی دور کا حال عمر کو کیونکر معلوم ہو سکتا ہے؟''

بولی ''اس کو رعایا کا حال معلوم نہیں تو خلافت کیوں کرتا ہے؟''

حضرت عمرؓ یہ سن کر بے اختیار رو پڑے۔

کتب تاریخ میں ایسے واقعات درج ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ رعایا کے آرام و آسایش اور خبرگیری میں انھیں کس قدر سرگرمی اور ہمدردی تھی۔

☆☆

بچوں کے لیے روزینے

ایک مرتبہ ایک قافلہ مدینہ منورہ میں آیا اور شہر کے باہر اترا۔ اس کی خبرگیری اور حفاظت کے لیے خود تشریف لے گئے۔ پہرہ دیتے پھرتے تھے کہ ایک طرف سے رونے کی آواز آئی۔ ادھر متوجہ ہوئے۔ دیکھا، ایک شیرخوار بچہ ماں کی گود میں رو رہا تھا۔ ماں کو تاکید کی کہ بچہ بہلائے۔ تھوڑی دیر بعد پھر ادھر سے گزر ہوا تو بچے کو دوبارہ روتا پایا۔ غیظ میں آ کر فرمایا ''تو بڑی بے رحم ماں ہے۔''

اس نے کہا ''تم کو اصل حقیقت معلوم نہیں خواہ مخواہ مجھے دِق کرتے ہو۔ بات یہ ہے کہ عمرؓ نے حکم دیا ہے، بچے جب تک ماں کا دودھ نہ چھوڑیں، بیت المال سے ان کا وظیفہ مقرر نہ کیا جائے۔ میں اس غرض سے اس کا دودھ چھڑاتی ہوں اور یہ اس وجہ سے روتا ہے۔''

حضرت عمرؓ یہ سن کر نمگین ہو گئے اور اپنے آپ سے فرمایا ''ہائے عمر! تو نے کتنے بچوں کا خون کیا ہوگا؟''

انھوں نے پھر اسی وقت منادی کرادی ''بچے جس دن سے پیدا ہوں، اسی تاریخ سے ان کے روزینے مقرر کر دیے جائیں۔''

بچوں کی بھوک کی فکر

حضرت عمرؓ کے غلام اسلم کا بیان ہے، ایک مرتبہ آپؓ رات کو گشت کرنے نکلے۔ مدینہ سے ۳ میل پر صرار نامی ایک مقام ہے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں۔ قریب جا کر حقیقتِ حال دریافت فرمائی۔ اس نے کہا کہ کئی وقت سے بچوں کو کھانا نہیں ملا۔ انھیں بہلانے کے لیے خالی ہانڈی میں پانی ڈال کر چڑھا دیا ہے۔ حضرت عمرؓ اسی وقت اُٹھے، مدینہ میں آ کر بیت المال سے آٹا، گوشت، گھی اور کھجوریں لیں اور اسلم سے کہا کہ میری پیٹھ پر رکھ دو۔ اسلم نے کہا کہ میں لیے چلتا ہوں، فرمایا ''لیکن قیامت کے روز میرا بار تم تو نہیں اٹھاؤ گے۔''

غرض سب چیزیں خود اٹھا کر لائے اور عورت کے آگے رکھ دیں۔ اس نے آٹا گوندھا اور ہانڈی چڑھائی۔ حضرت عمرؓ خود چولھا پھونکتے جاتے۔ کھانا تیار ہوا تو بچوں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور اچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمرؓ بچوں کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔ عورت نے کہا ''خدا تم کو جزائے خیر دے۔ سچ یہ ہے کہ امیرالمومنین ہونے کے قابل تم ہو نہ کہ عمرؓ!''

☆☆

اہلیہ کے ساتھ خدمتِ خلق

ایک مرتبہ رات کو گشت کر رہے تھے کہ ایک بدو کو خیمہ سے باہر زمین پر بیٹھا دیکھا۔ پاس جا کر بیٹھے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ دفعۃً خیمے سے رونے کی آواز آئی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کون روتا ہے؟ اس نے کہا، میری بیوی درد زہ میں مبتلا ہے۔ حضرت عمرؓ گھر آئے اور اپنی اہلیہ، حضرت ام کلثومؓ کو ساتھ لیا۔ بدو سے اجازت لے کر انھیں خیمے میں بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد بچہ پیدا ہوا۔ اُم کلثوم نے حضرت عمرؓ کو پکارا کہ امیرالمومنین، اپنے دوست کو مبارک باد دیجیے۔ امیرالمومنین کا لفظ سن کر بدو چونک پڑا اور مؤدب ہو کر بیٹھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ''کچھ خیال نہ کرو۔ کل میرے پاس آنا، اس بچہ کی تنخواہ مقرر کر دوں گا۔''

☆☆

رعایا کی حفاظت کا خیال

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا بیان ہے، ایک مرتبہ حضرت عمرؓ رات کو میرے مکان پر آئے۔ میں نے کہا، آپ نے کیوں تکلیف کی، مجھ کو بلا لیا ہوتا؟ فرمایا ''ابھی معلوم ہوا ہے، شہر سے باہر ایک قافلہ اترا ہے۔ لوگ تھکے ماندے ہوں گے، آؤ چل کر پہرہ دیں۔'' چنانچہ دونوں اصحاب گئے اور رات بھر پہرہ دیتے رہے۔

☆☆

قحط میں حالت

جس سال عرب میں قحط پڑا، حضرت عمرؓ کی عجیب حالت ہوئی۔ جب تک قحط رہا، گوشت، گھی، مچھلی غرض کوئی لذیذ چیز نہ کھائی۔ نہایت خضوع سے دعائیں مانگتے ''اے اللہ! محمد ﷺ کی امت کو میری شامتِ اعمال سے تباہ نہ کرنا۔''

آپؓ کے غلام اسلم کا بیان ہے، قحط کے زمانے میں حضرت عمرؓ کو جو فکر و تردد رہتا تھا، اس سے قیاس کیا جاتا کہ اگر قحط ختم نہ ہوا تو وہ اسی غم میں تباہ ہو جائیں گے۔

(کنز العمال جلد ۶، ص ۲۴۳)

معذوروں کی فکر

حضرت سعیدؓ بن یربوع ایک صحابی تھے۔ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا، آپ جمعہ میں کیوں نہیں آتے؟ انھوں نے کہا، میرے پاس آدمی نہیں کہ مجھ کو راستہ بتائے! حضرت عمرؓ نے ایک آدمی مقرر کر دیا جو ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔

(اسد الغابہ، تذکرہ سعدؓ بن یربوع)

ایک مرتبہ لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے، ایک شخص کو دیکھا کہ بائیں ہاتھ سے کھا رہا ہے۔ قریب جا کر کہا کہ داہنے ہاتھ سے کھاؤ۔ اس نے کہا کہ جنگِ موتہ میں میرا دایاں ہاتھ جاتا رہا۔ حضرت عمرؓ کو رقت ہوئی۔ اس کے برابر بیٹھ گئے، رونے لگے اور بولے، افسوس تم کو وضو کون کراتا ہوگا؟ سر کون دھوتا ہوگا؟ کپڑے کون دھوتا ہوگا؟ پھر ایک نوکر مقرر کر دیا اور اس کے لیے تمام ضروری چیزیں خود مہیا کر دیں۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے واقعات حضرت عمرؓ کی انفرادی اور اجتماعی سماجی خدمات واضح کرتے ہیں۔

(بشکریہ ماہنامہ دعوۃ، اسلام آباد)

موضوع سخن

تربیت ہی بشر کو انسان بناتی ہے

وصی شاہ

اُسے سیکھنا ہوگا
میں جانتا ہوں
کہ ہر شخص کھرا نہیں ہوتا
لیکن اُسے یہ بھی بتاؤ کہ ہر غنڈے کے مقابلے میں
ایک ہیرو ہوا کرتا ہے
ہر خود غرض سیاستدان کے مقابلے میں ایک مخلص
راہنما بھی ہوا کرتا ہے
اُسے بتاؤ کہ ہر دشمن کے مقابلے میں ایک دوست
بھی ہوا کرتا ہے
اُسے حسد سے دور کردو،
اگر تم کر سکو تو
اُسے خاموش قہقہوں کے
راز کے بارے میں بتاؤ
اس کو یہ جلد سیکھ لینا چاہیے کہ بدمعاشوں کا مقابلہ کرنا
سب سے آسان کام ہوا کرتا ہے
اُسے بتاؤ اگر تم بتا سکو تو
کتابوں کے سحر کے بارے میں
لیکن اُسے اتنا وقت ضرور دینا کہ وہ آسمانوں پر
اُڑنے والے پرندوں کے دائمی راز، شہد کی مکھیوں کے
سورج سے تعلق اور پہاڑوں سے پھوٹنے والے پھولوں پر
بھی غور کر سکے

سکول میں اسے بتاؤ کہ نقل کر کے پاس ہونے سے
فیل ہو جانا زیادہ باعزت ہے
اُسے بتاؤ کہ اپنے خیالات پہ پختہ یقین رکھے چاہے
اُسے سب کہتے بھی رہیں کہ وہ غلط ہیں
اسے سکھاؤ کہ شریفوں کے ساتھ شریف رہے
لیکن ہٹ دھرموں کے ساتھ سختی سے پیش آئے
میرے بیٹے کو وہ طاقت عطا کرنے کی کوشش کرو
کہ جب ہر شخص بھیڑ چال کا شکار ہو رہا ہو تو وہ اس سے
دُور رہ سکے
اسے بتاؤ کہ ہر شخص کی بات سنے لیکن یہ بھی بتاؤ کہ
جو کچھ سُنے اسے سچ کی کسوٹی پر پرکھے اور جو اس میں سے
صحیح اور درست ہو، وہ رکھ لے
اسے بتاؤ کہ محنت سے کمایا ہوا ایک ڈالر
ناجائز طور پر حاصل کیے ہوئے لاکھوں ڈالر سے بہتر
ہوتا ہے
اسے دوستوں کے لیے قربانی دینا سکھاؤ
اگر تم بتا سکو تو اسے بتاؤ کہ
اداسی میں کیسے مسکرایا جاتا ہے
اسے بتاؤ کہ آنسوؤں میں کوئی شرم نہیں
اسے بتاؤ کہ منفی سوچ رکھنے والوں کو خاطر میں مت
لائے اور خوشامد اور بہت زیادہ مٹھاس سے ہوشیار رہے

اسے بتاؤ کہ اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کا
بہترین معاوضہ وصول کرے لیکن کبھی بھی اپنی روح اور
دل کو بیچنے کے لیے نہ لگائے
اسے بتاؤ کہ شور مچاتے ہوئے ہجوم کی باتوں پر کان
نہ دھرے
اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ صحیح ہے تو اپنی جگہ پر قائم
رہے، ڈٹا رہے
اس سے شفقت سے پیش آؤ مگر پیار اور دلارمت کرو
کیونکہ یاد رکھو کہ خام لوہے کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی
فولاد بنایا کرتی ہے
اس میں اتنا حوصلہ بھر دو کہ وہ وقت پڑنے پر عجلت
میں فیصلہ کر سکے
اور خود میں اتنی ہمت بھی پیدا کرے کہ صبر کر سکے
اسے ہمیشہ سکھاؤ کہ خود پر انتہائی درجے کا اعتماد رکھے
کیونکہ تبھی وہ انسانیت پر انتہا درجے کا اعتماد رکھ سکے گا
ایک مشکل کام ہے
لیکن دیکھتے ہیں کہ تم کیا کر سکتے ہو
میرا معصوم بیٹا بہت ہی پیارا ہے

☆☆

اوپر درج کیا گیا خط تاریخ میں معروف امریکی صدر
ابراہم لنکن کے نام سے منسوب ہے میں نے انگریزی میں
لکھے گئے اس خط کا بامحاورہ ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔
کچھ لوگ اسے ابراہم لنکن کا خط تسلیم کرتے ہیں اور کچھ اس
کا اصل سانحہ اور ستر کی دہائی میں بھارت میں تلاش کرتے
ہیں۔ ایک امریکی تاریخ دان راجر نارٹن جو لنکن پر ایک
جامع اور مستند ویب سائٹ بھی چلاتے ہیں، اس خط کے
بارے میں ان کا کہنا ہے "مجھ سے اس خط کے بارے میں
کئی بار پوچھا گیا خصوصاً بھارت کے لوگوں نے جہاں یہ
خط بہت بڑی تعداد میں پڑھا گیا۔ میرے پاس ابراہم
لنکن کے اوپر لکھی گئی دو سو اسی سے زیادہ کتابیں موجود
ہیں لیکن میں ابراہم لنکن کا تقریباً تمام تحریری مواد بھی شامل
ہوں لیکن میں نے کبھی یہ خط اس میں نہیں دیکھا۔ یہ واقعی

کیا کیا صدمے سہہ جاتا ہے پرچم چاند ستارے کا

کیسی شان سے لہراتا ہے پرچم چاند ستارے کا
جھوم جھوم کے اٹھلاتا ہے پرچم چاند ستارے کا

بوتل کا پہیہ جام ہوا ہے پی آئی اے ناکام ہوا ہے
بلّی کا تو حال نہ پوچھو جب سے بولو رام ہوا ہے
کیا کیا صدمے سہہ جاتا ہے پرچم چاند ستارے کا
کیسی شان سے لہراتا ہے پرچم چاند ستارے کا

چوری ڈاکے سینہ زوری مہنگائی نے کمر ہے توڑی
زردوں پر ہے آج کرپشن، بڑھتی جائے رشوت خوری
دیکھ دیکھ کر شرماتا ہے پرچم چاند ستارے کا
کیسی شان سے لہراتا ہے پرچم چاند ستارے کا

راج کرے ہے غنڈہ گردی کوئی کسی کا رہا نہ دردی
سونے پاکستان کی ہم نے دیکھو کیسی حالت کر دی
ہاتھ ہی ملتا رہ جاتا ہے پرچم چاند ستارے کا
کیسی شان سے لہراتا ہے پرچم چاند ستارے کا

آزادی جو ہمیں ملی ہے، اس نعمت کی قدر کریں
نفرت کی دیوار گرا دیں آپس میں نہ لڑیں مریں
ساری قوم کو سمجھاتا ہے پرچم چاند ستارے کا
کیسی شان سے لہراتا ہے پرچم چاند ستارے کا

یہ تو ہے ہم سب کی عزت، دلہن کے ماتھے کا جھومر
بہنوں کے یہ سر کا آنچل، بیٹی کا انمول ہے زیور
ماں کی چادر کہلاتا ہے پرچم چاند ستارے کا
کیسی شان سے لہراتا ہے پرچم چاند ستارے کا

چوہدری عبدالخالق حالات حاضرہ پر بڑی خوبصورت نظمیں لکھتے اور ہلکے پھلکے انداز میں ہلکے پھلکے نشتر چبھوتے ہیں۔ یوم قرارداد پاکستان کے موقع پر لکھے گئے اس کلام میں انھوں نے ملک کے موجودہ حالات کی اچھوتے انداز میں نشاندہی کی ہے۔

ایک حیران کر دینے والا شاندار خط ہے۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ یہ واقعی لنکن نے ہی لکھا ہوگا۔"

مگر اس وقت ہمارا موضوع اس خط کے مندرجات اور اس کی روح ہے اس کی تاریخ نہیں۔ یہ ماسٹر پیس آف لٹریچر ہے۔ حکیم سعید مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ ہم بچوں کی تعلیم پر توجہ دیتے ہیں مگر ان کی تربیت پر نہیں۔

تکلیف کی بات ہے لیکن اگر ہماری قوم کی ماؤں نے ہمارے بچوں کی اچھی تربیت کی ہوتی تو معاشرے میں ایسے سیاستدان، بیوروکریٹ، جج، جرنیل، صنعت کار، جاگیردار، بزنس مین نہ پیدا ہوئے ہوتے جو ہمیں آج بھی خاک میں ملا کر ہمیں اور اس ملک کو باقاعدہ ناک سے لکیریں نکلوا رہے ہیں۔

نپولین نے کہا تھا کہ تم مجھے اچھی مائیں دے دو میں تمہیں اچھی قوم دے دوں گا، تو وہ اسی لیے کہا تھا کہ نسلوں کی تربیت مائیں ہی کیا کرتی ہیں۔ ماں کے وجود کی بنیادی اہمیت بھی صرف بچہ جننے سے نہیں بلکہ اس کی تربیت کرنے سے زیادہ ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی کا کہنا ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں بشر کا ذکر آیا ہے وہ اس کی حیاتیاتی شناخت کے طور پر آیا ہے۔ جیسے درخت، پھول، پرندے یا کوئی حیوان شیر، گدھا، گھوڑا مگر جب یہی بشر اپنی عقل کا استعمال کرتے ہوئے بہتر رویے اور اعلیٰ اقدار اپناتا ہے تو پھر انسان کے درجے پر فائز ہوتا ہے۔ علی شریعتی کا یہ کہنا ہے کہ جہاں جہاں بشر کی اعلیٰ اقدار کا ذکر ہوا ہے وہاں وہاں اسے اللہ تعالیٰ انسان کے طور پر مخاطب کرتا ہے۔

ہم ہمیشہ سنتے آئے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات اپنی عقل کی وجہ سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بات درست بھی ہے مگر اصل میں انسان اس عقل کے بہتر استعمال کی وجہ سے انسانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوتا ہے۔ عقل کے بہتر استعمال سے مراد اعلیٰ انسانی اقدار ہیں جو دوسرے انسانوں کے لیے فلاح اور بھلائی کا پیغام دیتی ہیں، اور عقل کا یہ استعمال انسان کو صرف تربیت سکھا سکتا ہے، اچھی تربیت نہیں۔ اچھی تربیت قوم کی مائیں، اساتذہ اور دانشور کیا کرتے ہیں۔

اگر صرف عقل کا ہی استعمال بشر کو اعلیٰ انسان بناتا ہو تو چنگیز خان، مسولینی، ہٹلر، ابوجہل جیسی شخصیات کو کیا اعلیٰ انسان سمجھا جا سکتا ہے؟ یہ اشرف المخلوقات کے ماتھے پر کلنک تو ہو سکتے ہیں، انسان ہوتے ہوئے بھی اشرف المخلوقات نہیں ہو سکتے۔

اعلیٰ انسان اور اصل اشرف المخلوقات وہی ہے جو عقل کا استعمال انسانی فلاح اور بھلائی کے لیے کرے چاہے وہ کوئی سیاستدان ہو یا سائنسدان اور عقل کا ایسا استعمال صرف اچھی تربیت کے ذریعے ہوا کرتا ہے کہ علم تو بڑے بڑے لوگوں کے پاس آیا مگر نہ اس سے کچھ کھٹیا نہ کمایا۔ تبھی تو کہنے والے کہہ گئے:

علموں بس کریں او یار

یہاں اشفاق احمد مرحوم بھی یاد آتے ہیں جو کہا کرتے تھے کہ اس ملک کو جتنا نقصان پڑھے لکھوں نے پہنچایا ہے ان پڑھوں نے نہیں پہنچایا، اور کسی حد تک اشفاق صاحب ٹھیک ہی کہتے تھے۔

سو صرف عقل کا استعمال نہیں بلکہ عقل کا ایسا استعمال جس میں تربیت کا تڑکا لگا ہو، وہی ایک اعلیٰ انسانی معاشرہ ترتیب دے سکتا ہے۔

خدا کی قسم اس خط کو ایک نہیں ہزاروں، ہزاروں نہیں لاکھوں بار پڑھنے کی اور خود پر اور اپنے بچوں پر لاگو کرنے کی ضرورت ہے۔ اس خط میں ہر عہد کا نوحہ اور المیہ بھی ہے اور اس سے بچ نکل آنے کی صورت بھی۔

کاش ہم، ہماری مائیں، ہمارے رہنما، ہمارے دانشور اور ہمارے اساتذہ ایسا معاشرہ تشکیل دے سکیں جس میں ہماری نسلوں کی تربیت ان خطوط پر ہو سکے جس کی نشاندہی اس خط میں کی گئی ہے مگر یہ تبھی ہوگا جب ہم تعلیم کے ساتھ ساتھ من حیث القوم "تربیت" پر بھی توجہ دیں گے ورنہ جو کچھ اس خطے میں ۶۳ سال سے چل رہا ہے، مزید ۶۳۰۰ سال تک ایسے ہی چلتا رہے گا۔

بچوں

کے عالمی ادارے، یونی سیف نے کچھ عرصہ قبل ترقی یافتہ ممالک میں سے برطانیہ کے بچوں کو سب سے زیادہ ناخوش قرار دیا۔ اپنی ایک حالیہ رپورٹ میں اس ادارے نے اس صورت حال کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ رپورٹ کے مطابق برطانوی والدین بچوں کے ساتھ کم وقت گزارتے ہیں لیکن مادہ پرستی کے بڑھتے رجحان کے تحت ان کی یہ کوشش ضرور ہوتی ہے کہ بچوں کو مہنگے کھلونے لے کر دیے جائیں۔ برطانوی لوگ اچھے والدین بننا چاہتے ہیں لیکن وہ وقت کی کمی کا شکوہ کرتے نظر آتے ہیں اور بعض اوقات وہ لاعلم بھی ہوتے ہیں کہ بچوں کی اچھی پرورش کیسے کی جائے۔

اس رپورٹ میں برطانیہ کا موازنہ سویڈن اور سپین کے ساتھ کیا گیا ہے۔ سویڈن اور سپین میں والدین بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے ہیں اور بچوں کے لیے سرگرمیاں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ تحقیق میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ بچے والدین اور دوستوں کے ساتھ وقت گزارنا پسند کرتے ہیں اور انھیں آوٹ ڈور کھیلوں میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ برطانوی والدین معاشی تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں۔ گھروں میں تھکے آتے ہیں یا دیگر گھریلو کاموں کے باعث بچوں کو مناسب وقت نہیں دے پاتے۔ عموماً بچوں کو ٹی وی اور کمپیوٹر گیمز کے حوالے کر کے تازہ ہوا سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

سویڈن میں سرکاری پالیسیاں ایسی ہیں کہ والدین بچوں کے ساتھ مناسب وقت گزار سکیں۔ سپین میں ایک باپ کے کام کے اوقات طویل ہوتے ہیں لیکن دوسرے رشتے دار بچوں کی پرورش میں معاون بنتے ہیں۔ گھر میں موجود ماں بھی بچوں کو مناسب وقت اور توجہ دیتی ہے۔

برطانیہ میں معاشی مصروفیت کا دباؤ اور بے مہار مادہ پرستی بچوں کی بہتر نگہداشت میں رکاوٹ بنتی ہے۔ برطانوی بچوں کو والدین کی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ زیادہ سے زیادہ دولت کمانے میں مصروف رہتے ہیں تاکہ بچوں کے لیے مہنگے کھلونے اور کپڑے خریدے جا سکیں۔ کم آمدنی والے خاندانوں کو زیادہ سخت محنت کرنا پڑتی ہے تاکہ بچوں کو نت نئے کھلونے لے کر دیے جائیں اور اپنا سٹیٹس برقرار رکھا جائے۔

برطانوی بچوں کی مصروفیت کے لیے سرگرمیاں بھی کم ہوتی ہیں۔ خصوصاً یہ صورت حال تعلیمی اداروں میں پائی جاتی ہے۔ سپین اور سویڈن میں سکول کے بچوں کے لیے تخلیقی سرگرمیاں زیادہ ہوتی ہیں۔

یونیسف نے برطانیہ کو ترجیحات بدلنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس کے لیے برطانیہ کو کم سے کم آمدنی کی سطح بہتر کرنے کی کوشش کرنا ہوگی تاکہ لوگوں کو خاندان کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع مل سکے۔ مادی اشیا کے حصول کے لیے نا ختم ہونے والی دوڑ کی حوصلہ شکنی کے لیے اشتہارات کے قوانین میں بھی تبدیلیاں لانا ہوں گی۔ اسی حوالے سے سویڈن میں یہ دلچسپ پیش رفت بھی ہوئی کہ اس ملک کے ۱۲ر سال سے کم عمر بچوں کو چیزیں خریدنے پر آمادہ کرنے والے اشتہارات پر پابندی کا فیصلہ کر لیا گیا۔

برطانیہ میں سیاست دان بھی اس معاملے کی سنگینی کو سمجھ رہے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ بچوں کی بہتر نشوونما میں دولت سے زیادہ والدین کی توجہ اور وقت کی اہمیت ہوتی ہے اور مضبوط اور مستحکم خاندان ہی کامیاب معاشرے کی بنیاد بن سکتے ہیں۔

بچے والدین اور دوستوں کے ساتھ وقت گزارنا پسند کرتے ہیں اور انھیں آوٹ ڈور کھیلوں میں زیادہ مزہ آتا ہے

عالمی منظرنامہ

آخر یہ "امیر" ہیں کون؟

ایک فیصد اور ۹۹ رفیصد کی اصطلاحات کیسے مقبول ہوگئیں؟

''موٹی بلی'' کن لوگوں کو کہا جارہا ہے؟

کیا کچھ باتیں غریبوں کے بھی سمجھنے والی ہیں؟

وقار صبوحی

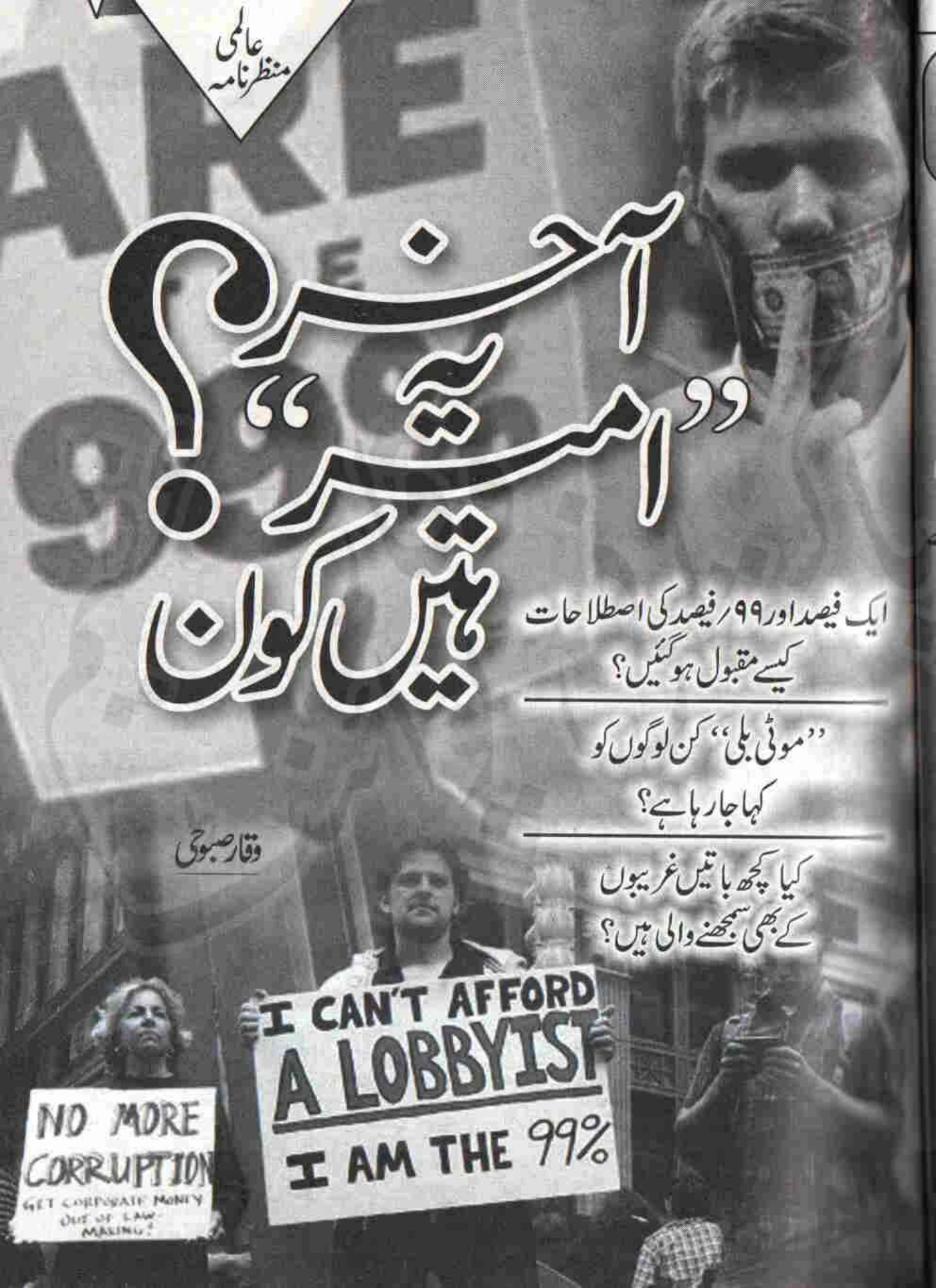

پچھلے

سال پوری دنیا میں امرا اور طاقتور شخصیات کے خلاف عوامی مظاہرے ہوئے۔ یقیناً سبھی امرا ان کا نشانہ نہیں تھے کیونکہ اس گروہ میں بل گیٹس، وارن بفٹ اور کئی دوسرے کھرب و ارب پتی شامل ہیں جو غریبوں کی فلاح و بہبود پر سالانہ اربوں روپے خرچ کرتے ہیں لیکن عوامی مظاہروں نے سبھی امیروں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لفظ ''امیر'' کو نئے معنی عطا کردیے۔ یہی نہیں، مظاہرین نے ''بینکار'' کی تشریح بھی بدل ڈالی اور لغت میں ۲ر نئے الفاظ ''ارفیصد'' اور ''۹۹ر فیصد'' کا اضافہ کیا۔

دنیا کے ''امیر''

معروف معنوں میں جس کے پاس کثیر رقم ہو، وہ امیر کہلاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس لفظ کی کوئی معین تشریح نہیں۔ کیونکہ رشوت لینے، ڈاکہ ڈالنے اور ناجائز طریقوں سے دولت کمانے والا بھی امیر کہلاتا ہے اور وہ کاروباری یا صنعت کار بھی جو حلال طریقوں اور محنت سے دولت کمائے۔ بعض ماہرین کے خیال میں امیر وہ ہے جس کے پاس ''ضرورت سے زیادہ'' رقم ہو۔ لیکن پھر ضرورتوں کی تشریح میں بڑا اختلاف ہے۔

امریکا، برطانیہ اور یورپ میں امارت کا ایک پیمانہ یہ ہے کہ جو شخص زیادہ ٹیکس ادا کرے، یعنی سالانہ چار پانچ کروڑ روپے تک، وہ امرا کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ ایک اور پیمانہ ''آمدن'' ہے۔ برطانیہ میں لوگوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ اگر وہ سالانہ ۲ر کروڑ روپے کما لیں، تو خود کو امیر سمجھیں گے۔

پاکستان میں جو شخص کاروبار کرے، بڑے گھر میں رہے، بیش قیمت کپڑے پہنے اور قیمتی اشیا استعمال کرے، وہ امیر سمجھا جاتا ہے۔ چاہے اس نے دولت کسی بھی طریقے سے کمائی ہو۔ جبکہ پوری دنیا میں کسی آدمی کا کاروباری یا صنعت کار ہونا بھی امارت کی نشانی ہے، چاہے وہ پان کے کھوکے کا مالک ہو یا ملٹی نیشنل کمپنی سنبھالتا ہو۔

۲۰۱۱ء کے موسم گرما میں برطانوی نوجوان نسل نے لندن اور برطانیہ کے دیگر شہروں میں ہنگامہ مچایا اور کئی دکانیں لوٹ لیں۔ جب پولیس نے ۲ر لڑکے گرفتار کیے، تو انھوں نے بتایا ''ہم امیروں کو دکھانا چاہتے ہیں کہ ہم جو چاہیں، کرسکتے ہیں''۔ لیکن نوجوانوں نے ہر اس شخص کو امیر قرار دیا جو دکان کا مالک ہو۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ دنیا بھر میں آمدنی کی تقسیم میں عدم مساوات نے امیر کو منفی معنی دے ڈالے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۰۰۸ء میں امریکی صدارتی امیدوار، جان مکین نے خود کو امیر تسلیم کرنے سے انکار کردیا، حالانکہ وہ کئی عالیشان گھروں کا مالک ہے۔

دوسری طرف دنیا میں امرا کی تعداد بھی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ صرف ایک ڈیڑھ سو سال پہلے ہر ملک میں امیر خال خال ملتے تھے۔ یہ امیر عموماً حکمران طبقے سے تعلق رکھتے اور نواب، جاگیردار یا سردار ہوتے۔ جب وہ چل بسے، تو ان کی اولاد وراثت میں ملی جائیداد کے بل پر امیر بن بیٹھتی۔ پاکستان میں صرف ۵۰ر سال قبل ''لکھ پتی'' بڑی شے سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج پاکستانی شہروں میں ہزارہا لکھ پتی ملتے ہیں۔

امریکا کا رسالہ فوربس ہر سال دنیا کی امیر ترین شخصیات کی فہرست چھاپتا ہے۔ فہرست میں صرف سرمایہ دار، کاروباری اور صنعت کار شامل ہوتے ہیں۔ اگر ان میں حکمران (بادشاہوں وغیرہ)، سرکاری افسروں اور جاگیرداروں کو بھی ملا لیا جائے تو دنیا میں کم از کم ۳ر ہزار کھرب/ارب پتی ضرور موجود ہیں۔

امارت کا ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ صدی قبل صرف حکمران طبقہ ہی امیر تھا۔ لیکن آج ہزارہا کاروباری، صنعت کار اور سرمایہ کار امیر بن چکے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام انگریزی لغات میں لفظ امیر کے معنی بھی بدل گئے ہیں۔ آکسفورڈ انگریزی لغت میں ''رچ'' (Rich) یعنی امیر دیکھا جائے، تو شریف، طاقتور، عظیم جیسے الفاظ سامنے آتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے، ۳۰۰ر سال پرانے ان ایٹلو سیکسن معنی کا اطلاق اب لفظ امیر پر نہیں ہوتا۔ تاہم آگے درج معنی تعریف پر پورے پورے اترتے ہیں: بہت زیادہ دولت رکھنا یا جائیداد رکھنا، بااثر اور پیسے والا۔

ماہرین کی رو سے دنیا بھر میں غریب اور متوسط طبقہ امرا کے خلاف اس لیے اُٹھ کھڑا ہوا کیونکہ وہ اب اپنی ضرورتیں بہ آسانی پوری نہیں کر پا رہے۔ چنانچہ جب تک غریبوں کو ترقی کرنے اور خوشحال ہونے کے مواقع حاصل رہیں، غریب امیر کی تقسیم نمایاں نہیں ہوتی۔

ارفیصد اور ۹۹ر فیصد

ماہ ستمبر میں جب نیویارک میں وال اسٹریٹ قبضہ تحریک کا آغاز ہوا، تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں مقبول ہوگئی۔ اس تحریک سے وابستہ خصوصاً ۲ر اصطلاحیں ''ارفیصد'' اور ''۹۹ر فیصد'' بچوں کی زبان پر بھی چڑھ گئیں۔

۹۹ر فیصد سے مراد دنیا کا غریب اور متوسط طبقہ ہے اور ماہرین کے نزدیک ارفیصد امیر طبقہ ان کا استحصال کر رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، سارے امیر طبقے کو دنیا میں پائی جانے والی ناانصافی، غربت، جہالت وغیرہ کا مرتکب نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ تاہم کئی تحقیقی اطلاعات سے یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ تقریباً ہر ملک میں دولت کا بیشتر حصہ مٹھی بھر لوگوں یعنی امرا کے پاس جمع ہے۔ مثال کے طور پر امریکا کے انتہائی امیر ارفیصد کل امریکی سرمائے میں سے ۲۵ر فیصد کے مالک ہیں۔

برطانیہ کا ایک ادارہ، گلوبل لینگویج مانیٹر ان انگریزی الفاظ کی فہرست جاری کرتا ہے جو ایک سال میں سب سے زیادہ شہرت پائیں۔ ادارے کی تازہ فہرست میں ''آکیوپائے'' (Occupy) یعنی قبضہ سال ۲۰۱۱ء میں سب الفاظ اور انٹرنیٹ میں مقبول ترین لفظ رہا۔ نیز ''ارفیصد'' اور ''۹۹ر فیصد'' بھی پہلے ۱۰ر مقبول ترین الفاظ میں شامل رہے۔ اُمید واثق ہے کہ یہ دونوں لفظ انگریزی لغات کا بھی حصہ بن جائیں گے۔

لیکن لفظ امیر کے مانند درج بالا دونوں الفاظ کی تشریح بھی واضح نہیں۔ بڑی خامی یا خرابی یہی ہے کہ ضروری نہیں، ارفیصد میں شامل تمام دولت مند ہوس ناک، لالچی، پیسے کے پجاری وغیرہ ہوں جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔ پھر خصوصاً ترقی یافتہ ممالک میں متوسط طبقہ بڑا خوشحال ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کے متوسط طبقے کے سامنے تو اسے امیر ہی سمجھا جائے گا۔

ترقی یافتہ ممالک میں دراصل متوسط طبقہ اس بات پر امرا سے ناراض ہے کہ پچھلے ۳۰ر سال میں ارفیصد میں شامل ہر شخص..... سرمایہ دار، کھلاڑی، نجی و سرکاری ملازم، کاروباری، صنعت کار، اداکار وغیرہ کی آمدن میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً ۲۰۰۱ء میں برطانیہ کا مشہور فٹ بال کلب، مانچسٹر یونائیٹڈ اپنے ایک کھلاڑی کو سالانہ ساڑھے ۳ر لاکھ پونڈ ادا کرتا تھا۔ اب یہ رقم ۱۰ر لاکھ تک آ پہنچی ہے۔ اسی طرح امریکہ میں ۲۰۰۱ء میں ایک اچھے بیرسٹر کی آمدن ۲ء۱ر لاکھ ڈالر تھی، وہ اب ۸ر لاکھ ڈالر کماتا ہے۔ غرض یہ حقیقت ہے کہ ارفیصد طبقے کی آمدن پچھلے ایک عشرے میں ہوش ربا طور پر بڑھی ہے۔

لیکن یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کاروبار ایسی شے ہے جو کامیاب ہونے پر سرمایہ بہت تیزی سے دُگنا بلکہ چوگنا

چار علم

حاتم نے کہا ''میں نے ہر علم اختیار کیے اور دنیا کے تمام عالموں سے چھوٹ گیا''

کسی نے پوچھا ''وہ ہر علم کون سے ہیں؟''

حاتم کے جواب دیا ''پہلا یہ کہ میں نے سمجھ لیا ہے کہ جو رزق میری قسمت میں لکھا ہے وہ نہ زیادہ ہوتا ہے نہ کم، اس لیے میں زیادہ کی طلب سے مطمئن ہوگیا۔ دوسرا یہ کہ اللہ کا جو مجھ پر حق ہے، وہ میرے سوا کوئی دوسرا ادا نہیں کرسکتا اس لیے میں مشغول ہوگیا۔ تیسرا یہ کہ ایک چیز مجھے ڈھونڈتی ہے وہ ہے موت، میں اس سے بھاگ نہیں سکتا اور اس کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے۔ چوتھا یہ کہ میرا اللہ ایک ہے جو مجھ سے باخبر رہتا ہے، میں نے اُس سے شرم رکھی اور برے کاموں سے ہاتھ اٹھا لیا۔

کر دیتا ہے۔ لہٰذا کوئی کاروباری محنت، دیانت اور جائز طریقوں کے بل بوتے پر اپنا کاروبار اور سرمایہ انتہائی رفعتوں تک لے جائے، تو یقیناً اس کی ترقی و کامیابی کو حسد یا نفرت نہیں رشک کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے۔ ماہرین بھی کہتے ہیں کہ متوسط و غریب طبقوں کو یہ بات سمجھنی چاہیے۔

بینکار

وال اسٹریٹ قبضہ تحریک کے مظاہروں میں لوگوں نے سب سے زیادہ بینکاروں کو ہی تنقید اور نفرت کا نشانہ بنایا۔ وجہ یہ ہے کہ خصوصاً ترقی یافتہ ممالک میں بینکار وہ شخص ہے جو اس وقت بھی ڈالر کماتا ہے جب معاشی بحران جاری ہو۔ بلکہ تب بینکاروں کا منافع بڑھ جاتا ہے کیونکہ دیوالیہ ہوتے نجی و سرکاری اداروں کو بینکوں کی مدد درکار ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پچھلے ۳ر برس میں مغربی ذرائع ابلاغ میں بینکار کے ساتھ جو ۲ر فعل سب سے زیادہ استعمال ہوئے، وہ ''ڈس گریس'' (Disgrace) یعنی بدنام و رسوا اور ''شیم'' (Shame) یعنی شرمندگی ہیں۔ اسی طرح مغربی اخبارات و انٹرنیٹ میں لفظ بینکار کے ساتھ جو صفت سب سے زیادہ استعمال ہوئی، وہ ''گریڈی'' (Greedy) یعنی لالچی ہے۔

درج بالا ۳ر مقبول اصطلاحوں کے علاوہ طبقہ امرا کے خلاف حالیہ عوامی مظاہروں نے ۲ر اور انگریزی الفاظ کو بھی مشہور کر دیا۔ یہ ''سکوئیزڈ مڈل'' اور ''فیٹ کیٹ'' ہیں۔

سکوئیزڈ مڈل

برطانیہ کے سابق وزیر خارجہ، ایڈمی بینڈ نے سب سے پہلے ''سکوئیزڈ مڈل'' (Squeezed Middle) کی اصطلاح استعمال کی۔ اس سے مراد سخت محنت کرنے والا وہ متوسط طبقہ ہے جس کی اوسط آمدن مہنگائی، تنخواہ منجمد ہونے اور اخراجات بڑھنے کی وجہ سے مسلسل کم ہو رہی ہے، لہٰذا اس کا معیارِ زندگی بھی زوال پذیر ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک سال قبل جب ملی بینڈ نے یہ اصطلاح بولی تھی، تو ان کا مذاق اڑایا گیا لیکن اب امریکہ اور برطانیہ کی بیشتر لغات میں یہ لفظ بالا بیان کردہ معنی کے ساتھ موجود ہے۔ چونکہ پوری دنیا میں متوسط طبقہ ہی سب سے زیادہ مہنگائی سے متاثر ہوا، لہٰذا یہ اصطلاح بہت جلد جڑ پکڑ گئی۔

فیٹ کیٹ

یہ اصطلاح امریکی و برطانوی کارٹونسٹ (مزاحیہ خاکہ نگار) کو مرغوب ہے۔ وہ اپنے کارٹونوں میں موٹی تازی ''فیٹ کیٹ'' (Fat Cat) یعنی موٹی بلی دکھاتے ہیں جو سگار پی رہی ہوتی ہے۔ یہ اصطلاح دراصل ان لوگوں کے لیے مستعمل ہے جو دوسروں کا استحصال کر کے مال بنائیں اور عیش کریں۔

۲۰۰۹ء میں امریکی صدر اوباما نے ان بینکاروں کو موٹی بلی کہا جو خود کو بھاری بھرکم بونس سے نوازتے ہیں۔ تب یہ اصطلاح صرف نجی شعبے کے لیے مخصوص تھی، مگر اب بدعنوان سرکاری افسروں کو بھی موٹی بلی کہا جانے لگا ہے۔

امارت عام لوگوں کی نظر میں

یہ بحث بہت پرانی ہے کہ کیا دولت انسان کو خوشیاں بخش سکتی ہے؟ ایک عام نظریہ یہ ہے کہ اگر آپ کے سر پر چھت ہے، وافر غذا دستیاب اور محبت کرنے والا خاندان موجود ہے، تو آپ امیر ہوئے، چاہے زیادہ دولت نہ رکھتے ہوں۔ دولت بس اتنی ہونی چاہیے کہ آپ آرام و سکون سے اپنے اخراجات ادا کر سکیں۔ اس سے زیادہ دولت پھر لالچ اور ہوس پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ بہت سی اشیا کی طرح دولت بذات خود کوئی خوبی یا خامی نہیں رکھتی، بلکہ اس کا استعمال اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔ چنانچہ جو دولت مند بڑھ چڑھ کر فلاح و بہبود کی سرگرمیوں پر رقم خرچ کرے، وہ معاشرتی ہیرو اور من چاہی شخصیت کہلائے گا اور جو اپنی دولت پر سانپ بن کر بیٹھ جائے، اسے سبھی لوگ نفرت کی نگاہ سے ہی دیکھیں گے۔

پہلا رنگ

اہرامِ مصر سے وقت بھی ڈرتا ہے

مارچ کی روشن صبح تھی۔ ٹیکسی جمعیت الاقاہرہ سٹریٹ پر بھاگی جاتی تھی۔ غزہ ہماری منزل تھی جو کبھی فراعنۂ مصر کا شاہی قبرستان تھا۔ پرانی پڑھی اور سنی کہانیاں گردش میں تھیں۔ عجیب سا تحیر آنکھوں کے زاویوں میں منعکس تھا۔ گاڑی غزہ کے علاقے میں داخل ہوئی۔ ڈرائیور نے بتایا، یہ علاقہ نائٹ کلبوں کے لیے بہت شہرت رکھتا ہے۔ وہاں عمارات خوبصورت تھیں اور عام سی بھی۔

مصریوں کا کہنا ہے، وقت سے ہر چیز ڈرتی ہے لیکن اہرامِ مصر سے وقت بھی ڈرتا ہے۔ دنیا اگر عجائبات کے اعتبار سے دو تین کی گنتی میں آئے تب بھی یہ اہرام سرفہرست ہوں گے۔ ہم پھر صحرا میں پہنچے۔ گو آبادی کا پھیلاؤ اب اس کے لبوں تک پہنچا ہوا ہے پھر بھی اس کی ہیبت کم نہیں ہوئی۔ چند لمحوں کے لیے میں نے بھونچکی سی ہو کر سارا منظر دیکھا اور اپنے آپ سے کہا ''تو یہ ہے اہرام''۔ اخبارات اور رسائل میں شائع ہونے والی تصویروں نے تصورات کا ایک جہاں یادداشتوں میں آباد کر رکھا تھا۔ اسی لیے گنگ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

یہ اہرام دراصل عظیم الشان مقبرے ہیں۔ مصری تمدن کو جب فروغ حاصل ہوا تب قبروں کی شکلیں بدل گئیں۔ آغاز میں قبریں چبوتروں کی صورت میں تھیں، مختلف قد و قامت کی۔ کسی کی اونچائی ۱۰ر سے ۱۳ر میٹر اور لمبائی ۵۰ر میٹر اور کسی کی ۳ر اور ۸ر میٹر۔ یہ چبوترے ہی حقیقت میں مصر کے شہرۂ آفاق اہراموں کے مائی باپ ہیں۔ زوسر (تیسرے خاندان کا فرعون) کو چبوترے پر پرتی

چبوترے بنانے کا خیال مصری تعمیری فن میں انقلاب کا باعث بنا۔ اب یورپی مورخین ان کے بارے میں جو مرضی رائے دیں، فلکیات سے تعلق ثابت کریں، دریائے نیل کو ریت سے بچانے کا کہیں، مگر حقیقت میں یہ قبریں ہیں۔ دھوپ میں دھنک رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ روایتی رنگین پھندنوں سے سجے اونٹ اور مہاریں تھامے شتربان بھی وہیں گشت کرتے سیاحوں کو پھانستے نظر آتے تھے۔ جب قریب گئے تو حیرت کے سمندر میں گر گئے۔ آنکھیں پھٹ پڑیں۔ اس قدر وزنی اور دیوہیکل قسم کے پتھر! ہر پہلو سے ان کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی حیران کن تھی۔ وہ کیا جن تھے یا کوئی ماورائی انسان جنھوں نے انھیں پہاڑوں سے توڑا، اٹھایا اور پھر یہاں تک پہنچا کر ان کی تعمیر میں لگایا۔ قریب کھڑے ایک لڑکے نے بتایا کہ خوفو کے ہرم کی اونچائی تقریباً ۱۳۸ر میٹر ہے۔ پوری عمارت کا پھیلاؤ کوئی ۲۵ر لاکھ مکعب میٹر ہے اور اس میں تقریباً ۳۳ر لاکھ چٹانیں لگی ہیں۔

میرا نچلا ہونٹ بے اختیار میرے دانتوں تلے آگیا۔ شاید یہ حیرت و استعجاب کی ایک اضطراری حرکت تھی۔ اسے بنے کتنی صدیاں گزر گئیں، غالباً ۵ر ہزار برس۔

میرے خدایا! کیا زمینی اور آسمانی آفات نے انھیں نشانہ نہ بنایا ہوگا؟ یہ کتنے موسموں کے تلخ و شیریں سرد و گرم چشیدہ ہیں اور ابھی بھی اسی تمکنت سے کھڑے ہیں۔ سب سے چھوٹا ہرم خوفو (Cheops) کے پوتے مینسرنس (Micerinus) اور درمیانہ اس کے بیٹے سیفرن (Chephern) کا ہے۔

میں نے ان اہرام کو دیکھتے ہوئے سوچا، یہ ہرم ریتلی زمین پر کھڑے ہیں، زمین پر کوئی ایسی علامت نہیں کہ جس سے یہ سمجھا جائے، یہ ٹھوس ہیں، بس جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے انھیں جادو کے زور سے یہاں کھڑا کر دیا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انھیں عجوبہ بنانے میں لاکھوں محنت کشوں کا ہاتھ ہے۔ ان سے بیگار لی گئی۔ ہر ماہ ایک لاکھ آدمی یہ بیگار کرتے۔ پتھر ڈھونے والی سڑک کی تعمیر میں ۱۰ر سال لگے۔ بالیں ہمہ جو بھی ہوا، بکل کے وقت اور پیسے کے بے مہابہ خرچ نے آج کا ایک قیمتی اثاثہ دنیا کے سامنے لا کھڑا کیا جو ڈھیروں ڈھیر کمائی کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔

دفعتاً نپولین آنکھوں کے سامنے آگیا۔ سوچتی رہی نپولین نے تن تنہا خوفو کے ہرم میں رات کیا تجربہ حاصل کرنے کے لیے گزاری تھی۔ کاش وہ اپنے احساسات بیان کرتا۔ اس کے ساتھی ماہرین نے فتح مصر پر اسے بتایا تھا کہ غزہ کے ان اہراموں میں جو پتھر استعمال ہوئے ہیں، ان سے پورے فرانس کے گرد ۱۰ر فٹ اونچی اور ایک فٹ چوڑی دیوار کھڑی کی جا سکتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ لالچ میں ان کی اکھاڑ پچھاڑ میں نہیں لگ گئے وگرنہ فنِ تعمیر کا نادر نمونہ تاراج ہو جاتا۔ میری ساتھی، شانا ہرم کے اندر جانے کے لیے ٹکٹ لینے چلی گئی۔ صحرا میں داخلہ کا ٹکٹ ۵۰ر مصری پاؤنڈ ابھی دے کر آئے تھے، اب ایک اور ٹکٹ کا خرچ ہونے والا تھا۔

اہرام کے ۴ر مثلث پہلو ہیں۔ یہ چاروں پہلو سیدھے شمال، جنوب، مشرق اور مغرب کی طرف ہیں۔ ہر ہرم کا زمینی پھیلاؤ ایکڑوں میں ہے۔ لیکن پتھروں کے ہر ردے پر، پھیلاؤ کم ہوتا جاتا ہے۔ جب اپنی چوٹی کو پہنچے

تو اس پر صرف ایک سل دھرنے کی جگہ رہ جاتی ہے۔

ثنا بھاگی بھاگی آئی اور پھولتے سانس کے ساتھ بولی ''خوفو میں جانے کا ٹکٹ ۱۰۰ مصری پاؤنڈ ہے۔ اس کا دروازہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ صرف کچھ دیر کے لیے کھلتا ہے۔ خوفو کے ہرم میں ہیرے جواہرات اور بہت سی دیگر اشیا دیکھی جاسکتی ہیں۔ اب کیا کریں؟''

''تم خوفو کو چھوڑو، اس کے بیٹے کے ہاں چلتے ہیں۔ اب اسی مہم جوئی میں رہنا ہے کیا، کل کسی اور طرف نکلیں گے۔'' میں نے کہا۔

سیفرن کے ہرم میں اترنے والے راستے کے منہ پر چھتری کی چھاؤں تلے بیٹھا پہریدار بڑا ترش رُو تھا۔ کیمرے موبائل سب اپنے قبضے میں لیتے ہوئے بیگ بھی سنبھال لیے۔ دہانے کے باہر مختلف زمینوں اور رنگا رنگ بولیوں والوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ کچھ اندر سے دھونکنی کی طرح سانس پھلاتے ہوئے توبہ تلا کرتے برآمد ہو رہے تھے۔ باہر والے اس مہم جوئی میں سرخرو لوٹنے والوں سے احوال سنتے تھے۔ ساتھی نے ہاتھ کھڑے کر دیے تھے مگر مجھے تو بالی عمر والے تجربے کرنے کا خاصا شوق تھا۔ سیڑھیوں میں چند لمحوں کے لیے سوچا بھی کہ اب جوانی دیوانی پاس نہیں اور اندر سے آنے والے کچھ حوصلہ افزا داستان بھی نہیں سنا رہے مگر نہیں جی، چلبلا من مہم جوئی پر مائل تھا۔

اللہ کا نام لے کر ڈھلانی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ دروازے میں داخلہ ہی جھکاؤ کے ساتھ ہوا۔ پاؤں پر زور پڑا اور لگا کہ تڑخ جائیں گے۔ لمحے بھر کے لیے رُک کر اپنے توازن کو متوازن کیا۔ پھر سوچا کہ واپس لوٹ جاؤں تو ہیں بھی پھیریں پر آگے آگے چلنے والے دو بوڑھوں نے تقویت دی۔ آیت الکرسی لبوں پر رکھی اور آگے بڑھی۔ شروع میں ٹیوب لائیٹس تھیں، تھوڑا سا آگے چلنے کے بعد اندھیرا تھا۔ آگے پیچھے لوگوں کا چلنا اور آنا جاری تھا۔ تھکن اور گھبراہٹ تھی۔ پل بھر کے لیے پھر سوچا، خطرہ نہ لوں لیکن پتا نہیں کس جذبے کی کشش تھی جس نے قدم آگے بڑھا دیے۔ پانی کے گھونٹ سے لبوں کو تر کیا اور آگے بڑھی۔ خدا گواہ ہے، زندگی میں اپنی کسی حماقت پر اتنا افسوس نہیں ہوا ہوگا جتنا اس پر ہوا۔ وزن برقرار رکھنے میں سخت مشکل تھی۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ درپیش تھا۔

آخر کچھوے کی طرح رینگتا وجود کھڑا ہوگیا۔ شکر کا لمبا سانس بھرا اور سیدھی ہوگئی۔ اسے گودام کہا جاسکتا تھا۔ وہ جیل نما چھوٹا سا کمرا تھا جس کے بائیں ہاتھ لوہے کی سلاخیں تھیں۔ وہاں ذرا گھٹن کم تھی۔ میں نے پھر پانی پیا۔ متلی کی سی کیفیت تھی۔ شاید خون کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اب خدا سے دعا ہی کی جاسکتی تھی۔ آگے پھر سرنگ شروع ہوگئی۔ چوبی جنگلا وہاں بھی نہیں تھا۔ بس ہاتھ دیواروں کو اندھوں کی طرح تھامتے تھے۔

پھر ایک اور پڑاؤ آگیا۔ وہاں سورج کی روشنی تھی۔ یہ روشنی کہاں سے آتی تھی، میں کوشش بسیار کے باوجود سراغ نہیں لگا سکی۔ وہاں کچھ ہوا بھی تھی اور راستہ بھی کچھ لمبا تھا۔ یادداشتوں میں اہرام پر پڑھا ہوا کچھ میرے سامنے آیا کہ ہر ہرم کے اندر ۲ سوراخ کیے جاتے تھے۔ ان سے روشنی کا حصول مقصد نہیں تھا بلکہ یہ فرعون کی روح کی آمدورفت میں سہولت کے لیے تھا۔ مصری عقیدے کے مطابق ہر مقبرے میں روح کے لیے راستہ رکھنا بہت ضروری تھا۔ اب اوپر کی جانب چڑھائی تھی۔ تھوڑا سا چڑھنے کے بعد مستطیل کمرا سامنے آیا۔ کمرے کی چھت خاصی اونچی تھی۔ کمرے کے وسط میں پہریدار کھڑا تھا، سفید پگڑی اور خاکستری چغہ پہنے۔ ایک قدم نیچے اُتر کر عین درمیان میں گہرے گندمی پتھر کا تابوت پڑا تھا۔ ساتھ اس کا ڈھکن تھا۔ دیواروں پر موٹی سیاہ لکھائی سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ یہ یقیناً غلیفی خط کی تحریریں ہوں گی۔

واپسی پہلے سے بھی زیادہ اذیت ناک تھی۔ جب باہر نکلی تو چند لمحوں کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے ''گوڈے'' ٹوٹ گئے ہیں۔ انھیں بمشکل گھسیٹ کر لائی۔

(اہرام مصر سے وقت بھی ڈرتا ہے۔ سلمیٰ اعوان)

ملٹن کا گھر

ہچکھرو ہوائی اڈے پر بڑی رونق تھی۔ سرکاری کارروائی سے فارغ ہو کر باہر آئے تو نبیل اور ثناء کو اپنا منتظر پایا۔ کار میں بیٹھ کر نبیل کے گھر، ملٹن کینز (Milton Keynes) کی جانب روانہ ہوئے۔ ہاسٹہ موڑ سے تقریباً ایک گھنٹے کا سفر طے کر کے منزل پر پہنچے۔ یہ شہر انگریزی کے ممتاز اور کلاسیکی شاعر جان ملٹن سے منسوب ہے۔ ملٹن کینز کا لفظی مطلب ہے ''ملٹن کا گھر''۔ یہ شہر ۱۹۷۰ء کے بعد بطور لندن کے متبادل تعمیر ہوا۔ لندن تیز رفتاری سے پھیلا تو ہر طرف آبادی ہی آبادی نظر آنے لگی۔ لوگوں کے لیے مکانات حاصل کرنا ممکن نہ رہا تو لندن کے قریب یہ نیا شہر بسایا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہاں بسنے والے روز مجھ لندن جائیں اور شام کو واپس آجائیں، صحت اور تفریح گھر پر موجود ہو۔ راستہ ایسا تیار کیا گیا کہ بس میں ایک گھنٹہ اور تیز رفتار ٹرین کے ذریعے ۴۵ منٹ میں سفر تمام ہو جائے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں بستی بستے بستے بستی ہے، بستی بسنا کھیل نہیں۔ رقوم کی کمی کی وجہ سے منصوبہ نامکمل چھوڑ دیا گیا، اسی لیے آبادی مختصر ہے۔

دوسرے دن ملٹن کینز کی سیر کو نکلے، شہر اور جنگل کا ایسا حسین امتزاج تھا کہ شہر کہیں کہ جنگل، کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ ہر طرف درخت ہی درخت اور خوب گھنے کہ اگر راستہ نہ ہوتا تو گزرنے کا سوال نہیں تھا۔ چلتے چلتے شہر کا خوب صورت خریداری مرکز آگیا۔ ایک کلومیٹر سے زیادہ رقبے پر پھیلا یہ خریداری مرکز مکمل طور پر چھت کے نیچے ہے۔ یہاں بارش خوب ہوتی ہے، خاص کر موسم سرما میں، اس لیے سردی یا برف باری اور بارش سے بچاؤ کا یہ طریقہ اپنایا گیا۔ برطانیہ کے اکثر شہروں میں ایسے ہی خریداری مراکز ہیں۔ گو اتوار کی وجہ سے زیادہ تر دکانیں بند تھیں، لیکن ہم جب بھی یہاں آئے، لوگوں کو خریداری کرتے پایا۔

''گوروں کو خریداری کا جنون ہے۔ اپنی پوری تنخواہ کے علاوہ کریڈٹ کارڈ کی رقم بھی خریداری پر لگا دیتے ہیں۔'' ثناء نے بتایا۔

''یہ گھر پر کس وقت ہوتے ہیں۔'' ہم نے پوچھا۔

''صرف سوتے وقت۔'' جواب ملا۔

''خوب! اسی لیے ان کے گھر چھوٹے اور تفریحی و خریداری کے مقامات کشادہ اور زندگی سے بھرپور ہیں۔ نئے تعمیر شدہ مکانات تو پاکستانی شہری گھروں کے مقابلے میں ''بچے'' ہیں۔ ملٹن کینز میں مکانات جنگل کاٹ کاٹ کر تعمیر کیے گئے ہیں۔ گو یہ پہاڑی مقام نہیں لیکن لوازمات سارے ''ہل اسٹیشن'' کے ہیں۔ یعنی بادوباراں کا ہر دم آنا جانا، درختوں کے سلسلے، ہریالی، نہ ختم ہونے والے نظارے، چشمے، جھیلیں سب ہی موجود۔ ساتھ ایک انتہائی جدید تیس ہزار شائقین کے لیے بنا ہا کی اسٹیڈیم، شاندار کتب خانے، یونیورسٹی، کالج اور ۶۵ ہزار سے زیادہ افراد کا کلچرل اسٹیڈیم۔ شاید ہی کوئی ایسی بین الاقوامی کمپنی ہو جس کا دفتر موجود نہ ہو۔'' ''لیکن اس کے باوجود یہ سٹی ان فارسٹ (جنگل میں شہر) کے طور پر بنایا گیا ہے۔'' نبیل نے بتایا۔

ہم ناشتا اکثر ٹی وی لاؤنج میں کرتے کہ سامنے ایک وسیع سرسبز میدان تھا۔ اکثر دیکھتے کہ صبح ہی سے کچھ گورے کسی کام میں مصروف ہیں۔ معلوم ہوا کہ پرائمری سکول کے بچوں کے لیے فٹ بال کا میدان تیار ہو رہا ہے۔ علاقے کا ہر شہری اپنا کچھ وقت رضا کارانہ طور پر وہاں لگاتا۔

شہر اور جھیل کے بیچوں بیچ واقع ایک جھیل، کلڈیسوٹی (Caldecote) نہ صرف شہریوں کو فراہمی آب کا قدرتی

ذریعہ ہے، بلکہ تفریح، جاگنگ اور کچھ لوگوں کے لیے عبادت کی جگہ بھی ہے۔ شفاف پانی سے لبالب بھری اس جھیل کے اردگرد گھاس سے ڈھکی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں، جن پر کوہ پیمائی کے ابتدائی اسباق لیے جاسکتے ہیں۔ برف رانی سے لے کر تیراکی اور کشتی چلانے تک، غرض کون سا شوق یہاں پورا نہیں کیا جاسکتا۔ جھیل کے اردگرد کیا جانے والا سب سے خوش گوار عمل چہل قدمی اور سیر ہے۔ کچھ دور ایک بدھ مندر ہے، جس کے روح رواں جاپانی بھکشو ہیں۔ بدھ مندر، جاپانی بھکشو اور ملٹن کینز کی یہ جدید و قدیم طرز کی جھیل کا تعلق سمجھ میں نہیں آیا۔

''چلیں وہاں چل کے دیکھ لیتے ہیں۔'' ثناء نے کہا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ بدھ مندر کئی بڑے بڑے کمروں اور ہالوں پر مشتمل ہے۔ ایک چھوٹا سا عجائب گھر اس کے ساتھ تھا جس میں مندر کی تاریخ محفوظ تھی۔ پتا چلا کہ یہ مندر جدید شہر کی تعمیر سے پہلے ہی وجود میں آچکا تھا۔

ہم اکثر ملٹن کینز میں بے مقصد اکیلے گھومنے نکل جاتے۔ جس طرف اور جتنی دور جاتے جنگل، چشمے اور ہریالی ہمارے ساتھ ساتھ چلتے۔ دن بھر خاموشی رہتی۔ سکوت، پرندوں کی چہچہاہٹ، چاروں طرف رنگ برنگے قدرتی پھول، اس طرح سجے گویا باقاعدہ کیاریوں پر کیاریاں بنادی گئی ہوں۔ سڑکیں، درخت اور نیلے کاٹ کر بنائی گئی ہیں۔ سائیکل کا استعمال اتنی فراوانی سے کہ ۲۰۰۰ء سے قبل کے چینی شہروں کا گمان ہوتا۔ جدھر نکل جاتے لگتا کہ تفریحی مقام ہے۔ چھوٹی چھوٹی آبادیاں، خاصے فاصلے پر جنگل کے درمیان جابجا نظر آتی ہیں۔

ثناء بار بار ہم سے اصرار کرتی رہی کہ وہاں کا کتب خانہ ضرور دیکھا جائے۔ سو ایک دن ہم اور زاہدہ اس کے ساتھ چل پڑے۔ جس عمارت کے آگے گاڑی رکی وہ وسیع، بلند و بالا تھی۔ لوگ کافی بڑی تعداد میں آجا رہے تھے۔ بورڈ پر نظر ڈالی تو پتا چلا یہاں کا مرکزی کتب خانہ ہے۔ ۳ر لاکھ سے بھی کم آبادی کے اس شہر میں اتنے کتابوں کے شوقین، کچھ یقین نہ آیا تو ہم نے پوچھا ''کوئی میلہ تو نہیں لگا مفت کتابیں تقسیم کرنے کا''، ہمیں بتایا گیا ''نہیں روزانہ لوگ اسی طرح یہاں آتے ہیں۔''

۴ر منزلہ عمارت میں کم و بیش بیس بچیس لائبریرین اور لاکھ سے اوپر کتابیں۔ ہم نے کچھ کتابوں پر نظر ڈالنا چاہی تو یاد آیا کہ عینک تو گھر بھول آئے ہیں۔ لائبریرین نے ہماری پریشانی دیکھی تو کہا ''آپ اپنی پسند اور نمبر کی عینک لے کر پڑھ لیں۔'' پتا چلا کہ ہر نمبر کی عینک وہاں رکھی ہے۔ آپ پڑھنے کے لیے عارضی طور پر عینک بغیر قیمت کے استعمال کر سکتے ہیں اور چاہیں تو نئی عینک خرید لیں۔

یہاں کا خلائی مرکز (Space Centre) اپنی طرز تعمیر میں یکتا ہے۔ یہ ایک انتہائی وسیع و عریض عمارت ہے جس کا گنبد پوری عمارت پر محیط ہے۔ دیکھ کر خیال آتا کہ گنبد کس چیز پر ٹھہرا ہوا ہے۔ اس قدر تفریحات گنبد کے نیچے جمع کر دی گئی ہیں کہ حساب ممکن نہیں۔ نبیل ہمیں بار بار وہاں لایا، لیکن ساری تفریحات پھر بھی نہ دیکھ سکے۔ تمام اندرونی کھیل تھے۔ جن میں خلا میں تیراکی ایک حیران کن تجربہ تھا۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ ۷۰ر میٹر طویل برف کا پھسلن تختہ (Snow Ski Slope) رہا۔ نبیل اور ثناء نے وہاں برف پر پھسلنے کا

غیر معمولی مظاہرہ کیا اور ہم سمیت تمام تماشائیوں سے داد وصول کی۔ خلائی مرکز اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ وہ ملٹن کینز کا نشانِ علامت (لینڈ مارک) بن گیا اور ہر جگہ سے نظر آتا ہے۔

ایک دن بیٹھے بٹھائے نبیل نے کہا، چلیے آپ کو سفاری پارک کی سیر کرا لاؤں۔ وہ دن سفاری پارک

برطانیہ کا سب سے بڑا پارک ہے۔ کئی کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ صدر دروازے پر ٹکٹ لینے کے بعد کوئی دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تو ایک اور بڑا دروازہ آیا۔ معلوم ہوا کہ یہاں سے چرند پرند کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ جس طرف بھی نظر دوڑائی مختلف جانور نظر آئے۔

''ذرا ان بندروں کو دیکھیے! ارے جلدی سے کار کا شیشہ چڑھالیں۔'' زاہدہ چیخیں کہ ایک بندر درخت سے اچھل کر ہماری کار کی چھت پر سوار ہوگیا تھا۔ موسم بے حد خوشگوار تھا، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ جانور و پرندے پوری ترنگ میں تھے۔ سماں بالکل گھنے جنگلوں کا سا، لیکن راستہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ کوئی دشواری نہ ہو۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ چڑیا گھر والا دیکھتا اور تاکتا نہیں تھا، نہ بندر ہمیں گھور رہے تھے نہ ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چمپینزی کو دیکھ رہے تھے۔ معاملہ مہمان اور میزبان کا تھا۔ جانور آزادی سے پھر رہے تھے۔ ہم اپنے انداز میں رک رک کر بغور ہر ایک کا جائزہ لیتے رہے۔ کئی میل یوں ہی کار میں گھومتے گزر گئے۔ کہیں جھیل تو کہیں چشمے۔ بطخیں تیر رہی ہیں تو ہرن پانی پی رہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ نہ وہ لوگوں سے نامانوس، نہ لوگ ان سے خوفزدہ۔ نبیل نے گوروں کی فطرت پر روشنی ڈالی ''جنگلی حیات کو نقصان پہنچانا نہ صرف جرم ہے، بلکہ یہ لوگ ان میں گھل مل کر خوش رہتے ہیں۔''

''شیشے چڑھا لیں'' نبیل نے اعلان کیا۔ ہم ایک بڑے دروازے کے نزدیک تھے۔ اس نے بتایا کہ اب ہم شیر چیتوں کے گھر جا رہے ہیں۔ ایک وادی میں داخل ہوئے اور جو دائیں طرف نظر ڈالی ''ارے دس گیارہ شیر''، ''وہ دیکھو دس بارہ چیتے اور بچے'' زاہدہ چلا اٹھیں۔ مزید آگے بڑھے تو دیکھا کہ ببر شیر کا ایک بڑا خاندان، جس میں کم از کم پندرہ ''افراد'' ہوں گے، سڑک کے درمیان قیلولہ فرما رہا ہے۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ ایک فورویلر ڈبل کیبن گاڑی ہمارے سامنے ٹیلے سے اتری اور شیروں کی جانب بڑھی۔ خیال تھا کہ شیر سدھانے کے ماہر بیٹھے ہوں گے، لیکن یہ دیکھ کر حیرت میں ڈوب گئے کہ دو اٹھارہ بیس سال کی لڑکیاں اگلی نشست پر براجمان ہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے شیروں کے خاندان کے قریب گئیں اور راز و نیاز کے انداز میں کچھ کہا، کچھ اشارے کیے اور شیر پُراعتماد انداز میں اٹھے، راستہ چھوڑا اور قریب ہی گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہماری گاڑی شیروں کے بالکل قریب سے گزری۔ جنگل کے درمیان ایک بڑا سا ہوٹل بنا ہوا تھا، جہاں کھانے پینے کی اشیا دستیاب تھیں۔ قیمتیں انتہائی مناسب۔ جانوروں کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد شام کو ہم گھر کی جانب چل پڑے۔ اس کے ساتھ ہی ہماری برطانیہ کی سیاحت بھی تمام ہوئی۔

(ملٹن کینز، جنگل میں منگل۔ منور مرزا)

تیسرا رنگ

دبئی کا مصنوعی حسن

ہم اسلام آباد سے تین گھنٹے پی آئی اے کی لاجواب پرواز میں دبئی ہوائی اڈے اترے۔ وہاں پاکستانی مسافروں پر عموماً توجہ نہیں دی جاتی چنانچہ ہماری بھی کسی نے راہنمائی نہ کی۔ ہم ٹرینل ون کے بجائے تقریباً ۲ میل پیدل چلتے ہوئے کسی دوسرے ٹرینل میں جا نکلے۔ دبئی ہم ۱۹۷۰ء سے آجا رہے ہیں لیکن ہر بار پہلے سے مختلف نظر آتا ہے۔ بلند و بالا عمارتیں، صفائی اور سبزہ دبئی کی خوبصورتی کہلاتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ مصنوعی سا لگتا ہے۔ اللہ نے جس طرح کے مناظر دبئی اور عرب ملکوں کو دیے ہیں، ان کے مطابق وہاں ریت اور نخلستان ہی خوبصورتی ہے۔ اُس سبزے اور صاف ستھرے باغوں اور پارکوں کا کیا فائدہ جس میں انسان ہی دیکھنے کو نہ ملے؟ اس لیے کہ گرم موسم میں کون باہر نکل کر باغوں اور پارکوں کی سیر کرے گا؟

لیکن ہر بار دبئی میں کسی نہ کسی مصنوعی ترقی میں اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس بار ہم نے میٹرو ٹرین دیکھی جو پچھلے سال نہیں تھی۔ میٹرو شاید غریب مسافروں کی سہولت کے لیے بنائی گئی مگر دبئی میں غریب بندہ کہاں دکھائی دیتا ہے؟ غریب تو ریگستان میں ہوتا ہے یا پھر شہر میں سو منزلہ بلند عمارتوں کی تعمیر میں دن رات لگا کر مزدوری کرتا ہے۔

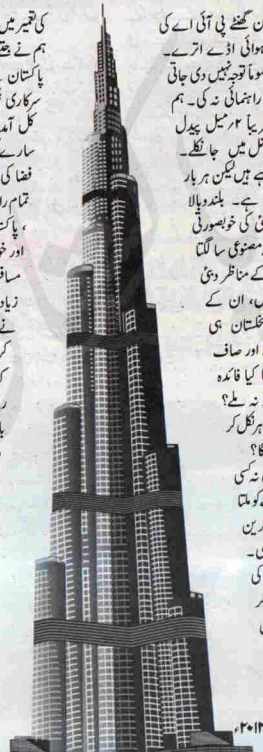

ہم نے جتنے بھی ٹیکسی ڈرائیور دیکھے ان کا تعلق پاکستان کے صوبہ پختون خوا سے تھا۔ وہ سرکاری ٹیکسیاں چلاتے ہیں جس پر انھیں کل آمدنی کا ۳۰ر فیصد ملتا ہے۔ تقریباً سارے ٹیکسی ڈرائیوروں کا مزاج دبئی کی فضا کی طرح خشک اور گرم ہو چکا ہے۔ وہ تمام راستے وہاں کی مہنگائی کا رونا روتے، پاکستانی بدعنوانیوں کی کہانیاں سناتے اور خود بھی جہاں تک ممکن ہو سکے، مسافروں کو چکر دے کر زیادہ سے زیادہ کرایہ بٹورتے ہیں۔ اس بار ہم نے سٹی سینٹر دبئی سے خلیج سینٹر کی ٹیکسی کرائی تو ڈرائیور نے جھوٹا بہانہ بنایا کہ اس کا وقت ختم ہو چکا اور وہ جا رہا ہے۔ ہم نے پوچھا، اگر یہ بات سچ ہے تو اس نے ٹیکسی کیوں روکی؟ وہ بیزاری کے انداز میں جانے کو تیار ہوا اور بولا، آپ جانتے ہیں کہ خلیج سینٹر کہاں واقع ہے؟ ہم نے جواب دیا، نہیں۔ تب اس نے ہمیں یوں بتایا جیسے احسان کر رہا ہو۔ سٹی سینٹر سے خلیج سینٹر کا کرایہ ۸/ سے ۱۰/ درہم بنتا ہے لیکن ڈرائیور نے لمبا راستہ اپناتے ہوئے ہمیں خلیج سینٹر پہنچایا اور ۲۹/ درہم کرایہ وصول کیا۔ ہم نے اترتے وقت اسے بتایا کہ ہم خلیج سینٹر کا راستہ جانتے تھے مگر اسے آزمانے کے لیے اسے نہیں بتایا تھا۔ اسے نصیحت کی کہ بے ایمانی سے کمایا ہوا پیسا کبھی ہضم نہیں ہوتا اور کسی دوسرے راستے سے نکل جاتا ہے۔

دبئی میں اصل باشندے آٹے میں ڈالنے کو بھی نہیں ملتے۔ کسی زمانے میں یہاں پاکستانی باشندوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی، پھر بھارتی اور ان کے بعد چینی اور کوریائی باشندوں کی بھرمار ہو گئی۔ پاکستانی باشندے زیادہ تر ٹیکسی چلاتے اور ان کے بعد زیادہ تر مزدوری کرتے ہیں۔ بھارتیوں کے پاس کپڑے اور تیار شدہ ملبوسات کا کاروبار ہے۔ ہوٹل کے کاروبار میں بھی ان کا کافی عمل دخل ہے۔ کوریائی اور چینی زیادہ تر دکانوں اور اسٹوروں پر نظر آتے ہیں۔ تعمیرات کے بڑے بڑے ٹھیکے جرمن اور برطانیہ اور بھاری مشینری کا کام امریکہ اور دیگر یورپی ممالک کے ہاتھ میں ہے۔ ہوائی اڈے پہ کسٹم اور امیگریشن پہ امارات کے جوان لڑکے اور لڑکیاں نظر آتی ہیں جبکہ ٹکٹنگ اور بورڈنگ کا کام ایشیائی اور مزدوری کا کام بھارتی اور پاکستانی مزدوروں کو ملا ہوا ہے۔

دبئی کو وہاں کے شیخوں نے امریکی اور یورپی سیاحوں کے لیے اتنا خوبصورت اور حسین بنایا ہے کہ امیر اور گرم آب و ہوا کا ترسا سفید فام وہاں ٹھہرنا پسند کرتا ہے۔ برج العرب ہوٹل جہاں ایک رات کا کرایہ تقریباً ۳/ لاکھ روپے ہے، اس میں قیام کرنا اور اسی طرح پام آئی لینڈ میں ذاتی گھر بنانا گھر پتی اشرف الخلوقات کی پسندیدہ خواہش اور پسندیدہ مشغلہ ہے۔ پام آئی لینڈ جیسے مصنوعی جزیروں کی طرح دبئی کا مصنوعی سکیننگ سینٹر، شاپنگ مال آف ایمریٹس اور دبئی بزنس ٹاور شہر کے مصنوعی حسن میں اضافے کا موجب ہیں۔

دبئی میں کچھ چیزیں ہم جیسے پاکستانیوں کو بھی حیرت زدہ کر دیتی ہیں کہ شہر میں سوائے مخلوق کے کسی شے میں ملاوٹ پائی نہیں جاتی۔ خالص غذا کھانے سے اکثر پاکستانی اور بھارتی یہاں آتے ہی بیمار ہو جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کا معدہ خالص غذا کا عادی ہوتا ہے۔

دبئی میں خاموشی بھی بہت ہے۔ لوگ چپ چاپ گھومتے اور واپس چلے جاتے ہیں۔ سیاہ فام اور سفید فام خاموشی سے اپنا اپنا کام کر جاتے ہیں۔ جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لیے کہ لوگ شریف ہیں بلکہ یہاں کا قانون سخت اور سب کے لیے برابر ہے۔ یہاں سوائے شیخوں کے کوئی ''اہم شخصیت'' نہیں ہوتا۔

مانا کہ دبئی میں سب کچھ ہے سوائے غربت کے، مگر حیرت کی بات ہے کہ اتنا پیسا ہونے کے باوجود دبئی میں کوئی چیز اس کی اپنی نہیں۔ اللہ نے انھیں اتنا نوازا ہے کہ ساری دنیا دن رات ان کی خدمت کرنے میں مصروف دکھائی دیتی ہے۔ ہمیں اللہ نے تیل کی دولت سے تو نہیں نوازا مگر غربت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ اسی غربت میں ہم کرکٹ، سنوکر، اسکواش کے عالمی چیمپئن بھی رہے۔ ہمارے ڈاکٹر، انجینئر اور کھلاڑی دنیا بھر میں مانے جاتے ہیں۔ ہم اتنے دریا دل ہیں کہ فلسطین یا کسی اور عرب ملک کے لیے جلوس کی شکل میں سڑکوں پر ڈنڈے کھاتے ہیں مگر وہی عرب ہمیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

(فاروق قیصر)

حیدرآباد دکن میں چند روز

حیدرآباد کے لیے پرواز روانہ ہونے میں کچھ وقت تھا۔ لہٰذا ہم نے رات کا کھانا دہلی ہوائی اڈے پر ہی کھایا۔ کھانے کا ذائقہ تقریباً پاکستانی کھانوں جیسا تھا۔ ہم رات دو بجے حیدرآباد پہنچے۔ ہوائی اڈے سے ہم نے ٹیکسی لی اور رہائش گاہ پہنچے۔ ثناء خلیق اور ثناء فاروق کا قیام انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی کے گرلز ہوسٹل میں تھا۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی مرکزی عمارت کا نام بھارتی صدر عبدالکلام سے منسوب ہے جو ان کی خدمات کا اعتراف ہے۔ صدر عبدالکلام بھارت میں سب سے زیادہ عزت پانے والی شخصیات میں شامل ہیں۔

جس مہمان گھر (گیسٹ ہاؤس) میں میرا قیام ہوا، وہ انفوسس کی حدود میں واقع ہے۔ انفوسس بھارت میں ایک بڑی سافٹ ویئر کمپنی ہے۔ ضروری کارروائی کے بعد حفاظتی عملے نے مجھے انفوسس کی حدود میں داخلے کے لیے عارضی شناختی کارڈ بنا دیا۔ دروازے پر سخت حفاظتی انتظام تھا۔ انفوسس کی صاف ستھری عمارت ایک بہت بڑی عمارت کا حصہ ہے جس میں رہائش، کھانے، جمنیزیم اور سوئمنگ پول وغیرہ کی سہولتیں بھی موجود ہیں۔ یہ جگہ آئی ٹی کے ماہرین کی پیشہ ورانہ ضروریات کا احاطہ بخوبی کرتی ہے۔ میں نے پہلے روز ناشتا اسی عمارت کے ریستوران میں کیا۔

انفوسس میں قیام کے دوران مجھے آئی ٹی کے نوجوان ماہرین کو کام کرتے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے کمروں میں گروہوں کی صورت کام کرتے ہیں تاکہ رابطہ اور مشورہ کرنے میں آسانی رہے۔ اُن پُرعزم نوجوانوں کی آنکھوں میں بھارت کے مستقبل کی جھلک دیکھی۔ اگرچہ کمروں کے باہر صوفے موجود تھے مگر میں نے کسی کو وہاں بیٹھ کر گپ شپ میں وقت ضائع کرتے نہیں دیکھا۔ نظر آرہا تھا کہ ان لوگوں کو خوب احساس ہے کہ کسی قوم کے بنانے میں سائنس و ٹیکنالوجی کی اہمیت کیا ہے۔ انفوسس میں کئی شعبے کام کرتے ہیں۔ مثلاً آئی ٹی، ایروسپیس، حیاتیاتی علوم وغیرہ۔ اس کی آمدنی جو ۲۰۰۵ء میں ۵۹۲ء۱ بلین ڈالر تھی، ۲۰۰۶ء میں بڑھ کر ۱۵۲ء۲ بلین ڈالر ہوگئی۔ دنیا بھر میں کمپنی کے ملازمین کی تعداد ۶۰ ہزار سے زائد ہے۔ حیدرآباد میں اس کی عمارت ۳۱ ہزار مربع فٹ پر مشتمل ہے۔ یہ عمارت ۲۰۰۳ء میں ۹ ماہ کی غیر معمولی مدت میں تعمیر ہوئی۔ انفوسس ڈویلپمنٹ سینٹر معاشرتی بہبود کے کئی منصوبے چلاتا ہے جن میں طبی کیمپ، سکولوں کے لیے عمارتوں کی تعمیر اور غریب عورتوں میں سلائی مشینوں کی تقسیم وغیرہ شامل ہیں۔ انفوسس کی کامیابی دیکھتے ہوئے خیال آیا کہ پاکستان میں بھی ایسے ہی صنعتی کمپلیکس تعمیر کرنے چاہئیں۔

انفوسس ٹرانسپورٹ آفس کے ذریعے حیدرآباد شہر کی سیر کرنے کے لیے ایک ٹیکسی کرائے پر لی۔ میں مقامی لوگوں اور ان کے ثقافتی ورثے کا براہِ راست مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ حیدرآباد اب بھی جنوبی ہند کا مسلم اکثریتی شہر ہے۔ یہاں کئی سو برس مسلم حکمرانوں نے حکمرانی کی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ہندوستان نے حیدرآباد پر قبضہ کرلیا۔ اس شہر میں بے شمار مساجد ہیں۔ ہم جمعہ کو شہر کی سیر کرنے نکلے اور شہر کی فضائیں خطیب صاحبان کی آوازوں سے گونج رہی تھیں۔ پرانے شہر میں بعض محلوں کی ۱۰۰ فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ مسلمان عورتیں اسی طرح مکمل طور پر باپردہ ملبوس تھیں جیسا کہ افغانستان میں دکھائی دیتا ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں باپردہ عورتوں کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ بہرحال بھارت کا یہ صرف ایک روپ ہے۔ اس کی تصویر مختلف مذاہب اور ثقافتوں سے مل کر مکمل ہوتی ہے۔ تمام گروہ عموماً ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں تاہم بعض مستثنیات بھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ صرف جمہوریت کی وجہ سے ممکن ہوا جس کی جزیں عوام میں ہیں۔ مختلف مذہبی اور ثقافتی گروہوں کو جوڑ رکھنے والی واحد قوت جمہوریت ہے۔

ہم سب سے پہلے قطب شاہی حکمرانوں کے مزارات کے پاس رُکے۔ یہ مقبرے چوکور ساخت کی عمارتوں پر مشتمل ہیں جن کے اوپر گنبد اور چاروں جانب محرابیں بنی ہیں۔ چھوٹے مقبروں کی گیلری ایک منزل جبکہ بڑوں کی ۲/منزلوں پر مشتمل ہیں۔ ہر مقبرے کے وسط میں قبر کے اوپر تابوت بنا ہوا ہے۔ گنبدوں پر اصلاً نیلی اور سبز ٹائلیں نصب تھیں مگر اب کہیں کہیں ان کی محض نشانیاں باقی ہیں۔

ہماری دوسری منزل گولکنڈہ کا قلعہ تھی۔ یہ قلعہ تیرھویں صدی میں تعمیر کیا گیا۔ بعد میں قطب شاہی حکمرانوں نے اس جگہ کو اپنا صدر مقام بنایا تو انھوں نے قلعہ ازسرِنو تعمیر کیا۔ انھوں نے اس میں یادگاریں اور خوبصورت پارک بنائے اور ایسا ضلعی نظام قائم کیا جس کے ذریعے صدر دروازے پر بجی تالی کی آواز بھی قلعے کے اندر تک سنائی دیتی۔ تاریخ میں اپنی فطری دلچسپی کے باعث میں قلعے کی شان و شوکت سے مبہوت ہوگیا اور دیر تک ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم الشان ماضی اور برصغیر کی شان و شوکت میں مسلم حکمرانوں کی کوششوں کے متعلق سوچتا رہا۔

اگرچہ ہم مکہ مسجد اور سالار جنگ عجائب گھر دیکھنے سے قاصر رہے مگر یہ جگہیں سیاحوں کے لیے باعثِ کشش ہیں۔ مکہ مسجد کی تعمیر اگرچہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے شروع کروائی تھی لیکن اس کی تکمیل مغل بادشاہ اورنگزیب کے ہاتھوں سترھویں صدی میں ہوئی۔ یہ جزواں شہروں میں سب سے بڑی مسجد ہے جس میں ۱۰/ہزار نمازی نماز ادا کرسکتے ہیں۔ مسجد کی تعمیر میں کچھ اینٹیں مکہ مکرمہ سے منگوا کر بھی استعمال کی گئیں۔

مجھے ٹی وی رپورٹ کے ذریعے بنگلور یونیورسٹی کے اس سال گریجوایٹ ہونے والے طلبہ کے نتائج سننے کا موقع ملا۔ اس میں حیران کن بات یہ تھی کہ پہلی ۱۰/پوزیشنیں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی مسلمان طالبات نے حاصل کیں۔ پوزیشن لینے والی ایک طالبہ نے انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ اگر مواقع مہیا کیے جائیں تو مسلمان طلبہ و طالبات بہترین کارکردگی دکھاسکتے ہیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ تمام تر ترقی کے باوجود بھارتی معاشرے کو کئی مسائل کا سامنا بھی ہے۔ پولیس کلچر اور لوگوں کا عمومی رویہ ہمارے جیسا ہی ہے۔ غریب لوگوں کی انصاف تک رسائی نہیں ہوتی۔ پاکستان اور بھارت میں ذرائع ابلاغ لوگوں میں بیداری اور انفرادی حقوق کا احساس پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے، دونوں طرف عوام میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ پاکستان اور بھارت کی حکومتوں اور عوام کے درمیان تعلقات میں بہتری آنی چاہیے۔

(حیدرآباد دکن میں چند روز۔ ڈاکٹر حافظ فاروق احمد)

پانچواں رنگ

برطانیہ سے پاکستان تک بذریعہ سڑک

میں برک شائر، برطانیہ کے شہر نیوجرسی میں رہائش پذیر اور ایک نجی موبائل فون کمپنی سے بطور انجینئر منسلک ہوں۔ ۲۰۰۵ء میں تعلیم کی غرض سے برطانیہ آیا اور برنفورڈ یونیورسٹی اور لیڈز میٹروپولیٹن یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہا۔ موبائل اینڈ ڈسٹری بیوٹڈ کمپیوٹر نیٹ ورک میں ماسٹر کیا۔

ہمارا نیوجرسی سے کراچی تک کا سفر ۱۴/راتوں اور ۱۵/دن بعد تقریباً ۱۰/ہزار کلومیٹر طے کرکے اختتام پذیر ہوا۔ اس پورے عرصے میں میری اماں روزے رکھ کے اور مصلے پر نوافل پڑھ پڑھ کر ہماری حفاظت کی دعائیں کرتی رہی۔ اخراجات کا تو ابھی تک ہم نے حساب نہیں لگایا، لیکن اندازاً ۸/لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ یہ اخراجات تھوڑے زیادہ ہیں ورنہ یہ سفر ۶/لاکھ روپے میں بھی بآسانی ممکن تھا۔ برطانیہ سے پاکستان جانے کے لیے دو راستے ہیں۔ پہلا فرانس، جرمنی، آسٹریا، ہنگری، رومانیہ، بلغاریہ، ترکی، ایران اور پاکستان۔ دوسرا فرانس، سوئٹزرلینڈ، اٹلی، یونان، ترکی، ایران اور پاکستان۔ دوسرا راستہ زیادہ خوبصورت اور دلکش مگر محصول کے اخراجات کی وجہ سے مہنگا ہے۔ اس کے علاوہ دوبگہ کشتی بھی استعمال کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے ہم نے پہلا راستہ اختیار کیا۔

ہمارے لیے سب سے حیران کن امر یہ تھا کہ تمام یورپ کے درمیان کوئی سرحد نہیں۔ آپ فرانس سے جرمنی اور جرمنی سے آسٹریا چلے جائیں، ایسا لگتا ہے کہ آپ ناظم آباد سے نارتھ ناظم آباد آگئے ہیں۔ ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ کب ہم فرانس سے جرمنی میں داخل ہوگئے۔ راستے میں جب ہم نے زبان تبدیل ہوتے دیکھی تو احساس ہوا کہ ملک بھی تبدیل ہوگیا۔ فرانس سے آسٹریا کے شہر ویانا تک تو سفر شاندار رہا۔ نہایت خوبصورت علاقہ اور موسم تھا۔ لیکن ویانا سے آگے ہنگری کے شہر بڈاپسٹ تک کا سفر اور پھر وہاں رومانیہ کے شہر بخارسٹ تک کا سفر ہمیں یاد رہے گا، کیونکہ اس دوران ہمیں سب سے زیادہ مشکلات پیش آئیں۔ اتنے بڑے سفر میں سب سے زیادہ پریشانی راستے کی ہوتی ہے اور اگر آپ راستہ بھٹک جائیں، تو لگتا ہے کہ سب کچھ لُٹ گیا۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا۔ بہرحال، سفر خیر و عافیت سے گزر گیا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ کون سا شہر اچھا لگا تو میرا جواب ہوگا کہ استنبول۔ استنبول بہترین شہر ہے۔ وہاں قدیم و جدید عمارات، سبزہ و پانی، سمندر وغیرہ سب موجود ہیں۔ سب سے بڑھ کر خلافتِ عثمانیہ کی نشانیاں اور مسلم تاریخ بہت جاذبیت رکھتی ہے۔ استنبول کے بعد میونخ نے متاثر کیا۔

مختصر احوالِ سفر یوں ہے۔ برطانیہ چونکہ ایک جزیرہ ہے، چنانچہ اس سے باہر نکلنے کے لیے پانی کے اوپر سفر کرنا پڑا۔ ہم برطانوی شہر ڈوور (Dover) سے فیری (کشتی) کے ذریعے فرانسیسی شہر کیلاں سے پہنچے۔ پھر پیرس کے ایک

ہوٹل میں رات کا قیام کیا اور ایفل ٹاور دیکھا۔ اگلے روز میونخ پہنچے۔ اگلا سارا دن شہر میں گزارا، رات گیارہ بجے ویانا پہنچے۔ اگلے دن وہاں سڑکوں پہ گھومتے رہے۔ پھر ویانا کا مشہور زمانہ دنیا کا سب سے قدیم چڑیا گھر دیکھا جو ۱۷۵۲ء میں قائم ہوا تھا۔ پھر شام کو وہانا سے ہنگری کے لیے نکلے۔ اب ہم یورپ کے اس حصے کی طرف جا رہے تھے، جو نسبتاً باقی یورپ سے کم ترقی یافتہ اور غریب ہے۔

یورپ میں دروازوں اور ان کے پیچھے صحن کا کوئی رواج نہیں۔ گھر کا دروازہ کسی کمرے کی طرح ہی ہوتا ہے۔ شاید رومانیہ میں چوریاں ہوتی ہوں گی۔ کچھ آرام کے بعد براستہ بلغاریہ ترکی میں داخل ہوئے۔ اگر آپ پاکستانی پاسپورٹ رکھتے ہیں اور آپ کے پاس برطانیہ کا ویزا ہے تو آپ کو سرحد ہی پر ترکی کا ویزا مل جائے گا۔ ہمیں بھی ایک مہینے کا سنگل انٹری ٹرانزٹ ویزا ملا۔

ہنگری کے دارالحکومت بڈاپسٹ کے بارے میں سب سے اہم بات وہاں کے یہودی ہیں۔ اسی وجہ سے بڈاپسٹ کو جیوز مکہ (Jews Mecca) یعنی یہودیوں کا مکہ بھی کہا جاتا ہے۔ بہرکیف ہنگری سے رومانیہ پہنچے۔ رومانیہ بھی غریب یورپی ملک ہے۔ وہاں ہم نے پاکستان کی طرح سڑکوں پر کتوں کی بہتات دیکھی۔ گھروں کے دروازے لوہے کے اور بڑے بڑے ہیں، ورنہ سارے

ترکی ایک عجیب ملک اور ترک عجیب سی قوم ہے۔ ترکوں نے صدیوں تک شان سے آدھی دنیا پہ حکومت کی اور پھر صدی بھر تک یہ اپنی شناخت بھول گئے۔ اب آہستہ آہستہ ترکی بیدار ہو رہا ہے۔ اب ہم مسلم دنیا میں داخل ہو رہے تھے۔ استنبول جیسا سنا تھا، اس سے کہیں بڑھ کر پایا۔ اس کی ہر چیز آپ کو اپنی طرف کھینچتی ہے، لوگ، ہوٹل، ریستوران، عمارتیں، مساجد اور ساحل، وہاں

ہمیں لگا کہ واقعی کسی شہر میں آگئے ہیں، ورنہ سارا یورپ ایک مشین کی طرح ہے۔ رات کو بھی تھکن کے باوجود شہر دیکھنے نکل پڑے۔ اگلا پورا دن ترکی گھومتے رہے، رات کو ہم انقرہ پہنچے۔ انقرہ اور استنبول میں فرق عمارات کا ہے۔

استنبول جدید اور قدیم کا امتزاج ہے جبکہ انقرہ کا مرکزِ شہر تو جدید ہے، مگر باقی شہر کچھ خاص نہیں۔ پھر ہم ترک ایرانی سرحدی شہر، ڈیگوبیازٹ کی طرف نکلے۔ یہ چھوٹا سا گاؤں گرد آبادی رکھتا ہے اور سطح سمندر سے تقریباً سولہ ہزار میٹر بلند ہے۔ سارا علاقہ نہایت دشوار گزار، مگر خوبصورت ہے۔ ترکی کی حکومت کوشاباش، جو اس نے ان دشوار گزار علاقوں تک ایسی بہترین سڑکیں بنائی ہیں کہ دیسی یورپ میں کہیں نہیں۔ ترکی سے باہر ہم کسی پریشانی کے بغیر نکل گئے۔

ایرانی سرحد کا حال کسی پاکستانی سرکاری ادارے سے مختلف نہیں تھا۔ کسی نے بھی ہماری مدد نہیں کی اور ہمیں یہ نہیں سمجھ آرہا تھا کہ کیا کریں۔ بہرکیف ایران کی کرنسی بہت ''کمزور'' ہے۔ ہم نے سرحد پر ۲۱۰ر یورو تبدیل کرائے تو اس کے ہمیں ۳۳ر لاکھ ایرانی ریال ملے۔ ایران کی سڑکیں پاکستان جیسی ہی ہیں کم از کم ہزیرو تک، اس لیے سفر بہت تکلیف دہ رہا۔ راستے میں پولیس والے نے روکا، کیونکہ ہماری گاڑی کی ایک ہیڈلائٹ خراب تھی۔ جب اس کو پتا چلا کہ ہم سیاح ہیں، تو وہ رشوت کے چکر میں آگیا۔ ایران میں موسم بھی گرم ملا اور یورپ جیسا سبزہ بھی نہیں رہا، اس لیے سفر واقعی تکلیف دہ تھا۔ ہم جیسے جیسے میرجاوہ (سرحدی قصبے) کے قریب پہنچے، خوف اور خوشی دونوں محسوس ہوئے۔ خوشی اس بات کی کہ ہم نے اپنا سفر تقریباً مکمل کرلیا۔ خوف اس بات کا اب اصل خطرناک سفر شروع ہو رہا ہے۔ میرجاوہ، ایرانی بلوچستان ہے، جہاں لوگ اُردو بھی سمجھ لیتے ہیں۔ وہاں لوگ شلوار قمیص میں ملبوس نظر آئے۔

ایران سے پاکستان داخل ہوئے، تو خوش قسمتی سے نہایت آرام سے امیگریشن ہوئی۔ ہم پھر دالبدین، چاغی، ریکوڈک سے گزرے۔ رات ہم نے مستونگ میں گزاری، جہاں ہمارا بلوچی طرز پر استقبال ہوا۔ بلوچی روٹی، چاول اور دنبے کے گوشت سے تواضع کی گئی۔ ہمارے آنے کی اطلاع پر تقریباً سارا گاؤں ہمیں سلام کرنے آیا۔ بلوچوں کے ساتھ گزرے یہ دو دن ہمارے سارے دورے کے سب سے حوصلہ افزا اور محبت سے بھرپور دن تھے۔ مان گئے کہ اپنا ملک، تہذیب اور لوگ اتنے پُرخلوص ہیں کہ حد نہیں۔ صبح آٹھ بجے مستونگ سے نکلے تو شام چھ بجے کراچی پہنچے۔ راستے میں خضدار میں کھانے اور بیلہ میں چائے پینے رُکے۔ یوں جس سفر سے ہمیں خوف آرہا تھا، وہی یادگار گزرا۔

یورپ میں حلال غذا کا بہت مسئلہ ہے، اسی لیے ہم اپنے ساتھ برطانیہ سے ایک ہفتے کا کھانا ساتھ لے کے چلے، جس میں ڈبا بند غذائیں (سفید چنے، لوبیا، نوڈل وغیرہ) شامل تھیں۔ سفر میں راہنمائی کے لیے ہم نے راہنما کتابچے خریدے، تاکہ راستہ بھٹک نہ سکیں۔ مگر یہ تمام صرف ترک سرحد تک چلتے ہیں، اس کے بعد ایران اور پاکستان سڑک پہ لگے نشانات ہی سے کام چلانا پڑتا ہے۔

ہم پاکستانیوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمیں ہر جگہ شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ عزت جو ہمیں ملنی چاہیے، اب نہیں ملتی۔ سب سے زیادہ دکھ اس بات کا ہوتا ہے، جب کوئی مسلمان آپ سے پاکستانی ہونے کے باعث اچھا برتاؤ نہ کرے۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ جب آپ کسی مسلمان سے ملیں، جو حادثہ ۹/۱۱ کے بعد اسلام سے ہمدردی رکھتا ہے، تو وہ امریکہ کا ساتھ دینے پر طنز کرتا ہے۔ کبھی کوئی پاکستان کے حالات پر آپ کو انتہاپسند ہونے کا طعنہ دیتا ہے۔ سمجھ نہیں آتا، ہم کیا کریں؟ ایک طویل سفر کرنے کے بعد اگر میں تین جملوں میں راستے میں آنے والے ممالک کے بارے میں کوئی رائے دوں (جو کہ غلط بھی ہوسکتی ہے) وہ یہ ہوگی ''بہترین اخلاقیات برطانیہ پر ختم ہوتی ہیں، شہری شعور یورپ پر اور ترکی سے آگے یہ دونوں نظر نہیں آتے۔''

(برطانیہ سے کراچی تک۔ احتشام شاہد)

چھٹا رنگ

قدیم غاروں والا شہر

یورپی جارجیا میں ایک ایسا قدیم شہر موجود ہے جس کے مکین زیرِ زمین تراشے گئے پتھریلے غاروں میں رہتے تھے۔ یہ غار آج بھی موجود ہیں، مگر کافی شکستہ ہو چکے۔ زمانے کے سرد و گرم نے ان غاری رہائش گاہوں کو کسی حد تک متاثر کیا ہے، مگر جارجیا کی حکومت نے ان کی مرمت کی اور تزئین و آرائش بھی کیونکہ یہ ان کی ثقافت کا ورثہ ہے۔ دنیا بھر کے سیاح ان غاروں کو بڑے شوق سے دیکھنے آتے ہیں۔ پتھریلے مکانات والے اس قدیم شہر کا نام اپلی ستخی (Uplistsikhe) ہے جس کا مقامی زبان میں مطلب ہے ''دیوتاؤں کا قلعہ'' گویا یہاں کی روایات کے مطابق بھی ان مکانوں میں دیوتا رہتے تھے۔ یہ عجیب و غریب مکان زیرِ زمین اسی لیے بنائے گئے تھے تاکہ آسمانی دیوتا دنیا کے لوگوں کے ہنگامے اور شور و غل سے بچ کر یہاں سکون سے رہیں۔

یہ قدیم اور طلسماتی شہر مشرقی جارجیا میں واقع ہے۔ زمانۂ قدیم کے انسان نے چٹانوں کو کس طرح کاٹا اور انھیں کھوکھلا کر کے ان میں اپنے مسکن کس طرح بنائے، یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس قدیم چٹانی شہر کو

دریائے متکوری (Mtkvari) کے بائیں کنارے بلند چٹانی سلسلے پر تعمیر کیا گیا۔ اس میں متعدد گھر ایسے بھی ہیں جو ابتدائی فولادی زمانے کے ہیں۔ متعدد گھر عہدِ وسطیٰ کے اواخر سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ پورا چٹانی کمپلیکس انوکھے طرزِ تعمیر کا بہت ہی منفرد اور یکتا امتزاج رکھتا ہے۔ ان میں اناطولیہ کا طرزِ تعمیر بھی دکھائی دیتا ہے اور بعض جگہ ایرانی (فارس) طرزِ تعمیر کی جھلک نظر آتی ہے۔ ساتھ ساتھ قبائلی اور عیسائی طرزِ تعمیر کی جھلک بھی موجود ہے۔ وہ چٹان جس میں غار تراشے گئے، ریتلے پتھر سے بنی ہوئی ہے۔ اس مواد کو کاٹنا تراشنا آسان ہے۔

یہ غاروں والا شہر جارجیا کی قدیم ترین آبادیوں میں سے ایک ہے۔ اسے پندرھویں سولہویں صدی قبل مسیح میں بسایا گیا۔ اس کے بعد گزرتی صدیوں کے دوران شہر کی متعدد بار تعمیرِ نو کی گئی، پھر اسے ویران چھوڑ دیا گیا۔ جہاں شکستگی کا شکار ہوتا رہا۔ لیکن ہر بار اسے کسی نہ کسی حد تک بحال کیا گیا۔ اب لگ بھگ دو سو سال بعد یعنی جب اس پر حملوں اور اس کے محاصروں کا سلسلہ ختم ہوا، یہاں کوئی نہیں رہتا۔ جو لوگ یہاں رہتے تھے، وہ اس جگہ سے نیچے دریائے کورا کی وادی میں جا کر آباد ہو گئے۔

اس شہرِ ویراں کے غاری مکانوں پر مشتمل کمپلیکس تین حصوں میں تقسیم ہے۔ جنوبی (زیریں) درمیانہ (مرکزی) اور شمالی (بالائی) یہ لگ بھگ ۸ ہیکٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کا درمیانی حصہ سب سے بڑا ہے، جس میں چٹانوں میں تراشے گئے زیرِ زمین مکانات شامل ہیں۔ اس کمپلیکس کو جنوبی حصے سے ایک تنگ درے اور طویل سرنگ کے ذریعے جوڑا گیا۔ یہ راستہ بڑی مشکل اور محنت سے چٹانوں میں تراشا گیا اور قدیم طرزِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ اس کی مرکزی شاہراہ سے تنگ گلیاں اور پتھریلی سیڑھیاں نکل رہی کہ مختلف گھروں اور مکانوں تک جاتی ہیں۔ انہی گلیوں اور سیڑھیوں کی وجہ سے یہ زیرِ زمین علاقہ آپس میں جڑا ہوا ہے۔

غاروں کی اکثریت کسی بھی قسم کی سجاوٹ اور آرائش سے محروم ہے، ویسے چند بڑے مکانات میں آرائشی محرابیں ہیں اور سجاوٹ والی چھتیں بھی ہیں، ان میں پتھریلے ستونوں کو بڑی مہارت سے تراشا گیا۔ یوں مکانوں کا حسن دوبالا ہو گیا۔

۲۰۰۳ء میں اس غاری قصبے کی حالت بہت خراب تھی۔ پرانی سڑک بہت خستہ حال ہو چکی تھی حالانکہ یہاں داخلہ مفت تھا، اس کے باوجود شاذ و نادر ہی کوئی سیاح وہاں نظر آتا۔ بعد میں اس کی تزئین و آرائش پر تھوڑی بہت توجہ دی گئی۔ ریستوراں اور بیت الخلا تعمیر کرائے گئے۔ سڑک کی مرمت کر کے اسے سفر کرنے کے قابل بنایا گیا۔ اب یہاں داخلے کی فیس بھی مقرر ہے۔

(غاروں والا شہر۔ مرزا عظیم بیگ)

ساتواں رنگ

ڈنمارک (بے مثال فلاحی مملکت)

اسکنڈے نیویا کے ۵۵/لاکھ آبادی والے ملک ڈنمارک نے دودھ و گوشت کی پیداوار کے ذریعے ایسی ترقی کی ہے جو ۱۸/کروڑ نفوس پر مشتمل وطنِ عزیز پاکستان ۶۴/برس میں بھی نہیں کر سکا۔ اگر پاکستان میں بدعنوانی کے بے قابو جن کو بوتل میں بند نہ کیا گیا، موجودہ اور سابقہ بدعنوان حکمرانوں کو نشانۂ عبرت نہ بنایا گیا تو ہماری آیندہ نسلیں تنزلی کی طرف تیزی سے گامزن رہیں گی اور آج جنھیں تھوڑی بہت خوراک یا بنیادی اشیائے ضروریہ دستیاب ہیں، ان کا بھی فقدان ہو جائے گا۔ ملکی خودمختاری و سلامتی کے تحفظ کا حلف اٹھانے والی شخصیات غیرفوجی ہیں یا عسکری، اعلیٰ عدلیہ ہے یا پارلیمان، ان تمام کو آج ہی بدعنوانی کے خاتمے کے عملی اقدامات اس طرح کرنے ہوں گے جس طرح ڈنمارک نے کیے جہاں بدعنوانی، لاقانونیت، خوراک میں ملاوٹ اور ناانصافی نام کو نہیں۔

ڈنمارک دنیا کی معروف فلاحی مملکت ہے۔ اس کے ذرائع آمدنی میں نہ تیل ہے نہ گیس بلکہ کمائی صرف دودھ، گوشت کی برآمد اور ٹیکسوں کے نظام سے ہوتی ہے لیکن اپنی آمدن جمہوری حکومت صرف اور صرف ملکی عوام کی فلاح و بہبود پر بلا امتیاز اسی طرح خرچ کرتی ہے، جس طرح حضرت عمر فاروقؓ خلیفۂ دوم اسلامی مملکت کے دور میں عوام کی فلاح و بہبود کا نظام اتنا معیاری تھا کہ خلیفۂ وقت دیکھتا تھا، کوئی بھوکا تو نہیں سوتا۔ انؓ کا یہاں تک کہنا تھا کہ اگر اسلامی ریاست میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مرگیا تو اس کا ذمے دار خلیفۂ وقت (حضرت عمر فاروقؓ) ہوگا۔ آج پاکستان میں کئی لوگ بھوک سے تنگ آکر خودکشیاں کر چکے اور کرتے جا رہے ہیں۔ غربت کے مارے لوگ اپنے بچوں کو نہر میں پھینک رہے ہیں۔ مگر ہمارے حکمرانوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ وہ تو اپنی عیاشیوں میں مست ہیں اور ان کی ساری عیاشیاں غریب قوم کے ٹیکسوں سے بھرے خزانے سے پوری ہوتی ہیں۔ چونکہ پاکستان میں ٹیکس گزاروں کو ویسی سہولیات میسر نہیں جتنی ڈنمارک کی حکومت ہر ٹیکس گزار کو دیتی ہے، اسی لیے پاکستان میں لوگ پورا ٹیکس ادا نہیں کرتے۔ ٹیکس حکام بھی اپنی شاہانہ زندگی اور اپنے بچوں کی بیرونِ ملک تعلیم و رہائش کے اخراجات پورا کرنے کے لیے بدعنوانی میں بلاخوف وخطر مصروف ہیں۔

ڈنمارک میں پاکستانی برادری کے ایک سرگرم رکن طاہر حسین ۱۹۹۴ء سے وہاں مقیم ہیں۔ کوپن ہیگن میں ان کا اپنا پرٹمنٹل اسٹور ہے، انھوں نے ملاقات میں راقم کو بتایا کہ ڈنمارک جیسی فلاحی ریاست کی نظیر دنیا بھر میں نہیں ملتی۔ بلاشبہ ڈنمارک کی حکومت ہر برسرروزگار خاتون و مرد سے اس کی ماہانہ آمدنی کا ۳۸/ سے ۶۰/فیصد بصورت ٹیکس منہا کر لیتی ہے۔ مگر ہم ۳۳/ہزار کے لگ بھگ پاکستانی بہ خوشی ہر ماہ باقاعدگی سے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جب ڈنمارک میں کوئی ٹیکس گزار کسی وجہ سے بے روزگار ہو تو حکومت اسے اس کی آخری ماہانہ تنخواہ کے ۹۰/فیصد برابر رقم پہلے ۶/ماہ کے دوران ہر ماہ بذریعہ چیک اس کے گھر پہنچا دیتی ہے۔ ۶/ماہ بعد سوشل سیکورٹی ۹۰/ کے بجائے ۸۰/فیصد کر دی جاتی ہے۔ یہ ۸۰/فیصد رقم اسے اُس دن تک حکومت ادا کرتی ہے جب تک اسے ملازمت نہیں مل جاتی۔ چاہے اسے ۱۰/سال تک نہ ملے، حکومت اس بے روزگار شخص کو ۸۰/فیصد رقم دیتی ہے۔ ہر شہری کے بچوں کی تعلیم، کتابیں اور اسپورٹ مفت ہے۔ بیماری کی صورت میں بہترین ہسپتال میں علاج مفت ہے، چاہے علاج پر لاکھوں روپے (ڈینش کرنسی کراؤن پاکستانی ۱۶/روپے کے برابر) خرچ ہوں۔

ڈنمارک میں لوگوں کا معیارِ زندگی امریکہ سمیت کسی بھی مغربی ملک سے کم نہیں۔ خوراک خالص ہے۔ خوراک، ادویات میں کوئی ملاوٹ کی جرأت نہیں کر سکتا کیونکہ قانون سخت ہیں۔ قانون کا ہر چھوٹے بڑے پر یکساں اطلاق ہوتا ہے۔ رات کے ۲/بجے ہوں، برفباری ہو رہی ہو اور ٹریفک کی بتی سرخ ہو تو کوئی اشارہ پار نہیں کرتا۔ ڈنمارک کے شہری حتیٰ کہ سائیکل سوار خواتین مرد بوڑھے بچے بھی سرخ بتی پر رک جاتے اور سبز ہونے پر ہی چلتے ہیں۔

ڈنمارک کی دکانوں اور بڑے چھوٹے اسٹور پر تمام مصنوعات یورپی معیار کی ہیں۔ ملبوسات، جوتے، کھانے پینے کی اشیا، خواتین کا سامان، آرائش و زیبائش، بچوں کے کھلونے، ادویات غرض ہر انسانی استعمال کی چیز طے شدہ معیار کی ہے۔ اسی بنا پر ڈنمارک کے لوگ ضرورت کی چیزیں مہنگی خرید نے میں بھی خوشی و سکون محسوس کرتے ہیں۔ ایک عام شہری کی کم سے کم ماہانہ تنخواہ ۳/ہزار ڈالر ہے جو تقریباً ڈھائی لاکھ روپے بنتی ہے۔ ہر شہری کی جان و مال، گاڑی و مکان، دکان حتیٰ کہ کاروبار کی انشورنس ہوتی ہے۔ انشورنس کی رقم دعویٰ دائر ہونے کے تین چار یوم میں کمپنی ادا کرنے کی پابند ہے۔

ڈنمارک کے تمام شہریوں کو سستا اور فوری انصاف ملتا ہے۔ قانونِ ڈنمارک کے مقامی اور غیرملکیوں کے لیے یکساں ہے، کسی شہری کو غیرملکی پر ترجیح نہیں دی جاتی۔ اگر کسی کے ساتھ ناانصافی ہو تو وہ اپنے وکیل کے ذریعے عدالت میں استغاثہ دائر کرتا ہے۔ مقدمے کا فیصلہ پاکستان کی طرح برسوں نہیں بلکہ دو تین ہفتوں میں ہی ہو جاتا ہے۔ قتل، چوری، ڈکیتی، راہزنی، خواتین کی آبروریزی وغیرہ کے جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پولیس ثبوت ملے بغیر کسی کو تھانے نہیں لے جا سکتی۔ ہاں اگر ٹھوس ثبوت مل جائے تو پھر ملزم ڈنمارک کی سڑکوں پر نہیں گھوم سکتا۔ قتل کا مقدمہ اگر ثبوت کے ساتھ ہو تو ۶/ماہ کے اندر اندر اس کا فیصلہ کرنا لازمی ہے۔

(ڈنمارک میں ٹیکسوں کا مربوط نظام۔ حنیف خالد)

شہرۂ نامور شخصیت

جن سے دنیا روشن

کرۂ ارض کا سب سے مؤثر انسان

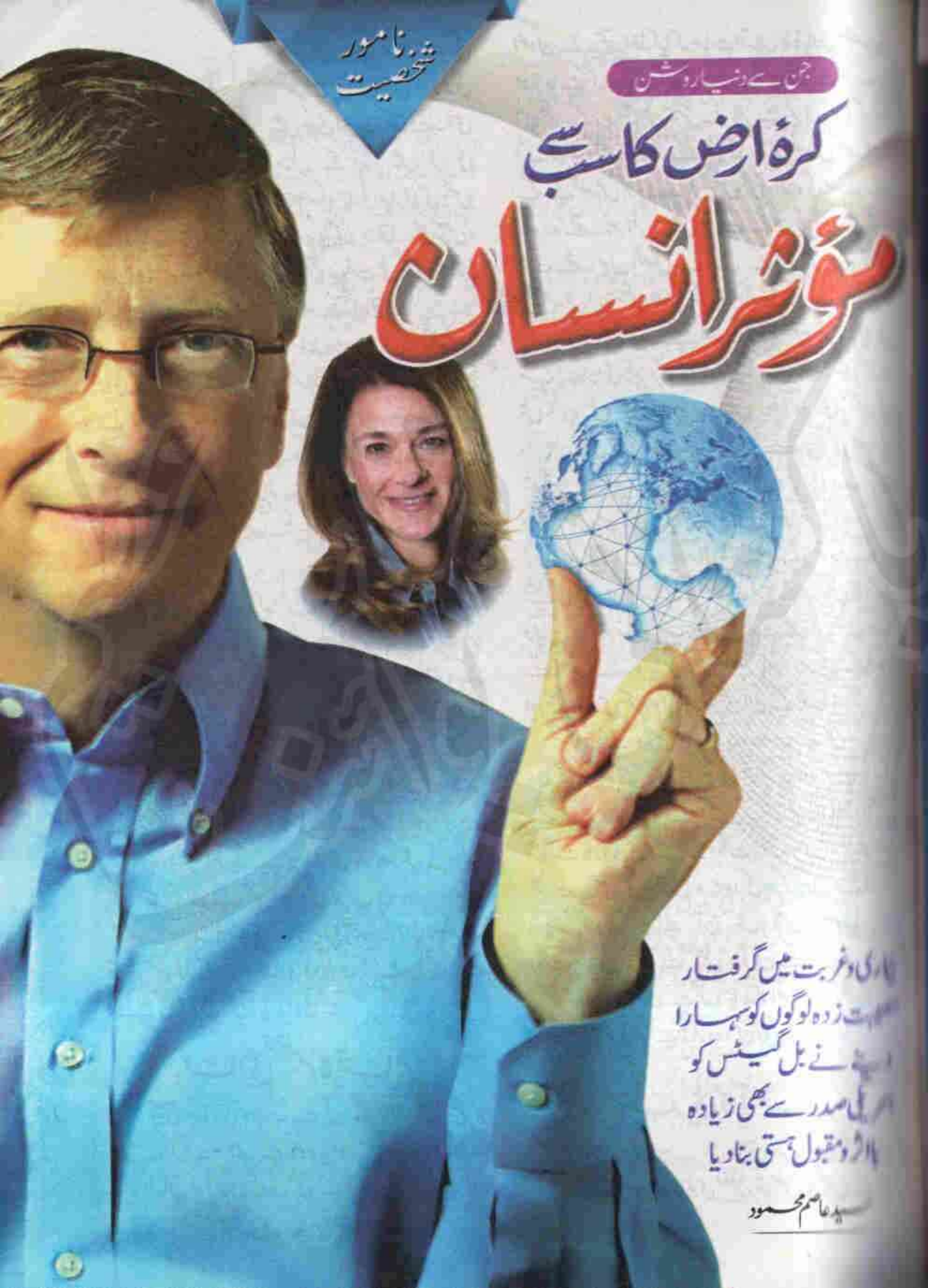

ماری و غربت میں گرفتار
مصیبت زدہ لوگوں کو سہارا
نے بل گیٹس کو
امریکی صدر سے بھی زیادہ
بااثر و مقبول ہستی بنا دیا

سید عاصم محمود

۱۹۹۵ء

کا سال ۵۶ سالہ امریکی کھرب پتی بل گیٹس کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی سال کے آغاز میں بل کی شادی ہوئی۔ تب تک ونڈوز ۹۵ء کی تیاری جاری تھی جس نے دنیائے کمپیوٹر میں انقلاب برپا کر دینا تھا۔ یہی نہیں، جلد ہی مائیکروسافٹ کارپوریشن کی بدولت بل گیٹس کا شمار انتہائی دولت مند امریکیوں میں ہونے والا تھا۔

بل گیٹس اور ان کی بیگم، میلنڈہ کی پرورش ناز و نعم سے ہوئی تھی۔ انھیں زندگی کی ہر آسایش حاصل تھی اور انھوں نے غربت و جہالت کا بھیانک چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ بیاہ کے بعد دونوں ہنی مون منانے کینیا گئے۔ وہاں بل و میلنڈہ نے جنگلی جانوروں کا شکار کیا اور شیروں کو ہرنوں کا شکار کرتے دیکھا۔ لیکن کینیا ہی میں پہلی بار ان کا پالا غربت سے پڑا۔

انھوں نے دیکھا کہ افریقی مرد سارا دن کام کر کے ہی اس قابل ہوتے ہیں کہ گھریلو اخراجات برداشت کر سکیں۔ ان کی بیویاں بھی سارا دن کام کرتی ہیں۔ اس کے باوجود بیشتر افریقی گھروں میں بھوک اور بیماریوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ کئی بچے باشعور بھی نہیں ہوتے کہ کسی بیماری کے ہاتھوں چل بستے ہیں۔ ان تکلیف دہ مناظر نے امریکی دولت مندوں کو خاصی حد تک جھنجھوڑ ڈالا۔

وہ واپس امریکہ پہنچے تو چند ہی ماہ بعد بل کی والدہ چل بسیں۔ وہ ایک مخیر اور دکھی لوگوں کی ہمدرد خاتون تھیں۔ انھوں نے شادی کے دن اپنی ہونے والی بہو کو بتایا تھا "جن انسانوں کو زیادہ (دولت) ملے، انہی سے (دینے کی) توقع بھی زیادہ ہوتی ہے۔"

فلاحی تنظیم کا قیام

چہیتی بیوی کی وفات نے بل کے والد، بل سینئر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آخر انسان کو زندگی کیوں ملتی ہے؟ سوچ بچار کے بعد انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حیاتِ انسان کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ دکھی انسانیت کی ہر ممکن خدمت کرے۔ اسی فکر کے زیرِ اثر بل سینئر نے پھر بیٹے پر زور دیا کہ وہ ایک فلاحی تنظیم قائم کر کے اپنی آمدن کا مخصوص حصہ اس کے لیے مخصوص کر دے۔ بل گیٹس بھی والدہ کی موت سے افسردہ تھے۔ پھر افریقہ میں غربت کے مناظر بھی دل میں ثبت تھے۔ یوں انھوں نے سال کے آخر میں اپنی فلاحی تنظیم، بل اینڈ گیٹس فاؤنڈیشن قائم کر دی۔

سترہ برس بیت چکے اور یہ فاؤنڈیشن آج دنیا کی سب سے بڑی غیر سرکاری فلاحی تنظیم بن چکی۔ یہی نہیں، بل گیٹس میں بھی انقلابی تبدیلیاں رونما ہو چکی، جن کی داستان بڑی سبق آموز اور دلچسپ ہے۔ یہ انہی انقلابی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے کہ آج بل گیٹس دنیا کی سب سے طاقتور ہستی بن چکے۔ یہ اعزاز انھیں مشہور امریکی رسالے فورپس نے دیا ہے۔ یہ رسالہ مختلف پیمانے مقرر کر کے ہر شعبے کی بہترین شخصیات کا انتخاب کرتا ہے۔ حال ہی میں دنیا کی طاقتور ترین شخصیات کی فہرست میں بل گیٹس سب سے اوپر آئے۔ دنیا کی اکلوتی سپر پاور، امریکہ کے صدر اور چینی و روسی حکمرانوں کا نمبر بھی ان کے بعد آیا۔

شاید آپ سوچیں کہ بے پناہ دولت نے بل کو یہ رتبہ عطا کیا۔ جی نہیں، انسانیت کی خدمت اور غریبوں کے لیے جذبۂ ہمدردی نے انھیں یہ مقام دلایا۔ دراصل بحیثیت کاروباری انھیں جو دولت، اثر و رسوخ، عزت اور شہرت حاصل تھی، فلاح و بہبود کی سرگرمیوں نے ان کو دوچند کر دیا۔ چنانچہ آج بل گیٹس خصوصاً دولت مندوں کے لیے مشعلِ راہ بن چکے۔ ان کی حیات یہ حقیقت عیاں کرتی ہے کہ دنیا کے امرا کو کس طرح کا دولت خرچ کرنی چاہیے تاکہ وہ دین و دنیا میں نام کما سکیں۔

تبدیلی کا آغاز

۱۹۹۴ء میں جب بل فلاحی سرگرمیوں کی طرف آئے، تو وہ مشہور برطانوی مفکر، تھامس مالتھس کے نظریے پر یقین رکھتے تھے کہ غربت، بیروزگاری، بھوک، جہالت وغیرہ زیادہ آبادی کی پیداوار ہیں۔ چونکہ وسائل محدود ہیں، لہٰذا آبادی ہمیشہ مصیبت لاتی ہے۔ چنانچہ بل کو یقین تھا کہ ویکسین بنانے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ جن بچوں یا انسانوں کی جانیں بچیں، وہ آخر کار کرۂ ارض پر بوجھ ہی ثابت ہوں گے۔

اسی سوچ کے باعث بل نے اقوام متحدہ کو ۱۰ کروڑ ڈالر دیے تاکہ اس کی ایجنسیاں غریب ممالک میں پیدا تولید کے طریقے متعارف کرا سکیں۔

بل گیٹس نے دوسرا محاذ امریکی روایتی طرزِ تعلیم کے خلاف کھولا۔ بل کا خیال تھا کہ جس جماعت میں کم بچے ہوں، استاد کو موقع ملے گا کہ ان پر بھرپور توجہ دے۔ لہٰذا انھوں نے ایک ارب ڈالر لاگت سے اصلاحات کا منصوبہ شروع کیا۔ لیکن اس کے بعد محققوں نے بل کو باور کرایا کہ جماعت کے چھوٹے یا بڑے ہونے سے طالب علم کی کارکردگی پر زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ اصل بات ہے کہ استاد کو تعلیم یافتہ، تجربہ کار اور اپنی ذمے داری سے مخلص ہونا چاہیے۔

بل کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان کا کوئی نظریہ یا خیال غلط ثابت ہو، تو وہ اس کی درستی پر ضد نہیں کرتے، بلکہ راہ بدل لیتے ہیں۔ چنانچہ بل نے کروڑوں ڈالر خرچنے کے بعد اپنے تعلیمی منصوبے کا رخ بدلا اور استادی تعلیم و تربیت پر توجہ مرکوز کر دی۔

صحت کا منصوبہ بھی اسی تبدیلی سے گزرا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ خصوصاً ترقی پذیر ممالک میں والدین اس لیے زیادہ بچے پیدا کرتے ہیں کہ انھیں علم ہے، کئی بیماریوں سے انھوں چل بسیں گے۔ لہٰذا بل نے صحت کے تمام منصوبوں کو سمت معکوس دے دی..... اب وہ بچوں کی جانیں روکنے کے بجائے ان کی جانیں بچانے پر کمربستہ ہیں۔ ۱۹۹۸ء کی بات ہے اور اسی لمحے بل نے فیصلہ کیا کہ وہ ویکسین خرید کر غریب ممالک کو مفت یا رعایتی داموں فراہم کریں گے۔

انقلاب کا آغاز

بل گیٹس چاہتے، تو اربوں ڈالر طبی تنظیموں کو دے ڈالتے تاکہ وہ بچوں کو ادویہ و ویکسین فراہم کر سکیں لیکن بل و میلنڈہ نے ازخود اس کام میں دلچسپی لی۔ پھر وہ خصوصاً شعبۂ ویکسین میں انقلابی اور جدید تبدیلیاں لے آئے۔ وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں غلط فہمیوں کی بنا پر یہ نظریہ پھیل گیا کہ ویکسین بچوں میں مختلف بیماریاں مثلاً آٹزم پیدا کرتی ہیں۔ لہٰذا تمام بڑی ادویہ ساز کمپنیاں ویکسین بنا کر اپنی رقم برباد کرنے پر آمادہ نہ تھیں۔

یہ مسئلہ حل کرنے کے لیے بل نے سوچا کہ ایک طرف تو سائنس دان نئی ویکسین تیار کریں، دوسری سمت ادویہ ساز کمپنیوں کو نئی منڈیاں دی جائیں، تاکہ وہ ویکسین بنانے کی طرف متوجہ ہوں۔ اس منصوبے پر عمل کے لیے زرِکثیر چاہیے تھا، چنانچہ ۱۹۹۹ء میں بل نے اپنی دولت میں سے ۲۱/ارب ڈالر (۱۸۹۰/ارب روپے) بل اینڈ ملینڈہ گیٹس فاؤنڈیشن کے حوالے کر دیے۔ اس سرمائے سے نئی ویکسین ایجاد کرائی گئیں، پھر ادویہ ساز کمپنیوں سے انھیں بنوا اور خرید کر غریب ممالک میں تقسیم کیا گیا۔ یوں بین الاقوامی سطح پر بذریعہ ویکسین بچوں کی جانیں بچانے والا انتہائی مؤثر نظام سامنے آگیا۔ یہ کامیابی ایک فردِ واحد کے جذبۂ خدمت کی بدولت ہی رونما ہوئی۔

آج بل گیٹس کا وضع کردہ ویکسین پروگرام ہر سال دنیا بھر میں "۲۵/کروڑ" بچوں کو مختلف ویکسین مہیا کرتا ہے۔ اس پروگرام میں ترقی یافتہ ممالک بھی شامل ہو چکے اور وہ اُسے سالانہ کروڑوں ڈالر کی امداد دیتے ہیں۔ یہ پروگرام اب "گیوی الائنس" کے نام سے مشہور ہے۔

۲۰۰۱ء سے اب تک گیوی الائنس پاکستانی حکومت کے ویکسین پروگرام کو ۳۰/کروڑ ڈالر (۲۷/ارب روپے) کی امداد دے چکا ہے۔ یوں ممکن ہوا کہ لاکھوں پاکستانی بچوں کو بیماریوں مثلاً خسرہ، کالی کھانسی، زرد بخار، پولیو،

بل گیٹس بمقابلہ سٹیو جابز

اکتوبر ۲۰۱۱ء میں جب پرسنل کمپیوٹر کے بانیوں میں شامل امریکی موجد، سٹیو جابز رخصت ہوا، تو ذرائع ابلاغ کے کئی پنڈتوں اور ماہرین ٹیکنالوجی نے اُسے نئی نسل کے سامنے بحیثیت ''رول ماڈل'' پیش کیا۔ اس اَمر پر امریکہ میں زبردست بحث چھڑ گئی۔

اخلاقیات و انسانیات کے ماہرین نے امریکی عوام کو باور کرایا کہ بحیثیت موجد یقیناً سٹیو جابز نے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچایا، لیکن جب وہ ایپل کمپنی کا مالک بن بیٹھا، تو زیادہ سے زیادہ پیسا کمانا ہی اس کا مطمح نظر بن گیا۔ اس نے پھر کمپنی کی ترقی کے لیے ہر جائز و ناجائز راستہ اختیار کیا اور وہ اخلاقی و انسانی پیمانے پر کمتر شخصیت کا مالک بن گیا۔

مزید براں سٹیو مرا، تو ۳ء۸/ارب ڈالر کی ذاتی دولت رکھتا تھا۔ نیز اس کی کمپنی ۶ء۷/ارب ڈالر مالیت کی تھی۔ لہٰذا وہ امیر ترین امریکیوں میں شامل تھا۔ لیکن اس نے زندگی بھر غریبوں کی فلاح و بہبود کا ایک منصوبہ نہیں بنایا حتیٰ کہ وہ فلاحی تنظیموں کو چندہ بھی نہ دیتا لیکن اُس نے عمر بھر جتنی دولت کمائی، وہ دُنیا میں ہی دوسروں کے لیے چھوڑ گیا۔

لیکن دنیائے کمپیوٹر ہی کی ایک اور معروف ہستی، بل گیٹس اس سے بالکل مختلف ثابت ہوئی۔ بل نے بھی اپنی مائیکروسافٹ کمپنی کے ذریعے بے شمار دولت کمائی۔ ممکن ہے کہ کچھ جائز و ناجائز طریقے بھی اپنائے ہوں لیکن اب وہ دنیا کو بہت کچھ لوٹا بھی رہے بلکہ اپنی ساری دولت فلاحی سرگرمیوں کے واسطے وقف کر چکے ہیں۔ گو دنیاوی لحاظ سے یہ خسارے کا سودا ہے۔ چنانچہ اخلاقیات و مذاہب کے امریکی ماہرین اپنی نئی نسل کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ مادہ پرستی اور سرمایہ داری کے نمائندے سٹیو جابز نہیں بل گیٹس کو رول ماڈل بنائیں جو اپنی دولت و طاقت کے ذریعے دنیا سے بیماری، غربت اور جہالت مٹانا چاہتے ہیں۔

نمونیا، دست، ملیریا وغیرہ سے محفوظ رکھا جا سکے۔ اس کامیابی میں اہم ترین کردار بل گیٹس ہی کا ہے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۱ء گیوی الائنس نے بھارتی حکومت کو صرف ساڑھے چار کروڑ ڈالر کی امداد دی۔ حالانکہ وہاں بھی کروڑوں غریب بچے موجود ہیں۔ شاید بل گیٹس نے بھارتی حکومت کو اس لیے گھاس نہیں ڈالی کہ وہ غیر ملکی امداد کا بیشتر حصہ اسلحہ خریدنے میں لگا دیتی ہے۔

بل و میلنڈہ گیٹس فاؤنڈیشن کے انقلابی اقدامات کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ پچھلے ۱۰ برس میں ویکسین کی قیمت بہت کم ہوگئی۔ مثلاً ۵ر عام بچگانہ امراض (بشمول خناق، تشنج اور کالی کھانسی) کی ویکسین کی قیمت ۴۰ر فیصد کم ہوئی۔ ہیپاٹائٹس بی کی ویکسین کی قیمت تو ۶۸ر فیصد کم ہوگئی۔ یوں ممکن ہوگیا کہ زیادہ سے زیادہ غریب بچوں کو فائدہ پہنچے۔

بل گیٹس کا شمار انسانی تاریخ میں عظیم ترین کاروباری دماغ رکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کے باعث ہی سیکڑوں گتھیاں سلجھائیں اور دنیائے کمپیوٹر میں انقلاب لے آئے۔ اب وہ اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر انسانیت کو درپیش مشکلات ختم کرنے کی سعی میں ہیں۔ بل و میلنڈہ کا عزم ہے کہ وہ اپنے سرمائے و طاقت سے دنیا بدل کر رہیں گے۔

دنیا بدلنے کا عزم

بل گیٹس نے اپنی دولت و اثر و رسوخ کے ذریعے بیماریوں کے خلاف اعلانِ جہاد کر رکھا ہے۔ وہ ۲۰۰۸ء میں مائیکروسافٹ کارپوریشن سے علٰحدہ ہوگئے تاکہ اپنا پورا وقت انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر سکیں۔ ان کے نزدیک کامیابی کا معیار اب زیادہ سے زیادہ دولت مند ہونا نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ کتنے بچوں اور انسانوں کو مرنے یا معذور ہونے سے بچاتے ہیں۔

واضح رہے، ۵۹ سالہ بل ابھی اتنے بوڑھے نہیں ہوئے کہ موت کے مناظر انھیں خوفزدہ کر دیں بلکہ وہ چاہیں تو آسایشاتِ دُنیا سے بھرپور انداز میں لطف اندوز ہوں۔ لیکن انھوں نے بیگم کے ساتھ آرام دہ زندگی تج دی۔ اب وہ دنیا بھر میں گھومتے اور غریبوں کے دُکھ درد دُور کرنے کا سامان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

> اب میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ دُنیا بھر میں شرحِ اموات ۸۰ر فیصد تک کم کردوں۔ اگر میں اور میری ٹیم یہ منزل نہ پا سکے تو ہمیں صدمہ ہوگا کیونکہ اس کا مطلب یہی ہوگا کہ ہم نے اپنا کام صحیح طرح انجام نہیں دیا۔

زندگی کا مقصد

والدین عموماً ساری عمر جائز و ناجائز طریقوں سے اس لیے کماتے ہیں کہ اپنے بچوں کی خاطر بہت کچھ چھوڑ جائیں۔ لیکن بل گیٹس کا مقصدِ حیات کچھ اور ہی ہے۔ اب دکھی انسانیت کی خدمت کرنا ان کا مشن بن چکا اور وہ اپنی ساری دولت اسی کام کے لیے وقف کرنا چاہتے ہیں۔

بل اور میلنڈہ کے ۳ر بچے ہیں۔ ۱۵ر سالہ جینیفر، ۱۲ر سالہ اوری اور ۹ر سالہ فوب۔ بل کا کہنا ہے کہ ان کی وراثت سے ہر بچے کو ایک کروڑ ڈالر (۹۰ر کروڑ روپے) ملیں گے۔ یہ رقم معمولی نہیں مگر بل کی بے حساب دولت دیکھتے ہوئے یہ مونگ پھلی ہی لگتی ہے۔ یاد رہے، بل ذی الوقت ۵۴ر ارب ڈالر کی دولت و جائیداد رکھتے اور دنیا کے دوسرے امیر ترین انسان ہیں۔ تاہم وہ ۱۹۹۴ء سے اب تک ۲۴ر ارب ڈالر اپنی فاؤنڈیشن کو دے چکے ہیں۔ اگر یہ رقم بھی ان کے پاس ہوتی تو یقیناً میکسیکن کاروباری، کارلوس سلیم (۷۴ر ارب ڈالر) سے زیادہ دولت مند ہوتے۔

بل گیٹس کہتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں سے اَزحد محبت کرتے ہیں چنانچہ انھیں دنیا جہاں کی سہولتیں حاصل ہیں۔ وہ کروڑوں بچوں سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں مگر یہ اُن کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی محنت و ذہانت کے بل بوتے پر کامیاب ہوں۔ اسی خیال کے تحت بل اپنی ساری دولت انھیں نہیں دینا چاہتے۔

واضح رہے، بل و میلنڈہ گیٹس فاؤنڈیشن ۳۷ر ارب ڈالر (۳۲۵۶ر ارب روپے) کے اثاثے رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ دُنیا کی سب سے بڑی غیر سرکاری فلاحی تنظیم ہے۔ یہ تنظیم ۱۹۹۴ء سے اب تک فروغِ تعلیم، ترقی مناؤ اور انسانی صحت کے منصوبوں پر ۲۵ر ارب ڈالر (۲۲۰۰ر ارب روپے) خرچ کر چکی۔ اِتنی بڑی رقم کے استعمال کا اندازہ لگانا ممکن ہے کہ تنظیم کتنے بڑے پیمانے پر افریقا، ایشیا اور لاطینی امریکا کے غریب ممالک میں سرگرمِ عمل ہے۔

انسانی جانیں بچانے کا سوال

دنیا میں بل گیٹس کے مخالفوں کی کمی نہیں۔ بعض انھیں روایتی امیر سمجھ کر نفرت کرتے ہیں۔ غریب ممالک کے سوشلسٹ اور مذہبی راہنما ان کو سرمایہ دار مغرب کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ تاہم بل اس مخالفت کے باوجود اپنا کام کیے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ آمروں اور جرنیلوں سے بھی ملتے ہیں تاکہ ان کے ملکوں میں اپنے غریب دوست منصوبے شروع کرا سکیں۔ چنانچہ جمہوریت پسند مغربی ذرائع ابلاغ انھیں تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ گویا بل گیٹس کا یہ حال ہے کہ پرائے ہیں ناراض تو اپنے بھی ناخوش۔

بل کو سراہنے والے بھی بے شمار ہیں مثلاً مشہور ادویہ ساز کمپنی، نووارٹس میں شعبۂ تحقیق کے سربراہ اور ممتاز طبی سائنس داں، ڈاکٹر اینڈرین اوسوالڈ کا کہنا ہے ''بل ایسی طاقتور ہستی ثابت ہوئے کہ تن تنہا اپنی کوششوں سے انھوں نے کروڑوں غریب بچوں کو مرنے سے بچالیا۔''

تاہم بل گیٹس اپنی تعریف پر پھولے نہیں سماتے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھیں کامیابی اسی لیے ملی کہ ماہرین نے لیبارٹریوں میں جاں فشانی سے کام کرتے ہوئے نئی ویکسین تیار کیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اگر بل اربوں ڈالر فراہم نہ کرتے، تو انتہائی منظم ویکسین پروگرام عمل میں آنا تقریباً ناممکن تھا۔

پچھلے دنوں بل ہارورڈ یونیورسٹی، امریکہ میں طلبہ و طالبات سے خطاب کرنے گئے۔ اس محفل میں ایک طالب علم نے ان سے سوال کیا ''آپ اپنی کس اختراع کو اوّلیت دیتے ہیں..... مائیکروسافٹ ونڈوز کو یا ویکسین کے منصوبے کو؟''

انھوں نے کہا ''کمپیوٹر سافٹ ویئر پروگراموں کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن جہاں تک انسانی جانیں بچانے کا سوال ہے، اس اعتبار سے یقیناً ویکسین ہی کو برتری حاصل ہے۔'' اور یہ بات سولہ آنے درست ہے۔

پکاسو

زندگی کے ان گنت انوکھے رنگوں میں سے چند دل ہلا دینے والے رنگ

اقصیٰ فاطمہ

تابوتندوروالی کی پیش گوئی

دوسری جنگِ عظیم کو ۳ سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا تھا۔ جرمن اور جاپانی فوجوں کے تابڑ توڑ حملوں اور فتوحات سے انگریز حکومت گھبرا رہی تھی۔ اس میں وہ پہلے والا دم خم زوال پذیر تھا۔ ایشیا اور خصوصاً برصغیر میں جاپانی فوجوں کی سمندر اور خشکی کی طرف پیش قدمی انگریز سرکار کے لیے بہت بڑا خطرہ بنتی جا رہی تھی جس کا مقابلہ کرنے کی خاطر ہندوستان بھر میں جاپان اور جرمنی کے خلاف لڑنے کے لیے فوجی بھرتی کی مہم کو دُگنا کر دیا گیا۔ ویسے دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد ہندوستان بھر سے فوجیوں کی بھرتی کے لیے انگریز سرکار نے دن رات ایک کر دیا تھا تھا۔ ہر بڑے زمیندار چھوٹے موٹے سرکاری اہل کاروں اور بااثر اشخاص کو اپنے اپنے علاقوں میں فوجی بھرتی کرانے پر زمینیں انعام میں دی جا رہی تھیں۔ بلکہ انگریز افسر خود جگہ جگہ جا کر لوگوں کو زمینوں کا لالچ دیتے ہوئے فوج میں بھرتی ہونے کی ترغیب دیا کرتے۔

کہتے ہیں کہ پنجاب میں کسی ضلع کے دورے پر آئے ایک انگریز افسر کو بتایا گیا کہ فلاں علاقے میں ایک تندور والی مائی ہے جس کا اخلاق بہت اچھا ہے۔ وہ اپنے اچھے کردار کی وجہ سے پورے علاقے میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تندور اور کٹیا پر ہر وقت دور نزدیک کے گاؤں کی عورتوں کا ہجوم رہتا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ تندور پر بے تحاشا ہجوم ہونے کے باوجود کسی کو بھی ذرا بھر شکایت کا موقع نہیں دیتی۔ اگر ضلع کا ڈپٹی کمشنر اس تندور والی مائی کے پاس جا کر اسے کہے کہ وہ علاقے کے لوگوں کو فوج میں بھرتی کروائے تو لوگ جوق در جوق انگریز بہادر کی حکومت کو جرمنی اور جاپان کے حملوں سے بچانے کے لیے بھرتی ہونے لگیں گے۔

اماں تابو کو جس کی کٹیا اور تندور ساتھ ساتھ ہی تھے، علاقے کے تھانیدار اور مال افسر نے آ کر اطلاع دی کہ کل انگریز ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر تمھارے تندور پر تشریف لا رہے۔ تم نے کل صاف ستھرے کپڑے پہننے ہیں۔ اماں تابو نے تھانیدار سے ہاتھ باندھ کر عرض کی ”حضور مجھ سے انگریز سرکار کی شان میں کون سی خطا ہو گئی؟“ اسے بتایا گیا کہ تم سے کوئی خطا نہیں ہوئی بلکہ انگریز حکومت خود چل کر تمھارے پاس اس لیے آ رہی ہے کہ تم جرمن اور جاپانی فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے یہاں کے لوگوں کو انگریزی فوج میں بھرتی کراؤ۔

تندور والی اماں نے تھانیدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”پتر سنا ہے کہ انگریز کی حکومت ساری دنیا میں ہے۔ اگر اس کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ اپنی حکومت بچانے کے لیے اسے اب تابو تندور والی کی مدد مانگنی پڑ رہی ہے تو میری بات سن لو، اب یہاں سے انگریزی حکومت کے چل چلاؤ کے دن قریب ہیں۔“

(انگریز ڈپٹی کمشنر اور تابو تندور والی۔ منیر احمد بلوچ)

منفرد تہوار

شندور پولو میلہ

آسمان کو چھوتی بلند و بالا اور سفید پوش چوٹیاں..... چمکتے دمکتے، شور مچاتے، صاف شفاف پانی کے جھرنے اور آبشاریں، خشک و پتھریلے پہاڑوں کے بیچوں بیچ سرسبز و شاداب اور آباد وادیاں، کچے پتھریلے راستوں پر جاں گسل سفر اور پھر ۱۲ ہزار ۲۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ”دُنیا کی چھت“ کہلانے والا وسیع و عریض میدان، نیلگوں پانی کی وسیع و عریض اور دنیا کی منفرد ترین جھیل اور پھر اس کے ایک طرف دنیا کا منفرد ترین لاتعداد چنیوں کا عارضی شہر آباد ہے۔ اس شہر کے اندر ہر طرف قسم قسم کی بے شمار گاڑیاں کھڑی ہیں۔

یہاں دن چڑھے سورج کی حرارت سے رات کی روح تک کو کپکپا دینے والی خنکی کو مات دینے کے بعد میدان جتنا ہے۔ انہی علاقوں کے پلے بڑھے خوبصورت جوان اور خوب گٹھے جسم رکھنے والے گھوڑے اور ان پر سوار

اسی خطے کے چاق چوبند جوان ہاتھوں میں مخصوص لمبے ہاکی نما ”ہتھیار“ اٹھائے سامنے آتے ہیں۔ خوشیاں رقص کرنے لگتی ہیں، چہرے چمک اٹھتے ہیں، رنگ و نور کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ سرسبز و شاداب میدان میں گھوڑے سرپٹ دوڑتے ہیں تو دھول اڑنے لگتی ہے۔ گیند کو ضرب ملتی ہے تو فضا رنگا رنگ صداؤں سے چمک اٹھتی ہے۔

جی ہاں! یہ منظر ہیں چترال کے کوہ ہندوکش کے پہاڑی سلسلے میں واقع دنیا کے پولو گراؤنڈ شندور کے جہاں ہر سال ماہ جولائی کے پہلے عشرے میں ”بادشاہوں کا کھیل“ اور ”کھیلوں کا بادشاہ“ کہلانے والے کھیل، پولو کے دنیا بھر میں اپنی طرز کے منفرد ترین مقابلے ہوتے ہیں۔ ہر سال ماہ جولائی شروع ہوتے ہیجیوں، طاقتور گھوڑوں، کاروں، موٹر سائیکلوں اور پیدل چلنے کی ہمت مرداں رکھنے والوں کے قافلے شندور پہنچنے لگتے ہیں۔ یہاں تین روز تک مسلسل چترال اور گلگت بلتستان کی ٹیموں کے درمیان پولو کے میچ ہوتے ہیں، جنہیں دونوں خطوں میں سب سے بڑے تہوار کی حیثیت بھی حاصل ہے۔

دنیا کے اس منفرد ترین مقام پر پولو کا آغاز ۱۹۳۶ء میں انگریز کرنل ایولن بے کوب (Evelyn Hey Cob) نے کیا تھا۔ یہاں تک پہنچنے کا سفر کافی تکلیف دہ اور مشکل ہے۔ سفر کی کرب و درد کی کیفیات یہاں کی صحت افزاء ہوائیں اور جھاگ اڑاتے تیز رفتار چشموں کا معدنی پانی ختم کرتا ہے۔ یہاں کا وسیع و عریض میدان، سفید لباس میں ملبوس چوٹیاں اور پھر ٹھنڈی ہوائیں جب جسم و جاں سے ٹکراتی استقبال کرتی ہیں تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے برسوں کی حسرت ہی نہیں بلکہ ”من کی مراد“ بھی

ایک تھپڑ نے ٹنڈولکر کی آنکھیں کھول دیں

بچپن میں لگنے والے ایک زوردار تھپڑ نے سچن ٹنڈولکر کو کرکٹ کا لیجنڈ بنا دیا۔ سچن ٹنڈولکر نے اپنے سکول کوچ راما کانت آچریکر کی ۷۹ روپیں سالگرہ کے موقع پر بتایا کہ اسکول سے چھٹی کے بعد کوچ میچوں کا انعقاد کرتے تھے۔ ایک بار میں میچ کھیلنے کے بجائے وانکھیڈے اسٹیڈیم میں میچ دیکھنے چلا گیا۔ اتفاق سے وہاں میرے کوچ راما کانت بھی موجود تھے۔ میں انھیں دیکھ کر ان کے پاس گیا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے میچ میں کیا پرفارم کیا! میں نے کہا کہ میں نے آج میچ نہیں کھیلا۔ یہ سن کر کوچ نے میرے گال پر زوردار طمانچہ مارا جس سے میں حواس باختہ ہوگیا۔

انھوں نے مجھے کہا کہ اسٹیڈیم میں بیٹھ کر دوسروں کو کھیلتا دیکھنے کے بجائے ایسا کھلاڑی بنو کہ دنیا تمھیں دیکھنے اسٹیڈیم آئے۔ ٹنڈولکر بتاتے ہیں کہ راما کانت کے ان الفاظ نے میری زندگی بدل دی۔ اس کے بعد میرے ذہن میں بس یہی بات گردش کرتی رہی کہ مجھے بہت بڑا کھلاڑی بننا ہے۔

پوری ہوگئی۔

شندور میں دنیا کے منفرد تین روزہ پولو میلے کی ترتیب یوں ہوتی ہے کہ یہاں مجموعی طور پر تین دن میں کل پانچ میچ ہوتے ہیں۔ دونوں طرف سے چھ چھ گھڑسوار میدان میں اترتے ہیں۔ پہلے چار میچوں میں جیتنے اور ہارنے والے دونوں ہی میدان سے باہر ہو جاتے ہیں اور پھر آخری روز اصل اور فائنل میچ ہوتا ہے۔ لیکن اس میچ کا پہلے کھیلے گئے چار میچوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ ہی وہاں سے جیت کر آگے آتا ہے یعنی یہاں کا ہر میچ اپنی جگہ فائنل ہی ہوتا ہے۔ یہاں کھیلی جانے والی پولو کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کھیل کا کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا۔ اسے یہاں فری سٹائل پولو کہا جاتا ہے۔ دوران کھیل ''لاقانونیت'' کا حال اس حد تک ہوتا ہے کہ اگر گیند تماشائیوں کے ہاتھ بھی آجائے تو وہ بھی اسے اپنی مرضی سے جس طرف چاہیں، پھینکنے کے مجاز ہوتے ہیں۔ شندور پولو میلہ شروع ہونے سے پہلے سکیورٹی فورسز علاقے کا انتظام سنبھال لیتی ہیں۔

دن بھر کبھی پولو تو کبھی کھانے اور چائے کی تیاریاں اور کبھی گپ شپ اور کبھی جھیل کنارے چہل قدمی ہوتی ہے۔ رات کو ٹھنڈی یخ بستہ ہواؤں کے ساتھ علاقائی ثقافتی محفلیں بھی بپا ہوں تو گرم علاقوں سے آئے لوگوں کو بھی سرد ہوائیں خیمے چھوڑ کر باہر نکلنے سے روک نہیں پاتی۔ پولو میلے کے دوران اور خصوصاً آخری روز وہ منظر سب سے خوبصورت، دلنشیں اور دل پذیر ہے جب آس پاس کی چھوٹی بڑی ٹیکریوں سے ماہر پیراگلائیڈرز چھلانگ لگاتے، اڑان بھرتے اور پھر ہزاروں لوگوں کے اوپر دیو ہیکل

''پندوں'' کی طرح پروازیں کرتے ہیں۔ لیکن یہ ''پندے'' جہاں بڑی جسامت کے ہیں، وہیں رنگ برنگے بھی ہوتے اور دل کو موہ لیتے ہیں۔ آخری رات کا وہ منظر بھی اپنی جگہ بہت دلکش و حسین ہوتا ہے جب آسمان رنگا رنگ آتش بازی سے کسی پھولوں بھری وادی کی طرح کھل اٹھتا ہے۔

یہ وہ مناظر ہیں جنھیں اتنی بلندی پر مارا ماری کے بعد یہاں پہنچ کر پہلے صرف تصور یا خواب کی حد تک سوچا ہی جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت سامنے آتے ہی دل و دماغ کی کیفیت ہی بدل جاتی ہے۔

شندور میلہ ختم ہوتے ہی ہزاروں خیموں کا شہر تیزی سے ''اجڑنے'' لگتا ہے۔ لوگ گاڑیوں میں سوار ہو کر ایک طرف چترال کی جانب نیچے اترتے ہیں تو دوسری طرف کے قافلے گلگت کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں مقامی چترالی بچے، عورتیں اور دیگر لوگ شندور کے دیومالائی پرستان سے اترنے والے ان قافلوں کو ہلا ہلا، شور مچا اور خوشیاں منا کر رخصت کرتے ہیں۔ سورج ڈھلنے تک شندور کی آسمانی چھت پر پڑاؤ ڈالنے والے لوگ غائب ہو جاتے ہیں۔

(شندور پولو فیسٹیول۔ علی عمران شاہین)

ماضی کی دلچسپ یادیں

گزرے زمانوں کو یاد کرتے رہنا کوئی اچھی بات نہیں، ماضی کو واپس لانا ممکن نہیں، اسی لیے اس میں کھوئے رہنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہی ہے۔ ہر اچھی سوچ اور باشعور انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ ماضی کے بجائے مستقبل پر نظر رکھے اور اسے بہتر بنانے پر توجہ دے۔ یہ سب کچھ جانتے اور سمجھنے کے باوجود ہم گزرے زمانوں اور اچھے زمانے کو اپنی یادوں کے ذخیرے سے نکالنے میں کبھی کامیاب نہ ہوئے۔

۲ روز قبل ہمیں اپنے نواسے فارس کے ویزے کے لیے اس کے ساتھ بذریعہ کار لاہور سے اسلام آباد تک سفر کرنا پڑا تو ہم چار پانچ گھنٹے ماضی کو یاد کرتے رہے، مثلاً جب ہمیں گیس پر چلنے والی اپنی کار میں ۳۶۰ کلومیٹر طے کرنے کے لیے تقریباً ایک ہزار روپے کی گیس بھروانا پڑی تو ہمیں گزشتہ صدی کے ۷۰ کے عشرے میں اپنی ۱۲ برس پرانے ماڈل والی کار اور اہل کپتان میں لاہور سے پنڈی اور مری کیے جانے والے کئی سفر یاد آئے۔ یاد رہے کہ جس سفر پر گیس کی خریداری میں ایک ہزار روپے کا خرچہ آیا ہے، وہ اگر پٹرول والی گاڑی میں کیا جاتا تو اس پر کم از کم اخراجات کا تخمینہ ۲ ہزار کے لگ بھگ ہوتا۔

ہم اگر نئی نسل کو یہ بتائیں کہ ہم اپنی پرانی کھٹارا گاڑی میں سفر ۱۸ روپے میں کرتے رہے تو بھلا کون اعتبار کرے گا؟ اس لیے تفصیل بھی بتانا ضروری ہے، ہماری پرانی گاڑی ایک گیلن پٹرول میں ۳۲ میل کا سفر طے کرتی تھی۔ لاہور اور راولپنڈی کا فاصلہ بھی میلوں میں ہمیں اب تک یاد ہے اور یہ ۱۷۸ میل تھا۔ گویا اس سفر کے لیے ہمیں ۶ گیلن پٹرول درکار ہوتا تھا۔ پٹرول کی قیمت ان دنوں ۲ روپے ۱۰ آنے گیلن تھی۔ اب آپ خود ہی سوچ لیجیے ہم کتنی ''کثیر'' رقم میں لاہور سے پنڈی اور پنڈی سے لاہور آ جا سکتے تھے۔

موٹر وے پر سفر کرتے ہوئے ہم ماضی کے جھروکوں سے ماضی میں اسلام آباد کے حالات کا آج سے موازنہ بھی کرتے رہے۔ اگلے روز حصول ویزا میں حائل مشکلات کو دیکھتے ہوئے ہمیں گزرا زمانہ واقعی سنہرا محسوس ہوا۔ مثلاً آج سے اٹھارہ بیس برس قبل جب ہم نے امریکی ویزا کی درخواست دی تو اس وقت کوئی فیس نہیں تھی۔ سفارت کاروں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہم نے ۶ ماہ کا ویزا مانگا تھا مگر جب پاسپورٹ واپس ملا تو ۵ سال کے ملٹی پل ویزے کا ٹھپا لگا ہوا تھا۔ ہمارے ایک تاجر دوست نے اس سے بھی پچیس تیس برس قبل کا یہ واقعہ بتا کر ہمیں حیران کر دیا کہ اس زمانے میں امریکہ کا ویزا طلب کرنے والوں کے نام امریکی سفارت خانے سے باقاعدہ شکریے کے خطوط ملتے تھے۔

لندن کا عقوبت خانہ

لندن کا عقوبت خانہ یورپ بھر میں سیاحوں کی دلچسپی کا سب سے بڑا اور اہم مرکز ہے۔ وہ دنیا بھر کے لوگوں کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ لوگ اس کی ہیبت ناکی کے باوجود ڈرے سہمے اس کی طرف کھنچے چلے آتے اور دہشت ناک مناظر سے خوف زدہ ہو کر واپس جاتے ہیں۔ یہ لندن برج کی سرد اور نحوست کی علامت سمجھی جانے والی بے رحم محرابوں کے نیچے واقع ہے۔ یہ جگہ یقینی طور پر کمزور دل لوگوں کے دیکھنے کی نہیں کیونکہ یہاں آنے والے لوگ

قرونِ وسطیٰ کے پُرتشدد، ایذا رسانی، پھانسی کے مہیب اور کریہہ مناظر کا دل ہلا دینے والا مشاہدہ کرتے ہیں۔

سرد اور تاریک تہ خانوں میں واقع یہاں کی کال کوٹھریاں یورپ کے ان سیاحتی مقامات میں شامل ہیں جو مخصوص طرز کے حوالے سے سیاحوں کے لیے باعثِ کشش ہیں۔ یہ مقامات سیاحوں کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ تاریخ کے سیاہ پہلو سے ایک دہشت ناک سفر کی ابتدا کریں۔ ان میں قیدیوں پر تشدد کرنے والے متعدد خوفناک ہتھیار بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کو دیکھ کر سیاحوں کی تھرتھری چھوٹ جاتی ہے اور وہ خوف سے لرزنے لگتے ہیں۔ یہ غیر یقینی حد تک شیطانی اور ظالمانہ مناظر ہوتے ہیں۔

''نام میں کیا دھرا ہے''

بھارتی ریاست اُتر پردیش میں پولیس کا کہنا ہے کہ ایک دلت لڑکے کو مبینہ طور پر اس لیے قتل کر دیا گیا ہے کیونکہ والد نے اس کا وہی نام رکھا تھا جو ایک اونچی ذات والے ہندو پڑوسی کے بیٹے کا نام تھا۔ نیرج کی عمر ۱۴؍برس

تھی اور اس کی لاش ۲۳؍نومبر کو ایک کھیت میں ملی۔ پولیس کا کہنا ہے کہ نیرج کے والد رام کمار سے پڑوسی جواہر چودھری نے اپنے دونوں بیٹوں کے نام بدلنے کے لیے کہا تھا کیونکہ جواہر چودھری اور رام کمار کے بیٹوں کے نام ایک جیسے تھے۔ رام کمار اور جواہر چودھری، دونوں کے دو دو بیٹے ہیں اور ان دونوں کے نام نیرج اور دھیرج ہیں۔ بستی کے ایک سینئر پولیس اہلکار کا کہنا ہے کہ اس بات پر دونوں خاندانوں میں بہت عرصے سے جھگڑا تھا۔ جواہر چودھری کے دونوں بیٹے فرار ہو چکے۔

پیرس کا زیرِ زمین قبرستان

فرانس کے دارالحکومت پیرس کے مرکزی علاقے میں عہدِ وسطیٰ کے قبرستانوں کی بہتات تھی۔ اس وجہ سے بہت سے ترقیاتی کام نہیں ہو پا رہے تھے اور متعدد منصوبے تعطل کا شکار ہو گئے تھے۔ چنانچہ اٹھارویں صدی کے اختتام پر فرانس کی حکومت نے فیصلہ کیا کہ زیرِ زمین بڑی بڑی اجتماعی قبریں تیار کر کے ان میں ماضی کے مردوں کی ہڈیاں دفن کر دی جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور صرف ۱۸؍ماہ کی مدت میں لگ بھگ ۶۰؍لاکھ افراد کی باقیات پیرس کے مرکزی قبرستانوں سے نکال کر ان اجتماعی قبروں میں دفن کر دی گئیں۔ ان کا تعلق ۱۷۸۵ء کے زمانے سے تھا۔ یہ باقیات شہر میں بڑی بڑی ٹھیلے نما گاڑیوں میں لاد کر رات کے اندھیرے میں زیرِ زمین بنے قبرستانوں میں بڑے بڑے ڈھیروں کی صورت منتقل کر دی گئیں۔

ان نئے قبرستانوں کو عموماً ''ایمپائر آف ڈیتھ'' کا نام دیا جاتا ہے۔ نئی اجتماعی قبروں پر مشتمل یہ پورا نیٹ ورک زیرِ زمین لگ بھگ ۲۰۰؍میل گلیوں پر مشتمل ہے۔ اس میں مردوں کی لاکھوں کروڑوں ہڈیاں رکھی ہوئی ہیں۔ اس کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ ہی عوام الناس کے دیکھنے کے لیے کھلا ہوا ہے جو یقینی طور پر خاصا دہشت ناک منظر پیش کرتا ہے۔ انسانی ہڈیوں اور بے شمار کھوپڑیوں کو مختلف طریقوں اور شکلوں میں رکھا گیا ہے۔ بعض کو صلیب کی شکل میں رکھا گیا ہے، بعض کو چہروں کی شکل میں اور بعض کو اس طرح کہ یہ دیوار کی آرائش بنی ہوئی ہیں بڑے بڑے ڈھیروں کی صورت میں۔ یہ مناظر بہت خوفناک ہیں، اس لیے انھیں دیکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

جیل جانے کے بجائے ''دُبئی چلو''

چین کی حکومت نے حال ہی میں ۲؍لاکھ قیدی دبئی میں لا کر ان سے تعمیرات کروا کر انھیں پڑھایا، لکھایا اور اچھا شہری بنا کر واپس ملکی ترقی کے لیے تیار کیا۔ اس وجہ سے وہ جرم کرنے کے بجائے اب اچھے شہری بن گئے ہیں۔

2022 میں خوش آمدید

☆ امریکا جب بے تار (وائرلیس) بجلی بھجوانے میں کامیاب ہوجائے گا

☆ کھڑکیوں کے شیشے سکرین اور شمسی پینل بن جائیں گے

☆ جب دفتر میں ۸۰/۹۰ سال کے بوڑھے کام کریں گے

☆ ۲۰۱۲ء میں مرغی کا گوشت مصنوعی طور پر بن سکے گا

☆ موبائل فون آج کے سپر کمپیوٹر سے زیادہ طاقتور ہوگا

☆ تھری ڈی پرنٹر ایجاد ہوجائیں گے

☆ سمندری گھاس سے تیل بنے گا

سید عاصم محمود

امریکا

کے مشہور موجد، سٹیو جابز نے ایک موقع پر کہا تھا ''پیش گوئی کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مستقبل ایجاد کرلیا جائے۔'' یوں بقول سٹیو، طویل مدتی پیش گوئیاں کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

تاریخ پر نظر دوڑایئے، تو معلوم ہوتا ہے کہ پیش گوئیوں کا کاروبار خطرناک ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی کئی پیش گوئیاں تاریخی کسوٹی پر غلط ثابت ہوئیں جنھیں اپنے زمانے میں ۱۰۰ رفیصد درست سمجھا گیا تھا۔ دوسری طرف ایسی پیش گوئیاں تاریخ کا حصہ ہیں جنھیں ان کے دور میں ناقابل یقین سمجھا گیا، مگر وہ درست ثابت ہوئیں۔

۱۸۹۹ء میں ایجادات رجسٹرڈ (پیٹنٹ) کرنے والے امریکی سرکاری ادارے کے سربراہ نے دعویٰ کیا تھا کہ اب تک جتنی ایجادیں ہوئی تھیں، وہ سامنے آچکی۔ لیکن سبھی نے دیکھا کہ بیسویں صدی میں ایسی انقلابی ایجادات سامنے آئیں کہ انھوں نے بنی نوع انسان کے انداز واطوار ہی بدل ڈالے۔ اسی طرح کئی ایجادات مثلاً ٹیلی ویژن، کار اور خلائی جہازوں کے متعلق پیش گوئیاں ہوئیں کہ وہ زیادہ عرصہ نہیں چل سکیں گی۔ لیکن وہ بھی غلط ثابت ہوگئیں۔

پیش گوئیوں کی تیسری قسم بھی ہے..... وہ جو ہونی چاہئیں مگر معرضِ وجود میں نہیں آتی۔ مثلاً عرب بہار، یورو بحران یا حادثہ ۹/۱۱ کے بارے میں پیش گوئیاں۔ لیکن سائنس و ٹیکنالوجی کی محیر العقول ترقی کے بعد خصوصاً مغرب میں مستقبلیات کا باقاعدہ ایک علمی شعبہ وجود میں آچکا۔ اس شعبے سے منسلک ماہرین سائنس، معاشیات، عمرانیات وغیرہ کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ مستقبل میں جھانک کر اندازہ لگائیں کہ اگلے دس پندرہ برس میں ایک شعبے مثلاً شعبہ توانائی یا شعبہ ٹیکنالوجی کی کیا حالت ہوگی۔

نئے سال کے آغاز پر مشہور امریکی رسالے، فورچون نے ماہرین مستقبلیات سے رائے لی کہ ۲۰۲۲ء تک مخصوص شعبوں کی صورت حال کیا ہوگی؟ نتیجے میں مثبت اور منفی، دونوں قسم کی پیش گوئیاں سامنے آئیں۔ منفی میں سائبر دہشت گردی اور دنیا بھر میں سیاسی ابتری نے سرفہرست جگہ بنائی۔ تاہم یہ چشم کشا خوش خبری بھی سامنے آئی کہ ذہن چکرا دینے والی سائنسی و تیکنیکی ایجادات ہمارے رہنے بسنے اور کام کرنے کے انداز بالکل بدل ڈالیں گی۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ تکنیکی تبدیلیاں امریکی معیشت کو بھی زوال سے نکال کر دوبارہ اپنے پیروں پہ کھڑا کر دیں گی۔ یہ تبدیلیاں اگرچہ بعض لوگوں کو ناگوار گزریں گی۔ مثلاً بابوں کو دفتر میں جمہوریت کی آمد قبولنی ہوگی۔ کاروبار میں وراثتی سلطنتیں جاتی رہیں گی۔ بلکہ بعض کاروبار تو لیڈر کے بغیر کام کریں گے۔ یہ عین ممکن ہے کہ سب سے بہترین خیال کمپنی کے جونیئر ترین افسر..... یا ادارے کے باہر سے آئے۔

جدید ترین کاروباری رجحانات پر تحقیق کرنے والے امریکی ماہر، ڈان سکوٹ کا کہنا ہے: ''ایک زمانے میں کاروباری حلقوں میں یہ کہاوت مشہور تھی کہ ہمارا بہترین سرمایہ (ملازمین) ہر شام رخصت ہو جاتا ہے۔ لیکن مستقبل میں کمپنیوں کا بہترین سرمایہ شاید دفتر میں داخل ہی نہیں ہوگا۔''

امریکہ کا دفاعی سرکاری ادارہ، ڈرپا (ڈیفنس ایڈوانسڈ ریسرچ پروجیکٹس ایجنسی) تو سوشل میڈیا کے ذریعے نئے خیالات اور نیا خون سامنے لا رہا ہے۔ ادارے کے سربراہ، ریگن دوگان کہتے ہیں: ''یہ عین ممکن ہے کہ کوئی ۱۳ رسالہ بچی سرطان کا علاج دریافت کرلے!''

ڈرپا نے مئی ۲۰۰۸ء میں انٹرنیٹ پر ایک کمپیوٹر گیم، فولڈٹ (Foldit) جاری کی تھی۔ گیم میں مقابلہ کرنے والے پروٹین کو دوہرا (Fold) کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہی عمل کئی امراض کا علاج دریافت کرنے کے سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ آج دنیا بھر میں ڈھائی لاکھ استعمال کنندگان فولڈٹ کھیلتے ہیں۔ ان کی کوششوں

سے ایسے خامرے (انزائم) کا ڈھانچہ سمجھنے میں مدد مل رہی ہے جو بندروں میں ایڈز پیدا کرتا ہے۔ رگبن کا کہنا ہے ''جب بہت سارے لوگ مل جل کر ایک مسئلے پر کام کریں، تو اس کا حل نکالنا آسان ہو جاتا ہے۔

۲۰۲۲ء کا سی۔ای۔او (چیف ایگزیکٹو افسر) بھی آج کے باسوں سے مختلف ہوگا۔ تب اُسے بڑا پیچیدہ انتظام دارومدار انہی پر ہوگا۔ مغربی یورپ، جاپان اور روس میں نوجوان نایاب ہیں، اسی لیے وہ آگے چل کر ناخصے معاشی مسائل میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں امریکہ خاصا خوشقسمت ہے۔

آج امریکیوں کا سب سے بڑا خوف یہ ہے کہ اگلے ۱۰ برس میں چینی ہر وہ شے بنا رہے ہوں گے جو اب سنبھالنا پڑے گا، کیونکہ گاہوں سے لے کر ملازمین تک کئی لاکھ لوگ بذریعہ فون، موبائل، انٹرنیٹ، سینسرز اور دیگر کئی مشینیں اس سے تعلق رکھیں گے۔ جی۔ای۔او اپنے اوپر ہونے والی معلومات و اعداد و شمار (ڈیٹا) کی بھرمار سہار لیں گے، کامیابی انہی کے قدم چومے گی۔

مستقبل میں تکنیکی صلاحیتوں سے آراستہ نوجوان بہت اہمیت رکھیں گے، کیونکہ کمپنیوں کی کامیابی یا ناکامی کا امریکی بنانے میں۔ وجہ یہی ہے کہ چینی بڑی تیزی سے ہر امریکی ساختہ شے کی نقل کرنے میں مصروف ہیں۔ اسی لیے امریکیوں کی اب کوشش ہے کہ وہ ایسی ایجادات تخلیق کریں جن کی نقل اتارنا مشکل ہو۔ ذیل میں ایسی ہی کچھ اختراعات کا ذکرِ خیر ہے جو ۲۰۲۲ء تک معرضِ وجود میں آ سکتی ہیں۔

کیا میں ریٹائر ہو جاؤں؟

اس آدمی نے اپنا ہیلمٹ اتارا تو گنجا سر اور سفید بھنویں سامنے آگئیں۔ اُدھر ایک ۷۰ سالہ خاتون دفتر میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے کمر میں پیٹ دبلا رکھنے والی پٹی باندھ رکھی تھی۔ تیسری خاتون موٹے شیشوں والی عینک پہنے سارٹ فون کو گھور رہی ہے۔ اس کے ہندسے موٹے ہیں تاکہ صاف دکھائی دے سکیں۔ یہ بوڑھوں کا کوئی اشتہار نہیں بلکہ یہ مستقبل کے ملازم ہیں۔

دنیا میں زیادہ سے زیادہ عمر تک کام کرنے کا رجحان جڑ پکڑ چکا۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۰۲۲ء میں کام کرتے بوڑھے مردوزن کی تعداد آج کی نسبت دگنی ہوگی۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خصوصاً ترقی یافتہ ممالک میں بوڑھے اتنے صحت مند ہوں گے کہ ۸۰ یا ۹۰ سال کی عمر تک بھی مصروف کار رہیں۔

اگلے ۱۰ برس کے دوران شعبۂ طب میں انقلاب آنے کی پیش گوئی ہے۔ مثلاً ۲۰۲۲ء تک مختلف مصنوعی جسمانی اعضا بن جائیں گے۔ لہٰذا آنکھ، گردہ یا دل بھی خراب ہوا، تو بازار سے نیا لے آیے۔ پھر نئی ادویہ بوڑھوں کی کئی بیماریوں کا خاتمہ کر ڈالیں گی۔ لہٰذا انھیں موقع ملے گا کہ دفاتر یا کارخانوں میں کام کر سکیں۔

تاہم بوڑھے ملازمین کے باعث نئے مسائل بھی جنم لیں گے۔ مثلاً یہ کہ اگر وہ نشست ہی نہیں چھوڑیں گے، تو نئی ملازمتیں کیونکر جنم لیں گی؟ پھر ادارے جو طب سے متعلق رقم ملازموں کو دیتے ہیں، وہ بھی بڑھ جائے گی۔

سپر کمپیوٹر سے طاقتور سمارٹ فون

اس وقت دنیائے انٹرنیٹ سے ۴۰ کروڑ آلات منسلک ہیں۔ ان میں بیشتر تعداد کمپیوٹر، موبائل فون اور پرنٹروں کی ہے۔ لیکن ماہرین کا کہنا ہے کہ ۲۰۲۲ء تک ''پچاس ارب'' آلات نیٹ سے منسلک ہوں گے۔ ان میں کاروں سے لے کر گھریلو برقی اشیا تک شامل ہوں گی۔ چنانچہ تب کمپنیوں کو ڈیٹا سائنس دانوں کی ضرورت پڑے گی تاکہ وہ سیکڑوں اقسام کا ڈیٹا منظم کر سکیں۔

۲۰۲۰ء تک ایسے سارٹ فون دستیاب ہوں گے جن کا پروسیسر کئی گیگا ہرٹز طاقت رکھے گا۔ نیز ان میں کئی گیگا بائٹ ڈیٹا ذخیرہ ہو سکے گا۔ گویا اس زمانے کا سارٹ فون طاقت میں آج کے سپر کمپیوٹر جیسا ہوگا۔

یوں ایسے سارٹ فون کی بدولت ممکن ہوگا کہ عام آدمی بھی بس اسٹاپ پر سواری کا انتظار کرتے ہوئے اپنے انتہائی پیچیدہ مسائل حل کر سکے۔ یہی سارٹ فون پھر بے تار (وائرلیس) نیٹ ورک کا کام بھی دیں گے۔ کیونکہ انتہائی طاقتور ہونے کی وجہ سے ان کے ذریعے بڑی سے بڑی تصویر بھیجنا بھی ممکن ہوگا۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۲۰ء کا سارٹ فون بہ لحاظ تیز رفتاری اور ذخیرہ اتنا موثر ہوگا کہ اس میں دنیا کے سب سے بڑے کتب خانے، لائبریری آف کانگریس کی ساری کتابوں جتنا مواد (ڈیٹا) سما سکے۔

گھٹتی جگہ کا علاج

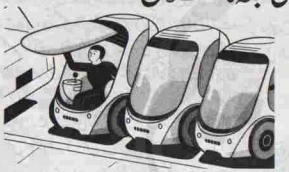

وہ دیکھیے، مشہور انگریزی کارٹون، جیٹ سنز میں دکھائی جانے والی کار سے ملتی جلتی گاڑی ایم۔آئی۔ٹی میڈیا لیبارٹری میں کھڑی ہے۔ یہ تحقیقی ادارہ سائنس و ٹیکنالوجی سے متعلق ممتاز امریکی یونیورسٹی، ایم۔آئی۔ٹی سے منسلک ہے۔

بجلی سے چلنے والی اس گاڑی کو معمولی مت سمجھیے۔ جب اسے کھڑا کیا جائے، تو پچھلا حصہ چیسی (Chassis) کے نیچے چلا جاتا ہے۔ یوں گاڑی کی لمبائی ۵۰ فیصد کم ہو جاتی ہے۔ اس طرح ''سٹی کار'' کو تنگ جگہوں ہر کھڑا کرنا بھی ممکن ہے۔ تب ڈرائیور اور سواریاں سامنے نصب اکلوتا دروازہ کھول کر باسانی اتر آتی ہیں۔

یہ تجرباتی سٹی کار شہروں میں تیزی سے بڑھتی آبادی اور گھٹتی جگہ کے باعث وجود میں آئی۔ دنیا کی آبادی سات ارب ہو چکی اور اس میں سے آدھے انسان شہروں میں آباد ہیں۔ لہٰذا آبادی بڑھنے کی وجہ سے شہروں میں جگہ کمیاب ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے میں چھوٹی گاڑیاں ہی چلن بن جائیں گی کیونکہ انہی کی بدولت وقت بچانا ممکن ہوگا۔ نیز سائیکلوں سے لے کر گاڑیاں تک کرائے پر لینا معمول بن جائے گا۔

ایم۔آئی۔ٹی لیب ہی میں ایسے گھریلو فلیٹ بنانے پر تجربات جاری ہیں جنھیں جب چاہے پھیلایا یا سمیٹا جا سکے گا۔ یہ گھر لچک دار لیکن انتہائی مضبوط مادوں سے بنیں گے۔ ماہرین کی رو سے ایک ایسے چھوٹے فلیٹ کی قیمت ۳۰ ہزار ڈالر ہوگی۔

۵۰۰ میل والی برقی کار

تیل کی بڑھتی قیمتوں نے مغرب ہی نہیں چین میں بھی ماہرین کو مجبور کردیا ہے کہ اب وہ بجلی سے چلنے والی کاریں ایجاد کریں۔ برقی کاروں کے ساتھ بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ابھی تک ایسی بیٹری ایجاد نہیں ہوئی جس میں وافر بجلی بھری جا سکے۔ کیونکہ بیٹری میں جتنی زیادہ بجلی بھرے گی، کار بھی اتنی ہی دور جائے گی۔

فی الوقت جاپانی کار، نسان لیف کی بیٹری اتنی طاقتور ہے کہ وہ ۱۰۰ میل تک جا سکے۔ اب ماہرین کوشش کر رہے ہیں کہ وہ تھیم ائر بیٹری ایجاد کرسکیں۔ واضح رہے، عام تھیم۔ آیون بیٹریاں مہر بند ہوتی ہیں۔ تیز ان میں ایک بڑا اور بھاری بھرکم دھاتی کیتھوڈ ڈالنا پڑتا ہے تاکہ وہ بجلی کا کرنٹ پیدا کرے۔

۱۹۹۵ء میں جاپانی ماہرین نے یہ نظریہ پیش کیا کہ بیٹری میں تھیم اور آکسیجن کے ملاپ سے کرنٹ پیدا کرنا ممکن ہے۔ ماہرین اب اسی نظریے کو عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ ایسی بیٹری میں دھاتی کیتھوڈ کی جگہ آکسیجن لے گی۔ یوں نہ صرف چھوٹی بیٹری تیار ہوگی، بلکہ اسے چارج کرنے پر ممکن ہوگا کہ کار ۵۰۰ میل تک چل سکے۔ یوں شعبہ ٹرانسپورٹ میں انقلاب آجائے گا۔

خلا میں بجلی کیسے بنے گی؟

۱۹۴۱ء میں مشہور امریکی سائنسی افسانہ نگار، اسحاق اسموف نے ایک کہانی تخلیق کی۔ اس میں پہلی بار خلا میں گھومتے ایسے بجلی گھر کا خیال پیش ہوا جو شمسی توانائی کی بدولت بجلی بنا کر زمین پر بھیجتا تھا۔

اب امریکا اور جاپان کے سائنس داں اسی سائنسی تصور کو حقیقت کا روپ دینا چاہتے ہیں۔ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ فوٹو وولٹک سیل والے پینل مواصلاتی سیاروں پر نصب کرکے انھیں خلا میں بھیجا جائے۔ چونکہ وہاں بادل ہوں گے نہ رات، لہٰذا سیل چوبیس گھنٹے دھوپ سے بجلی بنائیں گے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ وہ پینل زمینی پینلوں کی بہ نسبت ۴۳ گنا زیادہ مؤثر ہوں گے۔

جب وافر بجلی بن جائے، خلائی سیارہ انھیں مائیکروویو شعاعوں میں ڈھال کر زمین کی سمت بھیجے گا۔ زمین پر ایک ریسیور ان شعاعوں کو دوبارہ بجلی میں بدلے گا۔ وہ بجلی پھر قومی گرڈ میں شامل کر دی جائے گی۔ اُدھر جزیرہ ہوائی میں امریکی خلائی ادارے، ناسا کے سائنس داں، جان مینگکنس نے ایک سے دوسرے جزیرے تک بے تار (وائرلیس) بجلی بھجوانے کا کامیاب تجربہ کرلیا ہے۔

خلائی شمسی بجلی گھر کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ اخراجات ہیں۔ ایک ایسے بجلی گھر کے قیام پر فی الوقت اربوں ڈالر لاگت آئے گی۔

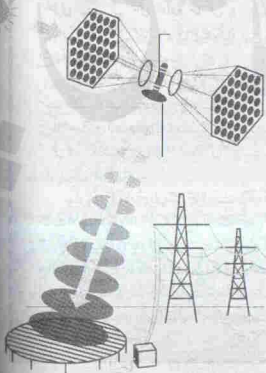

سمندری گھاس سے تیل کیسے بنے گا؟

دنیا بھر میں بعض فصلیں مثلاً مکئی نباتاتی ایندھن (بائیو فیول) بنانے میں استعمال ہونے لگی ہیں۔ اسی لیے مکئی کی قیمت بھی بڑھ گئی۔ لیکن اب ہر جگہ سے یہ احتجاجی آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ لاکھوں انسانوں کو پیٹ بھر خوراک میسر نہیں، دوسری طرف فصلیں ایندھن بنانے میں کام آرہی ہیں۔ انسانو! کچھ تو ہوش کے ناخن لو۔

اس احتجاج کے باعث ماہرین کی سعی ہے کہ کوئی ایسا پودا ڈھونڈا جائے جو بطور غذا مستعمل نہ ہو اور اس سے وافر ایندھن بھی بن سکے۔ چنانچہ اب سائنس دانوں کی نظر کائی (ایچی) سے ہوتی "سمندری گھاس" (Seaweed) پر جا ٹھہری ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ اگلے ایک عشرے میں کئی ارب گیلن نباتی ایندھن اسی سے بنایا جائے۔

سمندری گھاس کئی خصوصیات رکھتی ہے۔ اول یہ سب سے زیادہ تیز رفتاری سے اگنے والا پودا ہے۔ دوم اسے اگنے کے لیے کسی کھاد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پھر اسے دیگر فصلوں کے برعکس زیادہ زمین بھی نہیں چاہیے ہوتی۔ چہارم اس سے بنا نباتاتی ایندھن چلنے پر مکئی کی نسبت خطرناک ماحولیاتی گیسیں کم خارج کرتا ہے۔

سمندری گھاس کی ایک بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس کا آدھے سے زائد حصہ شکر (Sugar) پر مشتمل ہے اور ماہرین توانائی کی رو سے یہی مستقبل کا خام (Crude) ایندھن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شکر کو ایتھانول یا بوٹانول میں بآسانی بدلا جا سکتا ہے۔ یہی خاصیت مدنظر رکھ کر امریکا، فرانس اور جاپان میں سائنس داں ایسا کیمیائی عمل تخلیق کرنے کی تگ و دو میں ہیں جو شکر میں پوشیدہ توانائی کو نباتاتی ایندھن میں بدل سکیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ ایندھن دیگر کی نسبت سستا ہوگا۔

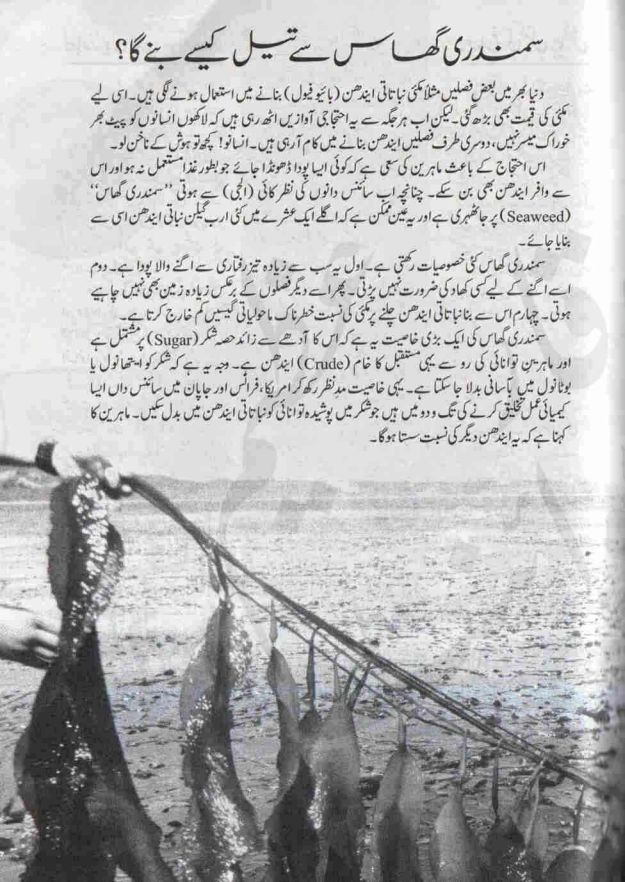

لیبارٹریوں میں اگتا گوشت

دنیا بھر میں سائنس داں جانداروں کے خلیوں کی مدد سے لیبارٹریوں میں گوشت ''اگانے'' کی کوشش کر رہے ہیں۔ بعض ماہرینِ طب ٹیسٹ ٹیوب مویشی پیدا کرنے کی سعی میں محو ہیں۔ مدعا یہی ہے کہ مستقبل میں یہ مصنوعی گوشت اور جانور اربوں انسانوں میں پروٹین کی ضرورت پوری کرسکیں۔

دنیا کی آبادی ۷؍ارب ہو چکی اور ۲۰۲۲ء تک مزید بڑھ جائے گی۔ لہٰذا تب مویشیوں کی موجود تعداد بھی انسانوں کو گوشت فراہم نہیں کر سکے گی۔ اسی لیے مصنوعی گوشت اور ٹیسٹ ٹیوب مرغ، بھیڑ اور گائے مارکیٹ میں آنا ناگزیر ہے۔ مزید براں اس طرح ماحولیاتی مسائل بھی حل ہوں گے۔ کیونکہ مویشی رہنے کی وسیع جگہ ماتھتے، کثیر مقدار میں پانی پیتے و چارہ کھاتے اور بذریعہ ڈکار اوزون دشمن گیسیں چھوڑتے ہیں۔

لیبارٹریوں میں مصروف کار سائنس دانوں کا سب سے بڑا مسئلہ سرمائے کی کمی ہے۔ تاہم آہستہ آہستہ بھی شعبے سے بغرض تحقیق انھیں رقم ملنے لگی ہے۔ حال ہی میں امریکی سائنسی ادارے، پیٹا (PETA) نے اعلان کیا ہے کہ جس ماہر نے جون ۲۰۱۲ء تک مصنوعی طور پر مرغی کا گوشت بنا لیا، اُسے ۱۰؍لاکھ ڈالر (۹؍کروڑ روپے) بطور انعام ملیں گے۔

دفاتر میں انقلاب

۱۰؍سال بعد دفاتر میں کام آسان بنانے والے نت نئے آلات آ جائیں گے۔ مثال کے طور پر دفتر کی کھڑکیوں پر نصب شیشے بیک وقت شمسی پینل اور ملٹی میڈیا اسکرین کا کام دیں گے۔ نیز ضرورت پڑنے پر انھیں دھندلا بھی کیا جا سکے گا تاکہ اندر کے مناظر چھپ سکیں۔

ہر کارکن کے پاس کمپیوٹر ہوگا۔ چنانچہ باس اسی کے ذریعے ہر کارکن کو بتائے گا کہ اسے کیا کام کرنا ہے۔ تاہم باس کی نگرانی کا تصور ختم ہو جائے گا کیونکہ ہر کسی کو اپنی ذمے داریوں کا بخوبی علم ہوگا۔ جس نے ذمے داری سے اپنا کام نہ کیا، وہ خود بخود نظام سے باہر ہو جائے گا۔

ٹیلی کانفرنسیں معمول بن جائیں گی۔ کانفرنس کے آلات ایک کمپیوٹر سے منسلک ہوں گے۔ اس کمپیوٹر میں موجود سافٹ ویئر ہر بولے گئے لفظ کو کسی بھی زبان میں ترجمہ کر دے گا۔ یوں دو مختلف زبانیں بولنے والے بھی بآسانی ایک دوسرے سے گفتگو کر سکیں گے اور مترجم کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

اس کے علاوہ تب تک تھری ڈی (سہ العبادی) پرنٹر بھی ایجاد ہو جائیں گے۔ یوں کمپنی کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ کسی بھی قسم کی مصنوعہ سالم حالت میں تجرباتی طور پر تیار کر سکے۔ اس طرح مصنوعہ کی خامیاں و خوبیاں سامنے آجائیں گی۔

دماغ کی مکمل پیمائش

انسانی دماغ اتنا پیچیدہ ہے کہ جدید سائنسی ترقی کے باوجود اُسے پوری طرح سمجھا نہیں جا سکا۔ تاہم سائنس داں کوشش کر رہے ہیں کہ اگلے دس برس میں اس کی مکمل پیمائش کرسکیں۔ وجہ یہ ہے کہ یوں دماغی ہی نہیں کئی جسمانی بیماریوں کا علاج ممکن ہو جائے گا۔

دماغ میں اربوں نیورون موجود ہیں۔ ماہرین نے ہر نیورون کی جینیاتی معلومات، شکل و صورت اور برقی سگنلوں پر تحقیق کر لی ہے۔ نیورونوں میں پوشیدہ ساری معلومات حاصل کرنے کی خاطر ایم۔آئی۔ٹی کے محقق نئے منے روبوٹ بنا رہے ہیں۔ یہ روبوٹ انسانوں کی نسبت دُگنی رفتار سے کام کریں گے۔

جب بھی انسانی دماغ میں موجود ہر نیورون کا مکمل خاکہ کمپیوٹروں میں محفوظ ہو، جینیتی علاج (تھراپی) میں انقلاب آجائے گا۔

جسم میں دل دراصل صدر کی حیثیت رکھتا ہے جبکہ دل کو وزیرِاعظم سمجھیے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک زمانے میں دل کو انسانی جسم کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کے شعرا نے جذبات و احساسات کا مرکز دل کو قرار دیا لیکن جدید سائنس نے انکشاف کیا کہ انسانی جذبات، خیالات و احساسات دماغ میں جنم لیتے ہیں، چنانچہ قدیم شعرا آج پیدا ہو جائیں تو شاید اپنے کئی شعر ضائع ہوتے دیکھ کر سر پیٹ لیں۔

اداکار اور صدر کا بیٹا

انیسویں صدی کے امریکہ میں ایڈون بوتھ عظیم ترین امریکی اداکار تھا۔ وہ امریکیوں میں دیومالائی شہرت کا حامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی عام نے اس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مین ہٹن، نیویارک جیسے اہم علاقے میں واقع ایک پارک میں ایڈون بوتھ کا مجسّمہ نصب کر دیا۔

عجیب واقعہ کیا پیش آیا؟

جب امریکہ میں خانہ جنگی جاری تھی، تو ایک بار ایڈون بذریعہ ریل نیویارک سے نیوجرسی سٹی گیا۔ جب وہ نیوجرسی اترا تو نعشِ عفیرات دیکھنے کے لیے امڈ آیا۔ شوریدہ ہجوم کی زد میں آ کر ایک لڑکا پلیٹ فارم سے عین اس وقت پٹڑی پہ گر پڑا جب ایک انجن چلا آ رہا تھا۔

اتفاق سے ایڈون سامنے ہی کھڑا تھا۔ وہ لپک کر لڑکے کے پاس پہنچا، اسے اٹھایا اور یوں اس کی جان بچا لی۔ حاضر دماغی اور دلیری کے اس واقعے کی بدولت ایڈون نے وہاں موجود سبھی لوگوں سے داد پائی۔ نیز اپنا نام امریکی تاریخ میں زریں حروف سے لکھوا لیا۔

بعدازاں زندہ بچ جانے والے لڑکے نے اس واقعے سے متعلق اپنے مضمون میں لکھا ''جب ہجوم کا ریلا آیا، تو میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور پٹڑی پر جا گرا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ اسی وقت ایک آدمی نے میرے کوٹ کا کالر پکڑا، مجھے اٹھنے میں مدد دی اور چبوترے پر لے آیا۔ جب میں نے مددگار کا شکریہ ادا کرنا چاہا، تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سامنے ایڈون بوتھ کھڑا ہے۔''

فرض کیجیے، آپ ایک نوخیز لڑکے کی حیثیت سے پٹڑی پہ جا گرے اور کوئی مشہور اداکار مثلاً ندیم یا شاہ رخ خان آپ کو بچا لے، تو آپ حیرت زدہ ہو جائیں گے، بس یہی ماجرا اس لڑکے کے ساتھ بھی پیش آیا۔

واقعہ عجیب تر کیوں ہوا؟

۲؍ ہفتے بعد ایڈون کو سربراہ امریکی فوج، جنرل الائیزا یس گرانٹ کے دفتر سے ایک تعریفی خط موصول ہوا۔ اس خط سے انکشاف ہوا کہ ایڈون نے جس لڑکے کو بچایا، وہ امریکی صدر، ابراہام لنکن کا فرزند، رابرٹ لنکن تھا۔

ایڈون نے بہادری کا جو کارنامہ انجام دیا، اس نے لنکن خاندان میں بوتھ فیملی کو متعارف کرا دیا۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ کئی ماہ بعد ایڈون کے بھائی، جان ولکنز بوتھ نے ایسا عمل کیا جو بالکل معکوس تھا..... یعنی اس نے صدر ابراہام لنکن کو قتل کر ڈالا۔

۲؍ بھائی ایک بائیک، ایک ٹیکسی

یہ ایک ایسے طبقے کی داستان ہے جس کا رونما ہونا ممکن تھا، لیکن جب وہ انجام پایا اور اس کی بابت لوگوں نے سنا یا پڑھا، تو حیرت کے مارے دانتوں تلے انگلیاں داب لیں۔ واقعے کے متعلق پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس کائنات عظیم میں انتہائی انوکھے واقعات بھی جنم لے سکتے ہیں۔

عجیب واقعہ کیا پیش آیا؟

جولائی ۱۹۷۵ء میں یورپی اور امریکی اخبارات نے زیرِ صفحہ اول پر چوکھٹا لگا کر شائع کی کہ جزیرہ برمودا کے علاقے ہملٹن میں ایک ٹیکسی نے ۱۷سالہ موٹر سائیکل سوار، ارسکائن لارنس ابین کو مار ڈالا۔

خبر کی خصوصیت یہ تھی کہ پچھلے جولائی کو اسی گلی میں ارسکائن کا بڑا بھائی بھی اسی ٹیکسی نے مار ڈالا تھا۔ دونوں لڑکے ۱۷ارسال کے تھے اور جی ہاں، وہ ایک ہی موٹر سائیکل چلا رہے تھے۔ دیکھیے یہ کیسا زبردست اتفاق ہے۔ درست کہ موٹر سائیکل ایک خطرناک سواری ہے۔ یہ بھی تسلیم کہ ہو سکتا ہے، دونوں بھائی تیز بائیک چلا رہے ہوں۔ پھر بھی ایسے اتفاق کم ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

واقعہ عجیب تر کیوں ہوا؟

دونوں بھائیوں کی قابل ایک ہی ٹیکسی تھی..... اسے ایک ہی ڈرائیور چلا رہا تھا اور دونوں بار مسافر بھی وہی تھے..... کمال کی بات ہے نا؟

بیک وقت دو جنم

ڈینک کیچم امریکہ کا مشہور کارٹونسٹ ہے۔ اس نے ایک کارٹون کردار ''ڈینس دی مینک'' (Dennis The Menace) تخلیق کیا جو ۱۴مارچ ۱۹۵۲ء کو پہلی بار بعض امریکی اخبارات میں مزاحیہ کہانی کی صورت شائع ہوا۔

عجیب واقعہ کیا پیش آیا؟

جب کیچم کا ڈینس دی مینک اخبارات کی زینت بنا، تو بحر اوقیانوس کے پار برطانیہ میں چند گھنٹے قبل ایک کامک (مزاحیہ) سیریز، دی بیانو (The Beano) کا شمارہ نمبر ۴۵۲ دکانوں پر پہنچا۔ اسی شمارے میں ایسا کارٹون کردار پہلی بار جلوہ گر ہوا جس نے اس کے خالق، ڈیوڈ لاکو عالمی شہرت یافتہ کارٹونسٹ بنا دیا۔ اس کارٹون کردار کا نام ڈینس دی مینک تھا۔

واقعہ عجیب تر کیوں ہوا؟

گویا امریکی اور برطانوی کارٹونسٹوں نے اپنے جو نئے کردار تخلیق کیے، ان کے نہ صرف نام ایک تھے، بلکہ وہ ایک ہی دن منظرِ عام پر آئے۔ کیا ایسا ہوا کہ امریکی کارٹونسٹ نے برطانوی معاصر کی نقل ماری اور بہت جلد اپنی تخلیق بھی مارکیٹ میں لے آیا؟ یا پھر برطانوی

کارٹونسٹ نے یہ حرکت فرمائی؟ آپ غلط سمجھے، ایسا کچھ نہیں ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ دونوں کارٹونسٹ ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ انھیں یہ بھی علم نہ تھا کہ سمندر پار دوسرا فن کار اس جیسا کارٹون کردار ہی تخلیق کر رہا ہے۔ غرض یہ بڑے اونچے پیمانے پہ محض اتفاق تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس حسنِ اتفاق کے علاوہ دونوں کارٹون کرداروں میں کوئی مطابقت نہ تھی۔ پینک کیٹم نے اپنے نٹ کھٹ بیٹے کو دیکھ کر اپنا کردار تخلیق کیا۔ ڈیوڈ لا کا کردار دراصل ایک سابق کامک سیریز کیلون اینڈ ہوبس کے کردار، کیلون کی تخلیق تھا۔

کیٹم اور ڈیوڈ، دونوں نے بعدازاں صلاحِ مشورے سے طے کیا کہ وہ علیحدہ علیحدہ اپنا کام جاری رکھیں گے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ڈینس دی مینک کے دونوں کرداروں نے اپنے اپنے حلقہ قارئین میں شہرت پائی۔

لیزہ کی واپسی

۱۹۹۷ء میں برطانیہ کی رہائشی، ۱۸ سالہ لیزہ کسی بات پر بغیر بتائے اپنا خاندان چھوڑ کر چلی گئی۔ چونکہ لیزہ کا باپ، مائیکل ڈک بیٹی سے شدید ناراض تھا، لہٰذا اس نے اُسے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے بیٹی یاد آنے لگی۔ آخر ۲۰۰۷ء مائیکل نے فیصلہ کیا کہ وہ ہر حال میں لیزہ کو ڈھونڈ کر رہے گا۔

عجیب واقعہ کیا پیش آیا؟

چنانچہ اس نے مقامی اخبار، سفولک فری پریس سے رابطہ کیا اور مدیر کو اپنی دستان سنائی۔ مدیر نے فیصلہ کیا کہ مائیکل کی کہانی شائع کی جائے تاکہ اسے دس برس سے بچھڑی بیٹی مل سکے۔ اخباری کہانی کی ضرورت کے مطابق مدیر نے خاندان بھر کی ایک تصویر کا بھی مطالبہ کیا۔ مدیر کا کہنا تھا کہ تصویر دیکھ کر لیزہ کو یقیناً اپنے پیاروں کی یاد ستائے گی۔

دوسرے دن گھر کے باہر مائیکل کی ۲ بیٹیاں اور ۲ بیٹے اپنے بچوں کے ساتھ کھڑے ہوئے اور اخباری فوٹوگرافر نے تصویر کھینچ لی اور واقعی تصویر نے کرشمہ کر دکھایا۔ ۲ دن بعد لیزہ والدین کے گھر آ پہنچی۔ اس موقع پر اشک بار و خوشی کے لمحات دیکھنے میں آئے۔

واقعہ عجیب تر کیوں ہوا؟

اخباری مضمون لیزہ کی نظروں کے سامنے سے بھی گزرا۔ جب وہ تصویر بغور دیکھ رہی تھی تو اس پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا..... تصویر جب کھینچی گئی، تو وہ اسی وقت پس منظر میں فٹ پاتھ سے گزر رہی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کا خاندان وہاں رہتا ہے۔ لیزہ یہ بھی نہ جان سکی کہ وہاں تصویر کھینچی جا رہی ہے۔

گویا کیا عجیب اتفاق ہے کہ ۱۰ برس بعد جب لیزہ کا خاندان اس کی گمشدگی کے متعلق ایک اخباری مضمون کی خاطر تصویر کھنچوانے لگا تو وہ ان کے پیچھے صرف ۲۰ میٹر دور کھڑی تھی۔ لیزہ نے بعدازاں اس اتفاق کو "انتہائی حیرت انگیز" قرار دیا اور کہا "شاید قسمت میں یہی لکھا تھا۔"

جاپان کی آسمانی ہوا

ایک قوم خاص طور پر غاصبوں کی زد میں ہو اور اس موقع پر موسم مدد کو آپہنچے، تو وہ خدا کا شکر ادا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر نپولین اور ہٹلر جیسے جنگ جوؤں نے روس پر حملہ کیا، لیکن دونوں کو برفانی طوفان کے باعث منہ کی کھانی پڑی۔ دونوں واقعات میں حقیقی عجوبہ پن یہ ہے کہ نپولین اور ہٹلر ایسے موسم میں حملہ آور ہوئے تھے جب برف باری کا نام و نشان نہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسے کئی موسمیاتی عجوبے موجود ہیں جو ہمیں دنگ کر دیتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۱۴ء میں غاصب برطانویوں نے واشنگٹن ڈی۔سی کی عمارتوں میں آگ لگا دی تاکہ امریکیوں کا دارالحکومت جل کر راکھ ہو جائے لیکن اسی دن واشنگٹن کی تاریخ کا پہلا ریکارڈ توڑ

بگولا نجانے کہاں سے نمودار ہو گیا۔ اس نے نہ صرف جلتی عمارتوں کی آگ بجھا ڈالی بلکہ برطانوی فوج کا سازوسامان بھی اڑا لے گیا۔ چنانچہ برطانویوں کو خوار ہو کر پسپا ہونا پڑا۔

لیکن موسمیاتی بوالعجبیوں کی سب سے مشہور مثال وہ ہے جو تاریخ میں "کامی کازی" (Kami Kaze) کے نام سے مقبول ہوئی۔ یہ تو بعد کی بات ہے کہ جاپانی خودکش پائلٹوں کے لیے یہ اصطلاح استعمال ہوئی۔

عجیب واقعہ کیا پیش آیا؟

یہ نومبر ۱۲۷۴ء کی بات ہے جب منگولوں نے سمندر کے راستے جاپان پر پہلا حملہ کیا۔ منگول فوج ۸۰۰ جنگی بحری جہازوں اور ۲۳ ہزار فوجیوں پر مشتمل تھی۔ منگول دو ہفتوں بعد جاپانی بندرگاہ، ہاکاتا بے پہنچ گئے اور وہاں اپنی ابتدائی چوکی قائم کر لی۔ اس زمانے کی جاپانی شاہی حکومت بہت کمزور تھی۔ لہٰذا صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ منگول سیلاب کے سامنے نہیں ٹھہر پائے گی۔ چنانچہ ۱۹ نومبر کو منگولوں نے حملہ کیا، تو انھیں اپنی جیت یقینی نظر آ رہی تھی۔

تبھی موسم نے مداخلت کر ڈالی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک زبردست سمندر طوفان نے ہاکاتا بے پر دھاوا بول دیا۔ وہ آناً فاناً جیسے پاتال سے نمودار ہوا اور منگولوں کے تین سو بحری جہاز نہ لے گیا۔ منگول پر جاپانیوں کے ساتھ مزید ایک دن لڑے، پھر جھنجلا کر بلی بنے وطن واپس روانہ ہو گئے۔ ان کی حالتِ زار دیکھ کر یہ بالکل نہیں لگتا تھا کہ یہ وہی منگول ہیں جنھوں نے کوریا سے ہنگری تک دنیا کو ہلا دیا اور کئی نامی گرامی سلطنتیں نیست و نابود کر دیں۔

لیکن منگول بھی ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھے۔ ۱۲۸۱ء میں وہ زیادہ بڑا لشکر لے کر پھر حملہ آور ہوئے۔ اس بار حملے میں ۴ ہزار جنگی بحری جہاز شریک ہوئے جن پر ایک لاکھ چالیس ہزار فوجی سوار تھے۔ مزید براں یہ حملہ دو اطراف چین اور کوریا سے کیا گیا۔ تب چین پر قبلائی خان کی حکومت تھی اور اس نے جاپان میں فتح یقینی بنانے کے لیے ہر ممکن وسائل استعمال کیے۔

ماہِ اگست کے وسط میں منگول ہاکاتا بے میں جاپانی فوجیوں سے ٹکرائی جہاں پہلے سال قبل اُسے پسپا ہونا پڑا تھا۔ اس بات بھی ان کی بیشتر جنگی جہاز تباہ و برباد ہو گئے..... اور منگولوں کی تباہی کا ذمے دار سمندری طوفان تھا۔

واقعہ عجیب تر کیوں ہوا؟

ممکن ہے، آپ سوچ رہے ہوں کہ شاید تب جاپان میں سمندری طوفانوں کا آنا جانا معمول تھا۔ آپ کی سوچ غلط ہے۔ ہاکاتا بے میں شدید سمندری طوفان آنا معمول نہیں، پھر منگولوں نے پہلا حملہ ماہِ نومبر میں کیا جب جاپان میں سمندری طوفان کا موسم ختم ہو جاتا ہے۔ (جاپان میں موسمِ گرما کے دوران سمندری طوفان آتے ہیں۔)

جاپانی موسمیات داں بتاتے ہیں کہ ایک سے تین سو سال کے درمیان شدید سمندری طوفان ہاکاتا بے پر بلا بولتا ہے لیکن یہ منگولوں کی بدقسمتی ہے کہ وہ جب بھی جاپان پر حملہ آور ہوئے، شدید سمندری طوفانوں کا نشانہ بن گئے۔ اسے اتفاق سمجھیے یا غیبی مدد!

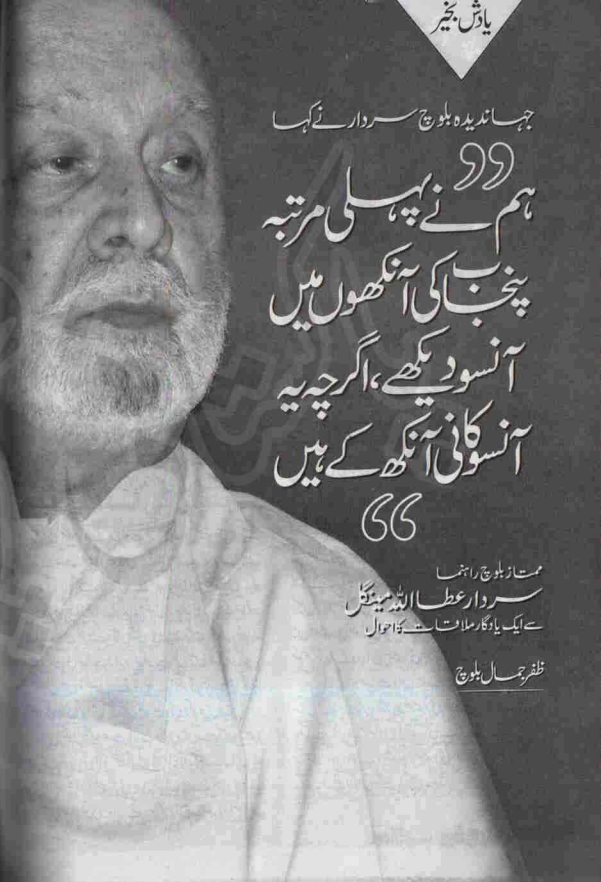

یادش بخیر

جہاں دیدہ بلوچ سردار نے کہا

ہم نے پہلی مرتبہ پنجاب کی آنکھوں میں آنسو دیکھے، اگرچہ یہ آنسو کانی آنکھ کے ہیں

ممتاز بلوچ راہنما
سردار عطاء اللہ مینگل
سے ایک یادگار ملاقات کا احوال

ظفر جمال بلوچ

یہ اُن دنوں کا ماجرا ہے، جب بھٹو صاحب کے دورِ حکومت میں نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت ختم کر کے بلوچستان میں گورنر راج نافذ کر دیا گیا اور صوبے میں فوجی کارروائی کا آغاز ہوا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے سردار عطاء اللہ مینگل کی حکومت کی برطرفی کے ذریعے جمہوریت اور جمہوری روایات کا قتل عام کیا اور بلوچستانی عوام کو احساسِ محرومی سے دوچار کر دیا۔

ان حالات میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان نے صدائے احتجاج بلند کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ بلوچستان کو دوسرا بنگلہ دیش بننے سے روکا جا سکے۔ جمعیت کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے میں نے اپنے دورے کا آغاز کوئٹہ سے کیا جہاں سائنس کالج میں طلبہ کا بھرپور جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں بلاشبہ ہزاروں طلبہ شریک تھے۔ اس موقع پر بھٹو کی طرف سے فوجی کارروائی اور صوبائی حکومت کی برطرفی کی پُرزور مذمت کرتے ہوئے جمعیت کی طرف سے بلوچستانی عوام اور نوجوانوں کے ساتھ مکمل یکجہتی کا اظہار کیا گیا۔

جلسے کے بعد دفتر جمعیت پہنچے تو معلوم ہوا کہ سردار عطاء اللہ مینگل نے رات کے کھانے کی دعوت دی ہے۔ یہ ان سے بلاشبہ پہلی ملاقات تھی۔ بہت محبت سے ملے، رہائش کا انتظام بھی خوب تھا۔ چونکہ سائنس کالج کی تقریر کی اطلاعات اُن تک پہنچ چکی تھی، اس حوالے سے انہوں نے جمعیت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھے یوں مخاطب کیا ''ہم نے پہلی مرتبہ پنجاب کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں، اگرچہ یہ آنسو کانی آنکھ کے ہیں۔''

میں نے موقع پاتے ہی کہا ''سردار صاحب! آپ کا گلہ ہے کہ آپ نے بلوچستان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے حوالے سے کبھی پنجاب یا باقی پاکستان کو آواز دی ہو یا ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جرنیلوں کی حکمرانی میں ہو یا سیاسی قیادتوں کی، کبھی نے ایک صوبے کی آواز دوسرے صوبوں تک پہنچنے سے روکی، بدگمانیاں پیدا کیں اور آپ لوگوں کو علیحدگی پسندوں اور دہشت گردوں کے طور پر پیش کیا۔ آپ اپنا مقدمہ دوسرے صوبوں میں پیش کر سکتے تھے۔ لیکن آپ نے بھی خود کو اپنے صوبے تک محدود کر لیا۔ پنجاب دوسرے صوبے تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے سے محروم رہے۔ ان حالات میں اُن سے کیسے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ صدائے احتجاج بلند کریں، یا اُن کی آنکھ سے آنسو نکلیں؟''

سردار صاحب کہنے لگے ''ہم علیحدگی نہیں چاہتے، ہمیں معلوم ہے کہ موجودہ حالات میں ''آزادی'' کے نام پر ہونے والی کوشش ہمیں ایک بڑی غلامی کی دلدل میں دھکیل دے گی۔ ہم آزادی کے نام پر یا تو بھارت کے غلام بنیں گے یا ایران کے۔ ہمیں ان میں سے کسی کی بھی غلامی قبول نہیں، لیکن ہم کیا کریں، جب میں دیوار کے ساتھ لگا دیا جائے تو جھنجھلاہٹ کے عالم میں حقائق نظرانداز کرتے ہوئے سخت قدم ناگزیر ہو سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ آیندہ نسلوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ہم نے نوجوانوں کے جذبات کے سامنے بند باندھنے کی کوشش کی ہے۔ اگر حکمرانوں نے ہمیں کوئی راستہ نہ دیا تو یہ بند ٹوٹ بھی سکتے ہیں۔ اس صورت میں ہم کچھ نہ کر سکیں گے۔''

مجھے اُن کی باتوں میں خلوص، حب الوطنی اور دردمندی کی خوشبو محسوس ہوئی۔ میں نے اُن سے کہا: ''ہماری بدنصیبی ہے کہ ملک قائداعظم اور شہید ملت کے بعد قدآور شخصیات سے محروم ہو گیا۔ آج یہاں بونوں کی حکمرانی ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ کوئی قدآور شخصیت اُن کے مقابل آئے۔ آپ لوگوں کے رویوں نے اُن کے لیے مزید آسانیاں پیدا کر دیں۔ آپ بلوچستان سے باہر نکلیں، بلوچیوں کا مقدمہ پیش کریں، جمعیت آپ کے ساتھ تعاون کرے گی۔ آپ محسوس کریں گے کہ حقائق جاننے کے بعد دوسرے صوبوں کے عوام کیسے آپ کا ساتھ دیتے ہیں۔'' میں نے انہیں دعوت دی کہ وہ اپنے دورے کا آغاز پنجاب سے کریں، جلسوں کا انتظام جمعیت کرے گی۔

انھوں نے ہماری دعوت قبول کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا اور اگلے جلسے کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے بتایا کہ صبح انشاء اللہ خضدار میں جلسہ ہوگا۔ انھوں نے ہمیں ہر قسم کے تعاون کی پیشکش کی۔ ہم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں صرف دعاؤں کی ضرورت ہے۔ رات گئے یہ مجلس برخاست ہوئی، ہم وہاں سے بسوں کے اڈے پر پہنچے اور خضدار جانے والی بس میں سوار ہوگئے۔ فجر کے وقت بس خضدار شہر سے کچھ دور تھی کہ اچانک جیپ میں سوار کلاشنکوف بردار نوجوانوں نے بس روک لی۔ ناظمِ صوبہ بلوچستان میرے ساتھ تھے۔ وہ انہیں دیکھتے ہی پریشان ہوگئے اور کہنے لگے کہ یہ بی۔ایس۔او کے نوجوان ہیں۔ نہ جانے ان کے عزائم کیا ہوں۔ ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ ایک نوجوان بس میں داخل ہوا اور اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر کہنے لگا کہ تم میں سے ظفر جمال کون ہے؟

میں نے بتایا کہ ''میں ہوں ظفر جمال''۔ وہ نوجوان کہنے لگا کہ آپ بس سے نیچے اتر آئیں۔ ناظمِ صوبہ بلوچستان کو خطرہ ہوا کہ کہیں یہ کوئی زیادتی نہ کریں، اس لیے فوراً کھڑے ہوئے اور کہا کہ یہ ہمارے مہمان ہیں، آپ نے کوئی بات کرنا ہے تو میں حاضر ہوں۔

اس نوجوان نے کہا کہ آپ بھی نیچے آجائیں۔ ہم دونوں بس سے اترے۔ بس سے اترتے ہی جیپ میں باقی نوجوان بھی ہمارے گرد جمع ہوگئے۔ ہم سے مصافحہ کیا اور کہا ''سردار عطاءاللہ مینگل نے ہمیں یہ ہدایت کی تھی کہ آنے والے ان مہمانوں کا خیر مقدم کیا جائے، لہٰذا ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اب آپ بس کے بجائے ہماری جیپ میں جلسہ گاہ پہنچیں۔''

یہ سنتے ہی ہم نے ''موچھوں کو تاؤ دیا'' اور ان کے ساتھ جیپ کی اگلی نشست پر بیٹھ گئے۔ جلسہ گاہ پہنچے، نوجوانوں کے ساتھ مقامی آبادی کی بھی بڑی تعداد موجود تھی جب کہ فوج نے جلسہ گاہ کو گھیر رکھا تھا۔ ان حالات میں گفتگو کا آغاز ہوا۔ میں نے فوجی جوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ قوم اپنا پیٹ کاٹ کر آپ کی ضروریات پورا کرتی ہے کہ خطرے کی صورت میں آپ سرحدوں کا دفاع کریں۔ آج وہ اسلحہ جو دشمن کے سینے پر اتارنے کے لیے آپ کے حوالے ہوا، اسی سے آپ اپنوں ہی کے سینوں کو چھلنی کر رہے ہیں۔ یاد رکھو، دنیا کی طاقت ترین فوج بھی محض اسلحے کے زور پر دشمن کے مقابلے میں کامیابی حاصل نہیں کرسکتی، جب تک اُس کی پشت پر بہنوں، بیٹوں اور ماؤں کی دعائیں نہ ہوں۔ آپ کو اپنوں ہی لوگوں سے لڑاتے ہوئے عملاً ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی دعاؤں سے محروم کیا جارہا ہے۔ اس لیے اپنے کردار پر غور کریں۔''

خضدار کی طرح قریباً ہر ضلع میں ہمارے کامیاب پروگرام ہوئے۔ دورہ مکمل ہوا تو حسب وعدہ سردار عطاءاللہ مینگل پنجاب تشریف لائے۔ اُن کا پہلا جلسہ گوجرانوالہ میں منعقد ہوا، ایک جم غفیر اُن کی بات سننے کے لیے موجود تھا۔ تقریر ختم ہوئی تو لوگوں کے جوش و خروش

> ہم علیحدگی نہیں چاہتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آزادی کے نام پر ہونے والی کوششیں ہمیں ایک بڑی غلامی کی دلدل میں دھکیل دیں گی۔

اور ان کے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ بے اختیار اُن کے ہاتھ چوم رہے تھے۔

بھٹو کو مینگل صاحب کے اس پہلے جلسہ سے ہوا کا رخ بدلنے کا اندازہ ہوگیا، لہٰذا انھوں نے صورت حال سے نمٹنے کے لیے دو کام کیے، ایک طرف عطاءاللہ مینگل صاحب کو صوبہ بدر کردیا، دوسری طرف دورۂ سندھ کے دوران جب میں شہدادکوٹ پہنچا تو مجھے گرفتار کرلیا گیا۔ اس جمعیت کی طرف سے جو تحریک سردار صاحب کی صوبہ بدری اور بلوچستان کے حوالے سے چلنی تھی، وہ تحریکِ اعلیٰ کی رہائی'' کے نعرے میں بدل گئی۔

اس پہلی گرفتاری کے بعد بھٹوصاحب کے پورے دور میں رہائی اور گرفتاری کے حوالے سے آنکھ مچولی کا سلسلہ جاری رہا۔ طلبہ تنظیم ہونے کے ناتے ہمارا دائرہ کار وہ تھا اور اپنی حد تک ہم نے ذمے داریوں کو ادا کیا۔ لیکن اُس وقت کے سیاستدان بحیثیت مجموعی وہ کردار ادا نہ کرسکے جس کا تاریخ اُن سے مطالبہ اور تقاضا کرتی رہی ہے۔ یوں وہ بھی تاریخ کے مقروض و مجرم ہی ٹھہرے۔

سردار عطا اللہ مینگل آج ہمارے درمیان موجود ہیں، جبکہ سردار اکبر بگٹی اللہ کے حضور حاضر ہوگئے۔ مگر میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ صوبے کی یہ دونوں قد آور شخصیتیں پاکستان کو بہت کچھ دے سکتی تھیں۔ افسوس، اس ملک کے بااختیار فکر حکمرانوں نے پاکستان کو ان کی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھانے دیا۔ سردار عطاء اللہ مینگل سے ملاقات میں میں آج بھی ان کے لیے ویسے ہی احترام کے جذبات رکھتا ہوں۔ اہلِ پاکستان اور اہلِ پنجاب کسی کاغذی سیاسی بلوچستان پیکج کی بات نہیں سمجھتے۔ انہیں اپنے بلوچ بھائیوں کے دکھ درد اور تکلیف کا بخوبی اندازہ ہے۔ اس لیے سردار صاحب کو لاہور آکر اپنے دل کی باتیں کھل کر کرنی اور کہنی چاہیے۔

آج بلوچستان آگ میں جل رہا ہے، لوگوں کو اغوا کیا جارہا ہے۔ مذہبی نفرتوں کو ہوا دی جا رہی ہے۔ بی۔ایل۔اے، را اور موساد کو کھل کھیلنے کا موقع مل رہا ہے۔ پیپلز پارٹی ہی کی حکومت ہے۔ حکمرانوں کے پاس ثبوت موجود ہیں لیکن انھیں ملک و قوم کی نسبت صرف اپنے مفاد اور اقتدار سے محبت ہے۔ انھوں نے خود پر این۔آر۔او کی چھتری تان رکھی ہے، ملکی وسائل دونوں ہاتھوں سے لوٹے جارہے ہیں۔ ان میں سے کوئی نہیں جو بلوچستان کا احساسِ محرومی دور کرنے کے لیے سنجیدہ تدبیر اختیار کرے، بلوچستان کی قیادتوں سے مذاکرات کا راستہ اپنائے اور بلوچستان کی حقیقی قیادت کو سیاست کے مرکزی دھارے میں لانے کے لیے سوچ بچار کرے۔

> تاریخ آج بلوچوں کی دلی آواز سننے کا مطالبہ کر رہی ہے مگر یہ حکمران تو اپنے قرب و جوار میں جینے اور پسنے والے عوام کی آواز نہیں سنتے، تاریخ کی کب سنیں گے۔ کون ہے جو تاریخ کی آواز سننے کو تیار ہو؟

۲۳ مارچ جنہوں نے اسلامیانِ برصغیر کی تاریخ بدل دی

قائداعظم نے پہلا جملہ کہا میں اپنے زخمی بیٹوں کو دیکھ کر آیا ہوں

۲۱ سے ۲۳ مارچ

ہماری قومی زندگی میں آج بھی بہار آسکتی ہے

نوید اسلام صدیقی

۲۳ مارچ

۱۹۴۰ء کا دن اسلامیانِ عالم کے لیے بالعموم اور مسلمانانِ ہند کے لیے بالخصوص بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اس روز ہندی مسلمانوں نے قائداعظمؒ کی قیادت میں ایک نئی اسلامی مملکت کی تشکیل کے لیے عہد و پیمان باندھا اور پرپیچ اور تلخ و سنگین راستوں پر چل نکلے۔

قافلہ سالار کو چونکہ اپنے مقصد کی صداقت پر کامل یقین تھا اس لیے یہ قافلہ تند و تیز ہواؤں کے باوجود سوئے منزل چلتا رہا اور ۷ سال کی مختصر سی مدت میں اپنا نصب العین حاصل کرلیا۔ یوں دُنیا کے نقشے پر ایک عظیم اسلامی سلطنت اُبھری، جس کا ہلالی پرچم جنوب میں بحیرۂ عرب سے لے کر شمال کی برفانی چوٹیوں تک لہرا رہا ہے لیکن یہ سفرِ آزادی صرف ۷ برس پر محیط نہ تھا، اس کے پیچھے صدیوں کی تاریخ تھی۔ مسلمانوں کی عظمت و شوکت کی داستانیں بھی تھیں اور زوال و پستی کے المیے بھی۔ تاریخ کے فراز میں مسلم قومیت کا چراغ ہمیشہ فروزاں رہا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ قائداعظمؒ تنہا ہر محاذ پر جم کر لڑتے رہے اور انہوں نے اپنے سارے حریفوں کو چاروں شانے چت گرا دیا۔ یہ ہمت اور طاقت قائداعظمؒ میں اُن کے جذبۂ ایمانی نے پیدا کی تھی۔ اس عظیم قائد نے مسلمانوں کی قیادت کا حق ادا کردیا۔ یہی وجہ ہے علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا:

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

قائداعظم محمد علی جناحؒ کی بصیرت افروز بے لوث قیادت میں قافلۂ آزادی کا سفر مارچ ۱۹۴۰ء میں شروع ہوا۔ قائداعظم نے تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کے مطالبے کے لیے عروس البلاد لاہور شہر کو منتخب کیا اور آل انڈیا مسلم لیگ کا ۲۷ واں اجلاس ۲۱ تا ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء منٹو پارک میں طلب کرلیا۔

لاہور پنجاب کا دارالحکومت اور سر سکندر حیات وزیراعظم پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کا گڑھ تصور کیا جاتا تھا۔ قائداعظم کا یہ اعلان انگریز حکومت اور ہندو قیادت پر بجلی بن کر گرا۔ سر سکندر حیات اور ان کے ساتھی برصغیر کے ۸ کروڑ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے تاکہ اپنے آقا انگریز اور ہندو کو خوش کرسکیں۔ یہ نوابی جاگیردار اور برطانوی ماحول کے ہندوؤں کے پروردہ لوگ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انگریز برصغیر کو چھوڑنے پر مجبور ہوسکتا ہے۔

یونی نیسٹ حکومت نے محض ۲۳ مارچ کا مسلم لیگ کا جلسۂ عام روکنے کے لیے ۱۹ مارچ کو خاکساروں کی عظیم الشان ریلی اور پریڈ کے مظاہرے پر جس میں ۳۱۲ خاکساروں کا جیش شامل تھا، پولیس کارروائی کا فیصلہ کیا۔ پولیس نے بغیر کسی اشتعال انگیزی کے بے تحاشا فائرنگ کی اور ۱۰۰ سے زیادہ خاکساروں کو شہید کردیا۔ یونی نیسٹ حکومت نے پھر طے شدہ پروگرام کے مطابق لاہور شہر کے کچھ علاقوں میں کرفیو نافذ کیا اور شہر میں فوج گشت کرنے لگی۔ سر سکندر حیات نے چند مسلم لیگی لیڈروں کے ذریعے مسلم لیگ کا جلسہ ملتوی کرانے کی کوششیں شروع کیں مگر قائداعظمؒ تیار نہ ہوئے۔

مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا ۲۷ واں اجلاس اعلان شدہ تاریخوں کے مطابق منٹو پارک میں ہی منعقد کرے گی۔ یونی نیسٹ لیڈر سر سکندر حیات نے متعدد بہانوں کا بہانہ بنا کر جلسے کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔ مگر مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ ساتھ برصغیر کے مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ ساری میدان خیموں، قناتوں اور شامیانوں کا ایک بڑا شہر بن گیا، جگہ جگہ دکانیں اور سٹال لگ گئے۔

۲۱ مارچ ۱۹۴۰ء

قائداعظمؒ کے آج لاہور آنے کی خبر عام تھی۔ صبح صبح ہی لاہور شہر اور ملک بھر سے آئے لاکھوں مسلمان ریلوے اسٹیشن کی طرف رواں دواں ہوگئے۔ ریل گاڑی پہنچنے سے قبل ہی ریلوے اسٹیشن کے اندر اور باہر دُور دُور تک انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجیں لے رہا تھا۔ مسلمان اپنے محبوب لیڈر کو خوش آمدید کہنے گھنٹوں ہجوم میں کھڑے رہے۔ صبح ۹ بجے فرنٹیر میل اپنے وقت پر پلیٹ فارم نمبر ایک میں داخل ہوئی۔ انسانوں کے بے پناہ سمندر میں زبردست ہلچل پیدا ہوئی اور فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ اس سے قبل ہر ریلوے اسٹیشن پر مسلمانوں کے ہجوم جمع تھے جو قائداعظم کو دیکھ کر نعرے لگاتے۔ قائداعظمؒ اپنے سیلون سے ہاتھ ہلا کر ان کے جوش و جذبے کا جواب دیتے رہے۔

لاہور ریلوے اسٹیشن پر جونہی گاڑی کھڑی ہوئی، قائداعظمؒ کا مسکراتا شگفتہ چہرہ ان کے مخصوص سیلون کے دروازے پر نمودار ہوا۔ انہوں نے اپنے دل آویز اور عوام کے دل جیت لینے والے انداز میں ہاتھ ہلایا۔ محترمہ فاطمہ جناح بھی ان کے ساتھ تھیں۔ قائداعظمؒ کو اپنے سامنے پاکر نعروں میں ایک نیا جوش و جذبہ پیدا ہوگیا۔ نعروں کی شدت سے ریلوے اسٹیشن کے در و دیوار کانپنے لگے۔ قائداعظمؒ کچھ دیر اس جوش و خروش کا نظارہ کرتے، ہاتھ ہلاتے اور مسکراتے رہے۔

۱۹ مارچ کے المناک واقعے کی وجہ سے آپ نے جلوس کی صورت جانا مناسب نہ سمجھا۔ اعلان کردیا کہ تمام حاضرین اپنے گھر چلے جائیں۔ بعد ازاں قائداعظمؒ اسٹیشن سے سیدھے ممدوٹ ہاؤس پہنچے، اُس وقت ساڑھے دس بج چکے تھے۔ ممدوٹ ہاؤس میں ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ موجود تھے۔ قائد ساڑھے گیارہ بجے تک اُن سے مصروفِ گفتگو رہے پھر وہاں سے سیدھے میو ہسپتال میں زیرِ علاج زخمی خاکساروں کی مزاج پُرسی کرنے روانہ ہوگئے۔

ہسپتال میں آپ ایک ایک زخمی خاکسار کے پاس گئے۔

شام کو قائداعظمؒ منٹو پارک میں تشریف لائے جہاں ہزاروں افراد نے آپ کا استقبال کیا۔ آپؒ نے مسلم لیگ کا سبز پرچم پنڈال کے سامنے لہرانے کے لیے رسمِ پرچم کشائی ادا کی۔ بعد ازاں پورے برصغیر سے آئے ہوئے مسلم لیگ نیشنل گارڈ نے آپ کو سلامی دی۔ اس کے بعد نیشنل گارڈ نے انتظامی معاملات سنبھال لیے۔ اپنی مختصر تقریر میں قائداعظمؒ نے پہلا فقرہ نے یہ کہا کہ میں اپنے زخمی بیٹوں کو دیکھ کر آیا ہوں۔ اس پُرخلوص اور محبت بھرے فقرے نے مجمع کا جوش وجذبہ سوا کر دیا۔

۲۲/ مارچ ۱۹۴۰ء

نمازِ جمعہ کے بعد مسلم لیگ کے ۲۷ رویں سالانہ اجلاس کا پہلا سیشن ہوا۔ یہ کھلا اجلاس تھا جس میں لاکھوں کی تعداد میں مسلمانانِ ہند شریک ہوئے۔ جلسہ گاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ بادشاہی مسجد تک انسانوں کے سر ہی سر نظر آتے تھے۔ اس جلسے میں باہر سے آنے والے مسلم لیگی راہنما اور کارکن اپنے اپنے علاقوں کے مخصوص لباس پہنے ہوئے تھے، ان میں سے بعض عمر رسیدہ بھی تھے لیکن ان کے عزائم جواں تھے۔ عورتوں کی خاصی تعداد بھی موجود تھی۔ نعرے لگتے تو یہ عورتیں بھی اپنے جوش وخروش کا اظہار کرتی۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ کی صدارت میں اس تاریخی اور عظیم الشان جلسے کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا، جس کے بعد انور قریشی نے میاں بشیر احمد کی نظم پیش کی:

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناحؒ
ملت ہے جسم، جاں ہے محمد علی جناحؒ
تصویرِ عزم، جانِ وفا، روحِ حریت
ہے کون، بے گماں ہے محمد علی جناحؒ
رکھتا ہے دل میں تاب و تواں نو کروڑ کی
کہنے کو ناتواں ہے محمد علی جناحؒ
لگتا ہے ٹھیک جا کے نشانے پہ اس کا تیر
ایسی کڑی کماں ہے محمد علی جناحؒ
غیروں کے دل بھی سینوں کے اندر دہل گئے
مظلوم کی فغاں ہے محمد علی جناحؒ

باہر سے آنے والے مندوبین کی تعداد ۲/ ہزار کے لگ بھگ تھی جو ہندوستان کے ہر حصے سے آئے تھے تاکہ مسلمانوں کے مستقبل اور آیندہ لائحہ عمل کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکیں۔ ان مندوبین کی رہائش اور خورد ونوش کا انتظام بڑا تسلی بخش تھا۔

قائداعظمؒ نے اپنی صدارتی تقریر میں یہ اعلان کیا کہ مسلمان اقلیت میں نہیں۔ لفظ قوم کی کوئی بھی تعریف ہو، ہر لحاظ سے مسلمان ایک قوم ہیں، چنانچہ ان کا اپنا علاقہ اور اپنی مملکت ہونی چاہیے۔ اس اعلان پر جلسہ گاہ میں فلک شگاف نعرے بلند ہوئے۔ قائداعظمؒ نے صاف لفظوں میں واضح کیا کہ اگر برطانوی حکومت مسلمانوں پر کوئی ایسا آئین یا تصفیہ تھوپا جسے ان کی ناپسند اور منظوری حاصل نہ ہو تو مسلمان زبردست مزاحمت کریں گے۔ مسلم ہندوستان ایسا کوئی آئین قبول نہیں کر سکتا جو کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے۔ اگر انگریز دل سے یہ چاہتے ہیں کہ برصغیر کے لوگ امن اور چین سے رہیں اور خوشحال ہوں تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہندوستان کو خود مختار قومی مملکتوں میں تقسیم کر کے یہاں کی بڑی قوموں کو جداگانہ وطن دیا جائے۔ قائداعظمؒ نے اپنی طویل اور معرکہ آرا تقریر ختم کرنے کے بعد اجلاس ملتوی کر دیا۔

۲۳/ مارچ ۱۹۴۰ء

یہ اجلاس مارچ کے آخری عشرے میں ہو رہا تھا۔ ان دنوں میں لاہور کا موسم کافی خوشگوار ہوتا ہے کیونکہ سردیاں رخصت ہو جاتی اور گرمیوں کی آمد آمد ہوتی ہے۔ درختوں کی شاخوں پر نئے پتے پھوٹنے لگتے ہیں اور ہر سُو ہریالی مسکراتی اور ہنستی دکھائی دیتی ہے۔

منٹو پارک کے اس حصے میں جہاں آج منارِ پاکستان کھڑا ہے، گھاس کے قطعے نہیں تھے جبکہ چٹیل میدان تھا۔ میدان میں آم کے درخت تھے جن کی چھاؤں میں فقرے اور کھلنڈرے لڑکے پنجاب کا عوامی کھیل کبڈی کھیلتے۔ بدلتے موسم کی خوشگوار فضا میں زندہ دلانِ لاہور ہنگ بازی سے دل بہلاتے۔ خصوصاً اتوار کو اکٹھے ہو کر ٹولیوں کے بیچ لڑانے کے لیے منٹو پارک ایک مشہور مقام تھا۔ کھلنڈرے اور بے فکرے لڑکوں کو جب معلوم ہوا کہ اس میدان میں مسلم لیگ کا اجلاس ہونا ہے تو وہ گلی ڈنڈا بھول کر کاروں کے ساتھ مل کر اس ناہموار جگہ کو جلسہ گاہ میں تبدیل کرنے کے لیے شانہ بشانہ اکھڑے ہوئے۔

مسلمانانِ ہند کی بے کیف زندگی میں قرارداد پاکستان بہار کا ایک جھونکا بن کر آئی اور اُن کے حیات نو کا پیغام لائی۔ ہر سال ۲۳/ مارچ کا دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اگر ہم وہی جذبہ تازہ کر لیں جو ۱۹۴۰ء میں تھا تو ہماری قومی زندگی میں آج بھی بہار آسکتی ہے اور علامہ اقبال کا یہ پیغام یاد رکھیں:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں بیرونِ دریا کچھ نہیں

۲۳/ مارچ کی ایک اور اہمیت بھی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں جب آئین بنا اور اس میں پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا تو یہ تاریخی دن یومِ پاکستان کے ساتھ ساتھ یومِ جمہوریہ بھی کہلانے لگا۔

اس تاریخی دن جلسہ گاہ میں فرزندانِ توحید کا بے پناہ ہجوم تھا۔ ۱۰/ کروڑ مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن، ان کے تاج بادشاہ، سالارِ قوم، قائداعظم محمد علی جناحؒ پونے پانچ کو ۵۰/ منٹ پر پنڈال میں داخل ہوئے۔ نیشنل گارڈز نے آپ کو سلامی پیش کی۔ جلسہ گاہ کیا تھا، انسانوں کے جوش وخروش سے بھرا ایک سمندر تھا، عظیم راہنما کی موجودگی میں ہر طرف نظم وضبط نظر آرہا تھا۔ قائداعظمؒ کو خوش آمدید کہنے کے لیے لوگ احتراماً کھڑے ہوئے اور پھر بیٹھ گئے۔ قائداعظمؒ کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہوئے تو ان کے دائیں بائیں اور عقب میں پورے برصغیر سے آئے مسلم لیگی قائدین تشریف فرما تھے۔ اس اجلاس میں برصغیر کا کوئی کونا ایسا نہیں تھا جس کی نمائندگی نہ ہو۔ اس تاریخی موقع پر بھی ہندوستانی مسلمان ایک پرچم تلے جمع تھے۔

قائداعظمؒ اس اجلاس میں سفید اچکن اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس تھے۔ سر پر اپنی مخصوص ٹوپی پہن رکھی تھی جسے ''جناح کیپ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ گلے میں یک چشمی عینک (مونوکل) لٹکی ہوئی تھی۔ محترمہ فاطمہ جناح اُن کے ساتھ تھیں۔ نوابزادہ صدیق علی خاں قائداعظمؒ کی کرسی کے عین پیچھے اپنی پُروقار شخصیت کے ساتھ تلوار تھامے کھڑے تھے۔

تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد نوابزادہ لیاقت علی خاں نے سالانہ کارکردگی کی تفصیل پیش کی جو منظور کر لی گئی۔ منظوری کے بعد شیر بنگال ابوالقاسم فضل الحق نے انگریزی میں قرارداد پیش کی، جسے ازاں اس کا درج ذیل اُردو ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے پیش کیا:

''آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس اپنی اس پختہ رائے کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ اسلامی ہند اُس وقت تک مطمئن نہیں ہوگا جب تک آئینی ہند کا مسئلہ از سرِ نو طے نہیں کیا جاتا۔ وہ کوئی متبادل آئین اس وقت تک قبول نہیں کریں گے جب تک ان کی خواہش ومنشا کے مطابق نہیں بنایا جاتا۔''

''اس اجلاس کی مزید رائے یہ ہے کہ کوئی آئین ملک کے لیے قابلِ عمل اور مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا اگر وہ اس اَساس پر مبنی نہیں کہ جغرافیائی لحاظ سے ملحق حصوں کو حدود کی مناسب تبدیلی کے بعد اس طرح ملا دیا جائے کہ ہند کے شمال مغربی اور مشرقی علاقے، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، آزاد ریاستوں میں بدل جائیں اور اُن کے ترکیبی اجزا خود مختار ہوں۔ نیز ان حصوں اور علاقوں میں اقلیتوں کو ان کی مرضی کے مطابق مناسب اور موثر آئینی تحفظات دیے جائیں تاکہ ان کے مذہبی، اقتصادی، سیاسی اور دیگر حقوق ومفادات محفوظ رہیں

اور ہند کے اُن حصوں میں، جہاں مسلمان تعداد میں کم ہیں، ان کے لیے اور دیگر اقلیتوں کے لیے ان کی مرضی کے مطابق آئین میں ایسے ہی مناسب اور موثر تحفظات رکھے جائیں تاکہ ان کے بھی مذہبی، تہذیبی، اقتصادی، سیاسی اور دیگر حقوق و مفادات محفوظ رہیں۔"

"یہ اجلاس مجلسِ عاملہ کو اختیار دیتا ہے کہ وہ ایک ایسا آئین مرتب کرے جو ان کے بنیادی اُصولوں کے مطابق ہو اور جس میں یہ گنجائش ہو کہ متعلقہ علاقے آخرکار دفاع، امورِ خارجہ، رسل و رسائل، محصول اور دیگر ضروری اُمور سے متعلق اختیار کے مالک ہوسکیں۔"

قرارداد پیش ہونے کے بعد قرارداد کے بارے میں تقاریر ہوئیں، پھر قرارداد پر رائے شماری ہوئی۔ الفاظ اُس جوش و خروش، ولولہ اور خلوص کو بیان کرنے سے قاصر ہیں جو اس تاریخی قرارداد منظور ہونے کے وقت وہاں نظر آرہا تھا۔ یہی وہ قرارداد ہے جس کی بنیاد پر یہ مملکتِ خداداد پاکستان کرۂ ارض پر قائم ہوئی۔ اقوامِ عالم کی پوری تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے کہ کوئی ملک ایک قرارداد کے ذریعے عالمِ وجود میں آیا ہو۔ اس قراردادِ پاکستان نے ہندوستان کو ۳ر حصوں میں تقسیم کر دیا۔ مسلمانانِ ہند کا انگریز سامراج سے آزاد ہونا اور غیر مسلم اقوام کی بالادستی سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کرنا قراردادِ پاکستان کا مرہونِ منت ہے۔ مسلمانانِ ہند کا مقدر بدلنے میں اس قرارداد کا جو عظیم حصہ ہے، وہ رہتی دنیا تک کوئی نہیں مٹا سکتا اور نہ ہی اس قرارداد کی اہمیت و افادیت میں ذرہ برابر کمی کرسکتا ہے۔ یہ قرارداد آج جس طرح منارِ پاکستان پر کندہ ہے، اسی طرح ہمارے دلوں پر بھی نقش ہے۔

قرارداد کی منظوری کے بعد قائداعظمؒ کا خطاب ہوا۔ آپ کا خطبہ نہ صرف تاریخی دستاویز بلکہ تشکیلِ پاکستان کے حوالے سے ہماری قومی دستاویز کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ قائداعظمؒ نے پہلے اُردو میں کچھ ابتدائی کلمات کہے اور اس کے بعد انگریزی میں ایک گھنٹہ چالیس منٹ تقریر فرمائی۔ حاضرین کی اکثریت انگریزی سے نابلد ہونے کے باوجود ہمہ تن گوش تھی۔ آپ کے خطبے کا مکمل متن تو یہاں درج کرنا ممکن نہیں، چند اقتباسات پیش ہیں:

☆ سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ہمارے ہندو دوست اسلام اور ہندو مذہب کی اصل حقیقت سمجھنے کی کیوں نہیں کوشش کرتے؟ ان دونوں مذاہب کو عرفِ عام معنی میں لینا درست نہیں۔ درحقیقت یہ ۲ر مختلف اور جداگانہ تہذیب ہیں اور یہ محض ایک خواب ہے کہ ہندو اور مسلم ایک متحدہ قوم بن جائیں گے۔ یہی غلط تصور ہماری بہت سی مشکلات کا سرچشمہ ہے اور اگر بروقت اس کی تصحیح نہ کی گئی تو یہ ہندوستان کو تباہی کے گڑھے میں دھکیل دے گا۔

☆ ہماری خواہش ہے کہ ہم اپنے آزاد وطن میں ان اصولوں کو بروئے کار لاکر جنھیں ہم موزوں تصور کرتے ہیں۔ روحانی، ثقافتی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کے ارتقائی مراحل طے کریں۔

☆ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہم بھی کسی طرح مرعوب ہوکر اپنا موقف ترک نہیں کریں گے۔ ہم نے اپنا نصب العین متعین کرلیا ہے، اب ہم اسے حاصل کرنے کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ ظاہر ہے کہ نصب العین کا حصول کوئی آسان کام نہیں، آزادی محض دلائل سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔

☆☆

یوں تو آزادی کی ہر تحریک آگ اور خون کے دریاؤں سے گزر کر ہی کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے لیکن جس انداز سے تحریکِ پاکستان کے متوالوں نے اس خوفناک سمندر کو عبور کیا، اس کی مثال عہدِ حاضر کی تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔ ہمارے بزرگوں نے پاکستان قائم کیا، ہماری آیندہ نسل کی آزادی، خوشحالی اور سکھی زندگی بسر کرنے کی خاطر، اور ہمارا انفرادی اور اجتماعی فرض ہے ہم اس مقدس سرزمین کی حفاظت کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔ آیئے ہم مل کر عہد کریں کہ ہم اپنی تمام ذہنی و جسمانی صلاحیتیں اپنے عزیز کی ترقی و تعمیر اور حفاظت کے لیے وقف کردیں گے۔

تاریخی کیس

حوالہ کتب سے بھری ایک بیل گاڑی عدالت میں لائی گئی تھی

میی لارڈ.....! وکیلِ صفائی درست فرماتے ہیں

وکیلِ استغاثہ نے اپنی پسپائی بڑی خندہ پیشانی سے تسلیم کرلی تھی

رفعت اختر حسین شیخ

ایک بار اودھ کی عدالت میں ایک مقدمہ دائر کیا گیا، جس کے مطابق ۱۰ر لاکھ روپے کا دھوکا کیا گیا تھا۔ مدعی غیر مسلم پنڈت شری رام تھا اور مدعا علیہ شہر کا ایک مسلمان محمد رمضان۔ جھگڑے تو ہوتے رہتے ہیں مگر شرپسند عناصر نے اسے ہندو مسلم مسئلہ بنالیا۔ حد یہ کہ چوٹی کے ہندو وکیل سر تیج بہادر سپرو کی خدمات حاصل کی گئیں، گویا مدعی صاحب مقدمہ شروع ہونے سے پہلے ہی جیت چکے تھے۔ اہل شہر نے یہی بات مشہور کردی کہ سر تیج بہادر نے جس روز یہ مقدمہ لڑنے کی ہامی بھری، مقدمے کا فیصلہ اُسی دن ہوگیا۔ یہ بات مسلمانوں کو مشتعل کرنے والی تھی۔ آخر مسلمان بھی میدان

میں ڈٹ گئے۔ یہ مقدمہ جنگی صورت اختیار کر گیا۔ یہ سچ ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے ہندو مسلم فسادات کو صرف بہانہ درکار ہوا کرتا تھا۔ مسلمانوں نے اعلان کر دیا کہ وہ سپرو صاحب کے مقابلے میں قائداعظمؒ کو میدان میں اتاریں گے۔ یہ گویا چیلنج قبول کرنے والی بات تھی۔

مقدمے والے روز امن و امان کے تحفظ کی خاطر پولیس کی بھاری نفری گشت کرنے لگی۔ سپرو صاحب عدالت میں داخل ہوئے تو ان کا انداز تشریف آوری دیدنی تھا۔ ایک بیل گاڑی پر حوالہ جات کی کتب رکھی تھیں۔ ملازمین کی فوج اور کتابوں سے بھری گاڑی تماشائیوں کو مرعوب کر رہی تھی۔

عدالت میں مقدمے کا وقت ۱۰ بجے بتایا گیا تھا اور پونے دس بجے تک قائداعظمؒ یا ان کے کسی نمائندے کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ حتیٰ کہ مقدمے کے آغاز میں صرف ۵ منٹ رہ گئے۔ چہ مگوئیاں ہونے لگیں کہ مسلمانوں کے وکیل صاحب غیر حاضر ہو کر عزت بچانا چاہتے ہیں مگر فاضل جج ۱۰ بجے تک عدالت کے اہلکاروں کو انتظار کرنا تھا۔ آخر ۱۰ بجے سے صرف ڈیڑھ منٹ پیشتر قائداعظم عدالت کے احاطے میں داخل ہوئے۔ نہ کوئی مشیر نہ ملازموں کی فوج صرف ایک منشی ان کے ساتھ تھا اور حوالہ جات کی کوئی کتاب بھی ان کے پاس نہیں تھی، البتہ ایک پرانی اور چھوٹی سی کتاب انھوں نے تھام رکھی تھی جسے دیکھ کر تماشائی ہنسنے لگے۔

خیر! مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ باہر زندہ باد، مردہ باد کے نعرے لگ رہے تھے مگر پولیس نے حالات قابو میں کر رکھے تھے۔ جج بہادر سپرو دلائل پر دلائل دے رہے تھے اور فرنگی جج سر ہلا ہلا کر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرما رہا تھا۔ قائداعظمؒ خاموشی سے بیٹھے سن رہے تھے۔ صرف ایک بار انھوں نے دھیمے لہجے میں کہا، یہ ہے اصل نکتے کی بات۔

اس پر وکیل استغاثہ نے بھی چونک کر ان کو دیکھا اور حیران ہوا کہ اس نے کون سی ایسی بات کہہ دی ہے جو قائداعظمؒ کو پسند آئی ہے۔ سپرو صاحب عدالت کے برخواست ہونے تک دلائل دیتے رہے اور اسی پر ہی بس نہ ہوئی بلکہ ان کے دلائل ۳ روز تک مسلسل جاری رہے۔ سارے اودھ میں پل پل کی کارروائی سنی سنائی جا رہی تھی۔ لوگ زہب داستاں کے لیے اس میں کسی بیشی بھی کر رہے تھے۔

مسلمان کہتے تھے کہ اب قائداعظم ۳ روز کے جواب میں ۱۰ روز تک دلائل دیں گے اور پانسا ہی پلٹ دیں گے۔ گویا مقدمہ نہ ہوا خون ریز جنگ کا میدان ہوا۔ آخر چوتھے روز قائداعظمؒ نے اٹھ کر فاضل جج کو مناسب تعظیم پیش کرنے کے بعد کہا ''می لارڈ! مجھے افسوس ہے کہ میرے دوست وکیل استغاثہ نے ۳ روز تک دلائل کے انبار لگا دیے جبکہ یہ عدالت زیر بحث مقدمہ سننے کی مجاز ہی نہیں۔''

یہ کہہ کر انھوں نے پرانی کتاب فاضل منصف کے سامنے رکھی۔ اس پرانی کتاب میں درج تھا کہ ۱۰ لاکھ اور اس سے زائد رقم کے مقدمات صرف خصوصی عدالت میں سنے جائیں گے، جن کی سربراہی شاہی خاندان کا کوئی فرد کرے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ قانون پرانا ہو گیا اور کسی کو اس میں ترمیم کا خیال ہی نہ آیا مگر سب کچھ سب کے سامنے تھا۔ جج صاحب ہونقوں کی طرح دونوں وکیلوں کو دیکھنے لگے۔ جج بہادر سپرو آخر بلند مرتبت وکیل تھے۔ انھوں نے بھی وہ کتاب دیکھی اور پھر اُلٹ پلٹ کر بار بار دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے بڑے احترام سے سوال کیا ''جناب! یہ کتاب آپ نے کہاں سے ڈھونڈ نکالی ہے؟''

''آپ چاہیں تو یہ کتاب اپنے پاس رکھ لیں۔'' قائداعظم نے مسکرا کر کہا۔

شکریہ! یہ کہہ کر سپرو صاحب نے وہ کتاب اپنے ایک ملازم کے حوالے کر دی اور جج سے کہا ''می لارڈ وکیل صفائی درست فرماتے ہیں، میری ساری محنت اکارت گئی۔ یہ عدالت واقعی اتنی مالیت کا مقدمہ سماعت فرمانے کی مجاز نہیں۔''

''کیا آپ اپنے مؤقف سے دست بردار ہو رہے ہیں؟'' جج صاحب نے پوچھا۔

''جی می لارڈ! ایسا ہی ہے۔'' سر جج بہادر سپرو نے شکست پیشانی سے اپنی پسپائی قبول کر لی۔

کتاب بینی

کتابوں کی داستان بھی عجب ہے۔ کبھی انھیں آگ لگائی گئی تو کبھی دریا برد کیا گیا۔ چرا لیا کبھی تو دفنا دیا گیا۔ کبھی یہ شاہی دربار کی زینت بنیں تو کبھی فٹ پاتھ پر کوڑیوں کے دام فروخت ہوئیں۔

کتابوں سے دوستی

کتاب سے دوستی شعور کی نئی منزلوں سے روشناس کراتی ہے

صبا شفیق

جس طرح ہوا اور پانی کے بغیر جینا ممکن نہیں، اسی طرح کتاب کے بغیر انسانی بقا اور ارتقاء محال ہے۔ کتاب نے علم کے فروغ اور سوچ کی وسعت میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ دنیا جب تحریر کے فن سے روشناس ہوئی تو انسان چٹانوں، درختوں کی چھالوں، جانوروں کی ہڈیوں اور کھالوں، کھجور کے پتوں، ہاتھی دانت، کاغذ غرض ہر وہ شے لکھنے کے لیے استعمال کی، جس سے وہ اپنے دل کی بات دوسروں تک پہنچا سکے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے دنیا کی پہلی کتاب قدیم مصریوں کی ''الاموات'' ہے۔ کچھ مؤرخین کا کہنا ہے کہ دنیا کی سب سے پہلی کتاب چین میں لکھی گئی جس کا نام ''ڈائمنڈ سترا'' (Diamond Sutra) تھا۔ ایک مذہبی کتاب ہے جو آج بھی ''برٹش میوزیم لائبریری'' میں محفوظ ہے۔

کتابوں کی داستان بھی عجب ہے۔ کبھی انھیں آگ لگائی گئی تو کبھی دریا برد کیا گیا۔ چرا لیا کبھی تو دفنا دیا گیا۔ کبھی یہ شاہی دربار کی زینت بنیں تو کبھی فٹ پاتھ پر کوڑیوں کے دام فروخت ہوئیں۔

کتاب اور علم دوستی معاشی خوشحالی اور معاشرتی امن کی ضامن ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جس قوم نے علم و تحقیق کا دامن چھوڑ دیا، وہ پستی میں گر گئی۔ مسلم اُمّہ کا زوال اس کی واضح مثال ہے۔ ساتویں صدی سے تیرھویں صدی تک بغداد علم و ادب کا گہوارہ رہا۔ سقوط بغداد ہوا تو مسلمانوں کے عظیم کتب خانے فرات میں بہا دیے گئے۔ یہ اس قدر ضخیم ذخیرہ تھا کہ دریا کا پانی ان کی سیاہی سے سیاہ ہو گیا۔ جب اندلس میں پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں اسلامی حکومت ختم ہوئی تو غرناطہ کی بڑی لائبریری کو بھی ملکہ ازابیلا نے جلوا دیا۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان کتابیں پڑھنے اور جمع کرتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ علم سے

ڈوری مسلمانوں کو رُسوائی کی طرف لے گئی۔ آج دُنیا کے ۲۷ر ممالک ایسے ہیں جہاں سب سے زیادہ کتابیں فروخت ہوتی ہیں، مگر ان ۲۷ر ممالک میں ایک بھی مسلمان ملک نہیں۔ افسوس! مسلمان اپنی علمی شان بھلا بیٹھے اور اہلِ یورپ نے مسلمانوں کے علمی مراکز بالخصوص ہسپانوی مراکز سے استفادہ کرکے تحقیق کی دُنیا میں قدم رکھا۔ ہمارے آباء اجداد کی محنت آج بھی لندن کے ''اِنڈیا آفس لائبریری'' میں موجود ہے۔ ان کتب کی تعداد ۴ر لاکھ کے قریب ہے۔ اِن میں عربی، فارسی، ترکی اور اُردو میں قلمی کتابوں کی بڑی تعداد شامل ہے۔ لندن کے بعد پیرس لائبریری میں مشرقی زبانوں میں لکھی کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت ختم ہوئی، تو انگریزوں نے لال قلعے کی شاہی لائبریری سے ہزاروں کتابیں لوٹ کر لندن پہنچا دی تھیں۔

کتاب ایک قوم کی تہذیب وثقافت اور معاشی، سائنسی اور عملی ترقی کی آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کی بہترین دوست بھی ہے۔ کتابوں سے دوستی رکھنے والا شخص کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ کتاب اُس وقت بھی ساتھ رہتی ہے، جب تمام دوست اور پیار کرنے والے ساتھ چھوڑ دیں۔

اگرچہ آج ٹی وی انٹرنیٹ اور موبائل نے لوگوں کے ذہنوں پر قبضہ کرلیا ہے، لیکن کتاب کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔ اسی لیے ہر سال ۲۳ر اپریل کو کتاب کا عالمی دِن منایا جاتا ہے۔

نئی نسل میں کتب بینی کا رجحان خاصا کم ہے۔ بچوں کو مطالعے کی طرف راغب کرنا کٹھن کام بن گیا ہے۔ حالانکہ موجودہ دور میں بڑھتے نفسیاتی مسائل سے نپٹنے کے لیے آج ماہرین نفسیات بچوں کے لیے مطالعے کو لازمی قرار دے رہے ہیں کیونکہ اچھی کتابیں شعور کو جلا بخشنے کے ساتھ ساتھ بچوں کو بہت سے فضول مشغلوں سے بھی بچاتی ہیں۔ یونانی ڈرامہ نگار، یوری پیڈس ایک جگہ لکھتا ہے ''جو نوجوان مطالعے سے گریز کرے، وہ ماضی سے بے خبر اور مستقبل کے لیے مردہ ہوتا ہے۔''

بچوں میں مطالعے کا ذوق وشوق پیدا کرنے میں والدین اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ جونہی بچہ سیکھنے اور پڑھنے کی عمر کو پہنچے، والدین کو چاہیے کہ اُسے اچھی اور مفید کتابیں لا کر دیں۔ شروع میں یہ کتابیں کہانیوں کی بھی ہو سکتی ہیں کیونکہ بچے کہانی سننا اور پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ اس طرح بچے کو مطالعے کی عادت پڑتی ہے۔

اس کے علاوہ والدین بچوں کے سامنے اپنی مثال قائم کرسکتے ہیں۔ فارغ وقت میں ٹی وی دیکھنے یا فون سننے کے بجائے وہ کسی کتاب یا رسالے کی ورق گردانی کرکے بچے کو بھی اس طرف مائل کریں۔ جب بچہ والدین کو مطالعہ کرتے دیکھے گا تو لاشعوری طور پر اُسے یہ اِدراک ملے گا کہ فارغ اوقات میں مطالعہ ہی کرنا چاہیے۔

ہو سکے تو بچے کو لائبریری بھی لے جائیں۔ کہتے ہیں کہ لائبریری بچے کے دماغ کی بہترین میزبان ہوتی ہے۔ ڈھیر ساری کتابیں دیکھ کر بچہ خوش بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے مزاج اور پسند کے مطابق کتابوں کا انتخاب کرکے اپنی دماغی صلاحیتیں اُجاگر کرسکتا ہے۔

بچے کسی بھی قوم کا مستقبل ہوتے ہیں اور کتابیں قومی ترقی کی ضامن..... چنانچہ اپنے بچوں کی کتابوں سے دوستی کروا کر آپ نہ صرف انھیں زندگی میں ایک بہترین دوست عطا کریں گے بلکہ ملک وقوم کی ترقی میں مدد ومعاون بن جائیں گے۔ اچھی کتابیں انسان کو مہذب بنانی اور اس کی شخصیت کو وقار عطا کرتی ہیں۔

آج بھی بیشتر خواتین وحضرات کے نزدیک کتابوں پر رقم خرچنے سے کہیں بہتر کپڑوں، جیولری اور زندگی کی دیگر آسائشوں پر پیسا خرچ کرنا اہم ہے لیکن یہ تمام چیزیں عارضی اور ضرورت کے تحت استعمال کی جانے والی اشیا ہیں۔ کتاب سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ایسی شے نہیں جو ہمیشہ آپ کی دوست رہے۔ کتاب سے دوستی انسان کو شعوری نئی منزلوں سے روشناس کراتی ہے۔ سو اگر زندگی میں آگے بڑھنا ہے تو خود بھی کتاب سے دوستی کی کریں اور اپنے بچوں کو بھی اس بہترین دوست سے روشناس کروائیے۔

سفر حجاز

حیران کردینے والے سچے واقعات

آیا ہے بُلاوا دیارِ نبیؐ سے

اُن غیر معمولی واقعات کا تذکرہ جو آپ کی سوچ اور فہم سے ماورا ہوتے ہیں مگر آپ کو حیرت، خوشی اور خوش بختی کا احساس عطا کرتے ہیں

حبیب اشرف صبوحی

کہا جاتا ہے کہ جو کوئی حج یا عمرہ کی سعادت حاصل کرے، اس کا بلاوا آتا ہے..... بغیر بلاوے کے کوئی نہیں جاتا۔ مشاہدہ میں آیا ہے کہ بے شمار لوگ خوشحال ہیں اور ان پہ کوئی ذمے داری بھی نہیں، حج کی سعادت حاصل نہیں کرتے اور دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک حج بھی ہے، جس کی ادائی صاحبِ استطاعت لوگوں پر فرض ہے۔

بعض مرتبہ انسان کی زندگی میں ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ عقل حیران ہوجاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی حج وعمرہ کے سلسلہ میں کچھ غیر معمولی واقعات پیش آئے۔

۱۹۹۰ء میں میری بیوی کے خالہ خالو ایک ماہ کے لیے عمرہ کی غرض سے سعودی عرب پہنچے۔ وہ امریکا میں درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ ایک ہفتہ مکہ شریف میں قیام کے بعد خالہ کا ٹیلی فون آیا کہ تم لوگ بھی عمرہ کرنے ایک ہفتے کے اندر یہاں آجاؤ۔ انھیں بتایا کہ اگر ہمارا بلاوا ہوگا تو ہم ان شاء اللہ ضرور آئیں گے، آپ ہمارے لیے دُعا کریں۔ انھوں نے کہا کہ خاندان میں اتنے لوگ ہیں، ہم نے کسی کو نہیں کہا، تمھیں اس لیے کہہ رہے ہیں، ہمیں ''اشارہ'' ملا ہے کہ تمھاری یہاں حاضری ہے اور ایک ہفتے کے اندر تم لوگ یہاں ہوں گے۔ میں نے انھیں بتایا کہ ایک ہفتے کے اندر پاسپورٹ اور ویزے کا حصول بہت

مشکل ہے۔ پھر ٹکٹ اور زادِ راہ کا بھی انتظام کرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تم بسم اللہ کرو، سارے مسائل خود بخود حل ہوجائیں گے۔ سب سے پہلے میں نے جلد پاسپورٹ حاصل کرنے کی درخواست دی جو ۳/روز بعد ملنا تھا۔ پھر ایجنٹ سے ویزے کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا، کم از کم ایک ماہ میں ویزا ملے گا۔ میں تقریباً مایوس ہوگیا، اتفاق سے اپنے دوست، منیر احمد غازی کا خیال آیا جو اس وقت ڈپٹی اٹارنی جنرل تھے۔ میں ان سے ملا اور کہا کہ میں ایک ہفتے کے اندر سعودی عرب کا ویزہ چاہتا ہوں۔ کہنے لگے کہ یہ بہت آسان کام ہے، تم میرا خط اور کارڈ لے کر وزارتِ خارجہ کے ڈائریکٹر جنرل صدیقی صاحب کے پاس چلے جاؤ، وہ تمھیں ایک روز میں ویزا دلوا دیں گے۔ میں ان کا خط لے کر رات کو بس میں بیٹھا جس نے صبح مجھے اسلام آباد پہنچا دیا۔ میں وزارتِ خارجہ کے دفتر گیا۔ ابھی دفتر کھلا نہیں تھا، میں انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد لوگوں کی آمد ورفت شروع ہوگئی۔ میں نے ایک دو لوگوں سے صدیقی صاحب کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ پاکستان سے باہر دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ یہ بات سن کر بہت مایوس ہوا اور سوچنے لگا کہ اب ویزے کا حصول ناممکن ہے اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہا۔ پھر خیال آیا کہ صدیقی صاحب کی جگہ کوئی اور افسر کام کر رہا ہوگا، اس سے رابطہ کیا جائے۔ استقبالیے سے معلوم ہوا کہ اعوان صاحب ان کی جگہ ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ میں نے استقبالیہ کلرک سے کہا کہ اعوان صاحب سے بات کروائیں۔ پھر انھیں بتایا کہ مجھے لاہور سے منیر احمد غازی صاحب نے بھیجا ہے۔ کہنے لگے کہ میں منیر احمد غازی صاحب کو نہیں جانتا، میں نے کہا کہ وہ آپ کو جانتے ہیں، میں ان سے آپ کی بات کروا دوں گا۔

اعوان صاحب نے کہا کہ آپ بیٹھیں میں آپ کو بُلواتا ہوں۔ میں تقریباً ایک گھنٹہ ''استقبالیہ'' میں بیٹھا رہا لیکن انھوں نے نہیں بُلوایا۔ آخر میں نے انھیں یاددہانی کروائی تو بادلِ نخواستہ مجھے بُلوایا۔ میں نے غازی صاحب کا خط اور کارڈ انھیں دکھایا۔ انھوں نے کہا کہ کسی کو ویزہ دلوانا بڑی ذمے داری کا معاملہ ہے۔ یہ خط صدیقی صاحب کے نام ہے چنانچہ یہ کام نہیں کرسکتا اور اپنی معذوری ظاہر کردی۔

میں نے وزارتِ خارجہ کے تین چار افسروں کے نام لیے۔ انھوں نے بعض کے بارے میں کہا کہ وہ سبکدوش ہوچکے اور بعض کے بارے میں کہا کہ میں نہیں جانتا۔ اس سے پیشتر کہ مجھے جانے کو کہتے، ایک اور رشتے دار کا نام یاد آگیا جن سے میں کافی دیر پہلے ملا تھا۔ جب میں نے ان کا نام لیا تو وہ ایک دم کرسی سے ۲/فٹ اُچھل گئے۔ کہنے لگے، اُنھیں آپ جانتے ہیں؟ میں نے کہا بالکل آپ میری بات کرادیں۔ انھوں نے اسی وقت وہاں فون ملوایا اور ان سے بات کی۔ پہلے تو سرکاری باتیں کرتے رہے، پھر میرا حوالہ دیا اور بات کروائی۔ وہ رشتے دار بڑی دیر تک مجھ سے خیریت پوچھتے رہے اور دفتر میں آنے کی وجہ پوچھی۔ پھر فوری طور پر اعوان صاحب سے کہا کہ یہ میرے عزیز ہیں، ان کو آج ہی ویزہ دلوائیں۔ ان کے ''احکامات'' سنتے ہی اعوان صاحب بالکل تبدیل ہوگئے۔ مجھے چائے وغیرہ دی اور ایک افسر میرے ساتھ سعودی سفارت خانے بھیجا۔ چند گھنٹوں بعد ویزہ لگا پاسپورٹ میرے ہاتھ میں تھا۔

اب مسئلہ ''زادِراہ'' کا تھا۔ ایک صاحب کو رقم قرض دی تھی لیکن اس کی واپسی تقریباً ناممکن تھی۔ میں کئی برس سے پیسے مانگ رہا تھا مگر نا کامی ہی ہوئی۔ بہرحال بی کلرا کے انھیں ویزہ دکھایا اور رقم مانگی تو انھوں نے ۲/روز کا وعدہ کیا۔ ٹھیک ۲/روز بعد مجھے پیسے دے دیے۔ یوں میں ٹھیک ایک ہفتے بعد ''مکہ شریف'' گیا اور عمرہ کی سعادت حاصل کرلی۔

(۱) میں نے فریضۂ حج ۱۹۹۷ء میں ادا کیا۔ اس سے ایک سال قبل میں ملازمت کے سلسلے میں ایبٹ آباد میں تھا۔ ایک روز پنجتی کے ڈرائیور نے ایک ماہ کی چھٹی مانگی۔ میں نے کہا کہ ایک ماہ کی چھٹی کے لیے تمھیں

کم از کم ۱۵/روز قبل درخواست دینی چاہیے تھی تاکہ تمھاری جگہ کسی اور ڈرائیور کا انتظام کرتے۔ ۷/روز بعد تم اپنی پر جا رہے ہو، اتنے تھوڑے عرصے میں نئے ڈرائیور کا انتظام کیسے ہوگا؟ اس نے کچھ ایسی مجبوری بتائی کہ مجھے اسے چھٹی دینی پڑی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ڈرائیور کا انتظام بھی کردے گا۔ جب ۲/روز بعد اُس کی چھٹی شروع ہوئی اور ڈرائیور کا انتظام نہیں ہوا تو مجھے پریشانی لاحق ہوئی۔ اتنے میں ایک کمپنی کا ٹھیکیدار کسی دفتری کام سے میرے پاس آیا۔ اُسے بھی اپنی پریشانی کا بتایا تو اُس نے کہا کہ میرا بھائی سعودی عرب میں ڈرائیوری کرتا ہے۔ آج کل ۲/ماہ کی چھٹی پر آیا ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ کہیں مجھے ۲/ماہ کے لیے ملازمت پر لگوا دو۔ اب کینٹین میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ اُسے فوراً بلواؤ۔ جب وہ آیا تو میں نے اُس سے ڈرائیونگ لائسنس اور شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی مانگی۔ دونوں چیزیں اُس نے مجھے دے دیں۔ میں نے پرنسپل مینیجر سے اُس کی ایک ماہ کے لیے عارضی ترقی کے احکامات جاری کروا دیے۔ اتفاق سے اُسی روز مجھے ایک سرکاری کام کے تحت پشاور جانا پڑا۔ واپسی پر اُسی ڈرائیور نے باتوں باتوں میں بتایا کہ اُس کا والد علمِ نجوم کا ماہر ہے۔ آپ مجھے اپنی تاریخ پیدائش اور پورا نام لکھ کر دیں، میں آپ کا زائچہ بنا کر لاؤں گا۔ میں نے اُسے مطلوبہ معلومات دے دیں۔ دوسرے روز وہ ڈرائیور جسے میرے پاس ملازمت کرتے ۲۴/گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے، میرا زائچہ بنوا لایا۔ اس میں میرا ماضی، حال اور میرے مستقبل کا حال لکھا تھا۔ یہ بھی درج تھا کہ میرے بائیں بازو پر ایک تل کا ہونا ضروری ہے۔ نیز یہ کہ اگلے سال میں حج بیت اللہ سے مستفید ہوں گا۔ جب میں نے اپنے بائیں بازو پر دیکھا تو واقعی تل موجود تھا۔ روزمرہ زندگی میں اس پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ پھر اگلے سال میں حج بیت اللہ سے بھی مستفید ہوا۔

میں نے اُس ڈرائیور سے پوچھا، تمھارے والد کیا کرتے ہیں۔ اُس نے بتایا کہ وہ ریٹائرڈ فوجی ہیں۔ نہتیاگلی میں قالینوں کی دُکان کے باہر انگوٹھیوں کے نگینے بیچتے ہیں۔ اس واقعے کے چند روز بعد میرے ایک دوست کراچی سے مع خاندان آئے۔ میں انھیں سیر کرانے نہتیاگلی لے گیا۔ اتفاق سے مجھے اُس ڈرائیور کے والد صاحب یاد آگئے۔ تھوڑی تلاش کے بعد اُن سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا، مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے انھیں اپنے دوست سے ملوایا اور کہا کہ اُن کا زائچہ بھی بنائیے۔

انھوں نے دوست کا نام اور تاریخ پیدائش پوچھی۔ پھر تھیلے میں سے ایک کاپی نکالی جس پر پہلے سے بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ پھر میرے دوست سے کہا کہ اس کے یہ ۳/صفحے پڑھیے۔ میرا دوست جوں جوں تحریر پڑھتا گیا، اُس کے چہرے پر اُتار چڑھاؤ آتا رہا۔ جب وہ صفحات پڑھ چکا تو اُس نے حیران ہوکر پوچھا ''بابا جی آپ نے اس میں میرا ماضی، حال اور مستقبل لکھ دیا ہے۔ آپ کو کیسے پتا چل گیا کہ میں آدھا ہوں۔''

بابا جی نے کہا ''یہی علم نجوم ہے۔'' میرے دوست نے خوش ہوکر بابا جی کو کچھ پیسے دینے چاہے لیکن انھوں نے لینے سے انکار کردیا۔

(۲) ۱۹۹۶ء میں ہمارے دفتر میں مسکین نامی شخص ملازم تھا۔ جب وہ حج کرنے گیا، میں نے اُس سے کہا، جب تم حج بیت اللہ کو اور مدینہ شریف حضور اکرم ﷺ کے روضۂ مبارک پر جاؤ تو میرا سلام عرض کرنا۔ یہ درخواست بھی پیش کرنا کہ میں حج پر آنا چاہتا ہوں، میرے آنے کا انتظام فرمائیے۔

جب مسکین حج کرکے واپس آیا تو اُس نے مجھ سے کہا، میں نے آپ کے لیے خصوصی دعا کی تھی۔ مجھے یہ ''اشارۂ ملا ہے کہ اگلے سال آپ حج بیت اللہ کی سعادت سے مستفید ہوں گے۔

جب میں اگلے سال ۱۹۹۷ء میں حج پر گیا اور مدینہ شریف پہنچ کر دعائیں کیں تو مجھے مسکین یاد آگیا۔ اس کی بھی بات بھی یاد آگئی۔ جب اس نے حج کی پیشگی

مبارک باد دی تھی۔ میں اُس کے لیے دعا کر رہا تھا کہ دیکھا، وہ سامنے سے چلا آرہا ہے۔ میں نے سوچا کہ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ جب وہ قریب آیا تو مجھ سے لپٹ گیا اور کہا دیکھیے، میں نے آپ کو ''اشارہ'' دے دیا تھا کہ آپ کا نام حج میں آگیا ہے۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اُس سے پوچھا وہ کس طرح دوبارہ یہاں آگیا؟ اس نے بتایا کہ پچھلے سال میں اپنے ''ذاتی خرچ'' پر حج پر آیا تھا۔ اس مرتبہ کمپنی کی ''قرعہ اندازی'' میں میرا نام نکل آیا۔ چنانچہ میں ادارے کے خرچ پر حج کرنے آیا ہوں۔

(۳) ۱۹۹۶ء میں ایبٹ آباد میں تھا۔ ایک روز خواب دیکھا کہ میں مدینہ شریف پہنچ گیا ہوں اور میری بھانجی بھی میرے ساتھ ہے۔ میں اسے ''روضہ شریف'' کی طرف کھینچتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہاں بلایا ہے تو پہلے ''روضہ شریف'' پر حاضری دینے ہیں لیکن وہ مجھے کہتی ہے کہ بازار چل کر خریداری کرتے ہیں۔ اسی کشمکش میں میری آنکھ کھل گئی اور پھر میں خواب بھول گیا لیکن جب حج کا بلاوا آیا تو وہ معجزاتی طور پر میرے ساتھ حج کے سفر پر گئی۔

(۴) ۱۹۹۷ء میں میری تقرری ملتان کے نزدیک واقع ایک قصبے، شجاع آباد میں ہوئی۔ ایک روز ایک آڈٹ ٹیم کے ساتھ سوئی فیلڈ جانے کا اتفاق ہوا۔ گرمی کا موسم تھا اور دوپہر کا وقت، سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ راستے میں کہیں پانی نہ ملا۔ ہمارا ایک ساتھی مقامی تھا۔ اس نے بتایا کہ راستے میں کچھ فاصلے پر برلب سڑک ایک گاؤں میں اس کے ملنے والے رہتے ہیں، اُن کے گھر چلتے ہیں۔ پانی وغیرہ پینے کے بعد تازہ دم ہو کر سفر جاری رکھیں گے۔ چنانچہ کچھ دور چلنے کے بعد ایک گاؤں میں پہنچے۔ میزبان بڑی محبت سے ملا۔ پانی اور چائے وغیرہ سے تواضع کی۔ گاؤں میں اس کی ڈسپنسری تھی جہاں وہ لوگوں کا تھوڑا بہت علاج کرلیا کرتا۔

میرے ساتھی نے بتایا کہ یہ بہت اچھا ''دست شناس'' ہے۔ اس نے سب لوگوں کے ہاتھ دیکھے اور انھیں بہت کچھ بتایا۔ جب اُس نے میرا ہاتھ دیکھا تو کہا کہ آپ کے ہاتھ میں ایک نئی لکیر بنی ہے۔ وہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ آپ حج/عمرہ کرنے جائیں گے یا وہاں سے ہو کر آئے ہیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ فی الحال تو میرا جانے کا کوئی پروگرام نہیں، آپ دعا کریں۔ اس نے کہا کہ آپ بہت جلد حج/عمرہ کی سعادت سے فیض یاب ہوں گے۔

(۵) ایک روز ہمارے پرانے پڑوسی کا فون آیا۔ ہمارے اُن سے ۴۰/سال پرانے تعلقات ہیں۔ انھوں نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے، آپ عمرہ/حج پر جا رہے ہیں۔ انھیں بھی بتایا کہ ہمارا تو کوئی پروگرام نہیں۔

انھوں نے بتایا ''میں نے خواب میں دیکھا کہ آپ کے مرحوم والدین ہوائی اڈے پر کھڑے ہیں۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے وہ کسی کو الوداع کہنے یا استقبال کو کھڑے ہیں۔ اسی خواب سے ہم نے اندازہ لگایا کہ آپ بہن بھائیوں میں سے کوئی حج/عمرہ پر جا یا آرہا ہے۔ تب حج پر جانے کا کوئی پروگرام نہ تھا لیکن اگلے ہی ہفتے بلاوا آگیا۔ یوں اُن کے خواب کی تعبیر صحیح ثابت ہوئی۔

(۶) جب میں مدینہ شریف پہنچا تو بالکل ٹھیک تھا لیکن دوسرے روز سے میرے گھٹنوں میں سخت درد شروع ہوگیا۔ کسی کروٹ چین نہیں تھا۔ ایک روز مسجد نبوی میں نمازِ عصر باجماعت ادا کرنے کے بعد قرآن شریف کی تلاوت کرتا رہا۔ جب مغرب کی اذان ہوائی تو میرے ساتھ ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ نہایت نورانی شکل کے اور ذکر الٰہی میں مصروف تھے۔ جب اذان ختم ہوئی تو انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے جیسے ہی وہ فارغ ہوئے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میرے گھٹنوں میں سخت درد ہے۔ انھوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی، بس خاموشی سے میرے گھٹنوں پر دم کیا اور ہاتھ پھیر دیا۔ جلد ہی میری تکلیف ٹھیک ہوگئی اور دوران، حج پھر نہیں ہوئی۔

ایک کہانی ایک سچائی

کام کی زیادتی کا نتیجہ

کم عمری میں ہارٹ اٹیک

ذاتی صحت سے بے خبر رہنے والوں کے لیے لمحۂ فکریہ

اعجاز احمد ڈنگہ

جمشید اشیائے خورونوش بنانے والی ایک بڑی کمپنی میں سیلز مین تھا۔ وہ ملک بھر میں گھوم پھر کر آرڈر لیتا، اکثر سفر میں رہتا اور سخت محنت و مشقت کرتا۔ کمپنی اس کے کام سے خوش تھی۔ اس کی تنخواہ معقول تھی اور وہ خوشحال زندگی بسر کر رہا تھا۔

ایک رات وہ بیرونی سفر کر کے گھر پہنچا تو اس کی طبیعت سخت خراب ہوگئی۔ وہ فوری طور پر ہسپتال پہنچا۔ اس کے بدن میں انفیکشن ہو رہی اور وہ ۔۔۔ کر رہا تھا۔ اُسے ایمرجنسی روم پہنچایا گیا، ڈاکٹر نے اس کا بڑی توجہ سے معاینہ کیا اور اسے بُری خبر سنائی کہ اُسے ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔ وہ بڑا حیران ہوا۔

وہ جوان تھا۔ اس کی عمر صرف ۴۳/سال تھی۔ اِس سے قبل جمشید نے دل کی تکلیف کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اسی لیے جمشید کو یقین نہ آیا لیکن جب ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ اگر فوری طور پر اسے طبی امداد نہ ملی تو وہ مر بھی سکتا ہے تو اسے یقین کرنا پڑا۔

جمشید کو فوری طور پر آپریشن تھیٹر پہنچایا گیا۔ سرجنوں نے اس کے سینے میں ۳/ٹیوبیں جنھیں سٹنٹ کہا جاتا ہے، اس کی بند شریانیں کھولنے کے لیے داخل کردیں۔ اس آپریشن سے اس کی جان تو بچ گئی لیکن کئی سوال اُٹھ کھڑے ہوئے کہ اسے اتنی کم عمری میں دل کا دورہ کیوں پڑا؟ اس کے پورے خاندان میں کبھی کسی کو دل کی بیماری نہیں تھی۔

۲۰۰۴ء میں ۲۹/ہزار افراد کے معاینے کے بعد یہ نتیجہ اَخذ کیا گیا تھا کہ امراضِ قلب میں مبتلا ۹۰/فیصد لوگ کولیسٹرول کی زیادتی اور ذیابیطس کے باعث اس کا نشانہ بنے۔ جمشید کی عمر جب ۴۰/سال تھی تو اُس وقت سے اس کے جسم میں کولیسٹرول کی سطح زیادہ تھی۔ اس نے کھانے پینے میں پرہیز شروع کردی تھی لیکن دعوتوں کے موقع پر جو اکثر ہوتی تھیں، وہ بدپرہیزی کر بیٹھتا۔

ماہرین کہتے ہیں کہ آپ ہارٹ اٹیک ہونے کے صحیح وقت کا تو اندازہ نہیں لگا سکتے لیکن احتیاط کرکے اِس جان لیوا بیماری سے کافی حد تک بچ سکتے ہیں۔ مردوں کو عورتوں کی نسبت ہارٹ اٹیک ۱۰/سے ۱۵/برس قبل ہوتا ہے۔ عموماً مردوں کو ۴۵/سال بعد اور عورتوں کو ۵۵/سے ۶۰/سال بعد۔

جمشید نہ تو الکوحل استعمال کرتا تھا، نہ تمباکو نوشی۔ وہ ورزش بھی کرتا تھا لیکن اس کی بیماری کی وجہ کچھ اور تھی۔ دراصل وہ روزانہ ۱۳/گھنٹے کام کرتا تھا۔ اکثر گھر سے باہر سفر میں رہتا۔ دوسری کمپنیوں سے اس کی کمپنی کا زبردست مقابلہ تھا۔ وہ اکثر فکرمند رہتا تھا کہ مصنوعات کی فروخت گر نہ جائے۔ لہٰذا زیادہ کام اور ذہنی دباؤ نے اسے بیمار کردیا۔ ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ ۸/گھنٹے روزانہ کام کرنا کافی ہے۔ ۱۱/گھنٹے سے زیادہ کام کرنا دل کے دورے کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ جمشید ڈاکٹروں کی بات سمجھ گیا اور اب اُن کی ہدایت کے مطابق زندگی گزار رہا ہے۔

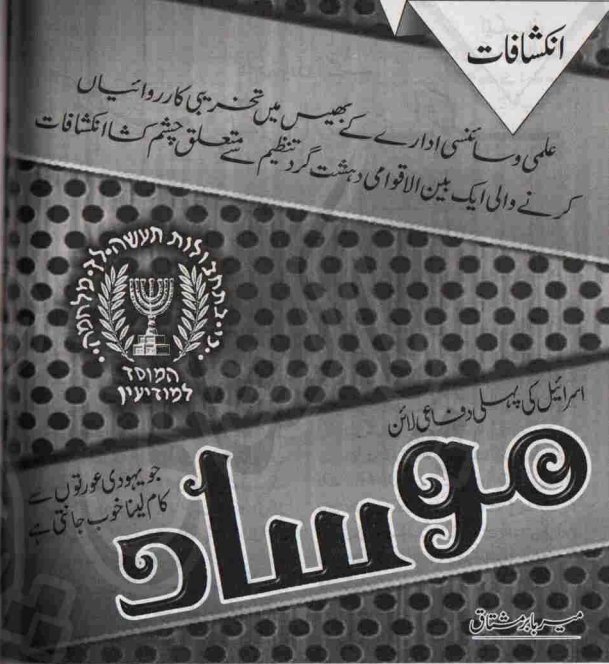

موساد

کا پورا نام ''انسٹی ٹیوٹ فار انٹیلی جنس اینڈ اسپیشل سروسز'' ہے۔ بظاہر یہ اپنے آپ کو علمی اور سائنسی ادارہ کہتا ہے جب کہ برطانیہ کا خفیہ ادارہ ایس آئی ایس جاسوسی ادارہ خود کو فرم سمجھتا ہے۔ امریکی جاسوسی ادارہ سی آئی اے خود کو کمپنی کہتا ہے۔ سارے نام صرف ان کی اصلیت چھپانے کے لیے رکھے گئے ہیں ورنہ ان کا اصل کام دشمن ممالک کو نقصان پہنچانا اور ان کی چھپی سرگرمیوں سے اپنی حکومتوں کو آگاہ کرنا ہے۔ ان اداروں کے کئی ایجنٹ کئی مرتبہ تخریبی کارروائیوں میں ملوث پائے گئے اور اپنے جرائم کی پاداش میں گرفتار ہو کر پھانسی کی سزا تک پا چکے۔

آئیے ہم موساد کے حوالے سے جانتے ہیں جو اسرائیل کا جاسوسی اور تخریب کاری کا ادارہ ہے۔ یہودیوں نے سرزمین فلسطین پر ناجائز قبضے کے بعد ایک ایسی ریاست قائم کرلی جس کا قانونی اور اخلاقی جواز نہیں۔ یہ ریاست (اسرائیل) امریکا اور یورپ کے ناجائز تعلقات سے پیدا ہونے والا ناجائز (Illegitimate) بچہ ہے۔ اس بچے کی پیدائش میں اقوام متحدہ (U.N.O) نے مڈ وائف کے فرائض انجام دیے۔ روس بھی اس فتنہ کی پرورش میں شریک رہا۔ وہ پہلا ملک تھا جس نے اسرائیل کو باقاعدہ تسلیم کیا۔

کہا جاتا ہے کہ جرمن نازیوں نے ۴۰ء کے عشرے میں ۶۰ر لاکھ یہودیوں کا قتل کیا۔ یہ یہودیوں کا دعویٰ ہے۔ حقیقت میں اس کے اندر سچائی نہیں۔ اسرائیلی حکومت اور پرانی نسل کے یہودی اپنی نئی نسل کو ہر وقت اس قتل عام کی یاد دلاتے رہتے ہیں کہ کس طرح تم کو بکروں اور مینڈھوں کی طرح ذبح کر دیا گیا۔ یہ خوف یہودیوں کے بے مثال اتحاد کی وجہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کو یہودیت پر فخر ہے۔ ان کے اندر یہ عزم بھی پایا جاتا ہے کہ وہ اپنی ریاست (اسرائیل) کو کمزور نہیں ہونے دیں گے۔

موساد کی اعلیٰ کارکردگی ان کے احساسات کا عکس ہے۔ موساد کے لیے کام کرنے والے مرد ہوں یا خواتین، دوسرے ممالک کے جاسوسی اداروں سے زیادہ تندہی کے ساتھ ہر خطرہ مول لے کر اسرائیل کو مستحکم کرنے کی خدمت بجالاتے ہیں۔

موساد کی بنیاد رکھتے ہوئے اسرائیلی خفیہ ایجنسی کے سربراہ نے ۱۹۵۳ء کو ایک فرمان جاری کیا کہ ہماری ریاست (اسرائیل) جو اپنے وجود کے پہلے روز سے ہی خطرات میں گھری ہوئی ہے۔ چنانچہ خفیہ ایجنسی ہمارے لیے پہلی دفاعی لائن کا کام کرتی ہے۔ ہمارا تحل دوع مشرق وسطیٰ کے قلب میں ہے۔ اس لیے ہمیں ہر وقت اردگرد کے حالات سے باخبر رہنے کی ضرورت ہے۔

(Mossud by Ronald Payne. P.10)

اسرائیل کی آبادکاری میں چاروں اطراف سے یہودی آ کر آباد ہوئے ہیں۔ روس اور یورپ کے یہودی فوجی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان لوگوں کا کلچر اور زندگی گزارنے کا طریقہ مختلف ہے۔ ان میں صرف مشترک یہودیت ہے۔ اس کے علاوہ دشمن کا خوف ان کو آپس میں جوڑے ہوئے ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسرائیل کا ناپاک وجود امریکی حکومت اور وہاں کی یہودی تنظیموں کا مرہون منت ہے جو عموماً عالم کفر عالم اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے ہر وقت مستعد اور متحد رہتی ہیں۔ امریکہ کی سی آئی اے ہو، روس کی کے جی بی، فرانس کی خفیہ ایجنسی ڈی ایس ٹی وغیرہ ہو، موساد کو معلومات فراہم کرنے اور اس کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرنے میں بڑی فراخ دلی ثابت ہوئی ہیں۔

کمیونزم کی بیسویں پارٹی کانفرنس کے ایک خفیہ اجلاس سے خروشیف نے خطاب کیا اور اسٹالن کے مظالم اور جرائم پر کڑی تنقید کی۔ اس خفیہ اجلاس میں کی گئی تقریر امریکی حکومت کے ذریعے بین الاقوامی پریس تک پہنچائی گئی۔ کمیونزم پر یہ پہلی مضرب کاری تھی۔ یہ تقریر امریکی حکومت تک کیسے پہنچی، یہ کارنامہ موساد کا تھا۔ یہ بات کسی طرح باہر کی دنیا تک پہنچ گئی کہ خروشیف کی تقریر میں بہت ہی چونکا دینے والے انکشافات کیے گئے ہیں۔ لہٰذا دنیا بھر کی خفیہ ایجنسیاں تقریر کا اصل متن حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ میں مصروف ہو گئیں۔ آخر کار موساد نے اس تقریر کا مکمل متن حاصل کرلیا۔ پہلے یہ فیصلہ ہوا کہ یہ تقریر اپنی (یعنی اسرائیل) حکومت کو دی جائے لیکن موساد کے کچھ بہت بڑوں نے یہ مکمل متن سی آئی اے کو دے دیا تاکہ دنیا کو چونکا دینے والا یہ انکشاف امریکی حکومت کی طرف سے ہو۔

موساد کے اس تقریر کو حاصل کرنے کے بارے میں جو اشارے ملتے ہیں وہ یہ کہ موساد کی ایک خوبصورت یہودن ایجنٹ نے مشرقی بلاک کے کمیونسٹ لیڈر کو تقریر کی ایک نقل بیچنے پر آمادہ کرلیا۔ اس آمادگی کا سبب حسن اور ڈالر دونوں بنے۔ موساد نے اس دوطرفہ تجارت کے ذریعے امریکی حکومت سے بہت سے مفادات سمیٹے۔

(رونالڈ پین اِن موساد، ص ۱۸۲)

موساد کے کئی ایسے ایجنٹ تھے جو روس سے بھاگ کر

اسرائیل میں آباد ہوئے، اس لیے یہ لوگ روس اور اس کے خفیہ نظام کے متعلق بہت کچھ جانتے تھے۔ لہٰذا موساد نے امریکا کو (سی آئی اے کی وساطت سے) روس کے متعلق بہت قیمتی معلومات فراہم کیں۔ صدر ناصر کے دور میں روسیوں کی طرف سے عربوں کو جدید ترین اسلحہ ملا کرتا تھا۔ اس اسلحہ کے متعلق مکمل تکنیکی معلومات اور ان کے حصول کی وساطت سے امریکی اسلحہ سازوں تک پہنچتے تھے۔

روسی ٹینک T-72 کا ماڈل بھی اسرائیلیوں نے امریکیوں تک پہنچایا۔ اس کے عوض امریکیوں نے اپنا ''سپر الیکٹرانک سسٹم'' اور اس کے متعلق مکمل راہنمائی اسرائیلیوں تک پہنچائی۔ اسرائیلی وزیر اعظم بیگن، جولائی ۱۹۷۷ء کو واشنگٹن یاترا کو گیا تو اس نے امریکی صدر جمی کارٹر کو خفیہ معلومات کی ایک فائل پیش کی جو امریکا کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ عرب اسرائیل جنگ کے بعد اسرائیل نے امریکا کو روس کے تیار کردہ میزائلوں کے کئی نمونے فراہم کیے۔ یہ ''فضا سے زمین پر'' اور ''زمین سے فضا میں'' مار کرنے والے دونوں طرح کے میزائل تھے۔

شام اور مصر نے ۱۹۷۳ء کی جھڑپوں میں روس کا T-72 ٹینک استعمال کیا تھا۔ موساد نے یہ ٹینک امریکا کو فراہم کیے۔ اس ٹینک میں ایسے خاص الخاص فلٹر لگے ہوئے تھے جو جراثیمی جنگ (Germ Warfare) میں حفاظت کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ امریکی سائنس دانوں کو ان ٹینکوں سے بہت مفید معلومات ملیں۔ امریکا نے یہ معلومات نیا اسلحہ بنانے اور نئی حکمت عملی (Tactics) تیار کرنے کے لیے استعمال کیں T-72 ٹینک جنگ کے دوران ''مالِ غنیمت'' کے طور پر اسرائیل کے ہاتھ آئے تھے۔

''اسرائیلی ایجنسیوں نے ایران کو خفیہ طور پر اسلحہ فراہم کر کے ایک اور مثال قائم کی۔ اسلحہ کا خفیہ کاروبار کرنے والوں نے ۱۹۸۰ء میں امریکا میں بنے ہوئے جیٹ جنگی طیاروں کے لیے ۲۵۹ فالنو ٹائر ایران کو فراہم کیے۔ اگلے سال ایران نے اسرائیل کی وساطت سے چھ کروڑ ڈالر کا اسلحہ خریدا۔ یہ راز اس وقت افشا ہوا جب ایک طیارہ قبرص سے ایران کو اسلحہ لے جاتے ہوئے راستہ میں دورانِ پرواز کھو گیا۔ تب پتا چلا کہ یہ ان بارہ طیاروں میں سے ایک تھا جو ایرانی ٹینکوں کو فالتو پرزے فراہم کرنے کے کام پر مامور تھے۔ ایران یہ ٹینک عراق کے خلاف جنگ میں استعمال کر رہا تھا۔'' (Mossad P190 by Ronald)

اسرائیل نے کئی ایسے ممالک کو اسلحہ فروخت کیا جن کا اقوام متحدہ اور امریکا نے اس سلسلے میں بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔ مثلاً اقوام متحدہ نے شمالی افریقا کو اسلحہ بیچنے پر پابندی لگائی تو اسرائیل نے اسلحے سے لدے ہوئے ۸ر جنگی جہاز (Warships) پیرو ٹوریا کی حکومت کو فروخت کیے اور یہ اسلحہ موساد نے ہی خریدا اور تک پہنچایا۔ اس اسلحہ میں سنچورین (Centurion) ٹینک، مارٹر، توپیں اور جبرئیل راکٹ (Gabriel Rockets) بھی شامل تھے۔ اس سودے سے امریکی ناراض ہوئے لیکن لاڈلے بچے کو کچھ نہیں کہا۔

چین کو راضی کرنے کے لیے امریکا نے جب تائیوان کو حملہ کے لیے استعمال ہونے والا اسلحہ (Offensive Weapons) دینا بند کر دیا تو اسرائیل نے ۱۹۷۸ء میں اسلحہ بڑی مقدار میں تائیوان کو فروخت کیا۔ اس سودے میں ۵۰ر بمبار طیارے بھی تھے۔ یہ کام بھی موساد نے انجام دیا۔ اسی سال امریکی صدر جمی کارٹر نے نگارا گوا میں سیموسا (Samosa) کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا تو اسرائیل نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے خود کار اسلحہ اور فوجی ٹرک فراہم کیے اور یوں وہاں کی خانہ جنگی طویل ہوگئی۔ اس طرح کی کارروائیوں میں اسرائیل نے ۱۹۷۰ء کے عشرے میں بڑی دولت کمائی اور اسلحہ کی صنعت اس کی سب سے اہم صنعت بن گئی۔

اسرائیل کے جرائم کی یہ فہرست بہت طویل ہے۔ مصر میں کرنل ناصر نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تو اس کے بعد امریکا کے وزیرِ خارجہ جان فاسٹر ڈلیس کو توقع تھی کہ مشرق وسطیٰ میں سوویت کمیونزم کے خلاف بند باندھنے میں مصر ہمارے ساتھ معاون ہوگا۔ اس بات کے شواہد بھی ملتے ہیں کہ کرنل

ناصر کو اقتدار دلانے میں سی آئی اے کا ہاتھ ہے۔

حکومت برطانیہ اپنی فوجیں کو مصر سے نکالنے کے لیے جنرل ناصر سے کوئی سمجھوتا کر لینا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے امریکی صدر آئزن ہاور کو اپنے منصوبے سے پوری طرح آگاہ کیا۔ یہ ۱۹۵۴ء کے موسم گرما کی بات ہے۔ اس سلسلہ میں امریکا اور برطانیہ کے درمیان ہونے والے معاہدے کے بارے میں اسرائیلی جاسوس ادارے (Aman) نے دو دن میں تمام تفصیلات معلوم کر لیں اور اسرائیل کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ برطانیہ نے سوئز نہر خالی کرانے کے لیے منصوبہ بندی کر لی ہے۔ ان معلومات نے اسرائیلی حکومت کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اسرائیل نے اس پر اپنا ردعمل یوں ظاہر کیا کہ مصر میں مقیم یہودیوں کے ذریعے قاہرہ اور اسکندریہ کے اندر برطانوی اور امریکی سفارت خانوں میں بموں کے دھماکے کرانے کا منصوبہ بنایا۔ اس سلسلے میں مصر میں یہودی تخریب کاروں کا ایک جال بچھایا گیا جس کی راہنمائی کا کام اسرائیل کی سرزمین سے موساد کے افسروں کے سپرد کیا گیا۔

ان تخریب کاروں کا نشانہ امریکی اور برطانوی سفارت خانہ تھا اور یہ کام مصری یہودیوں کے ذریعے انجام پانا تھا۔ اس لیے اندازہ یہ تھا کہ اگر کوئی پکڑا گیا تو کرنل ناصر کی توجہ فوری طور پر الاخوان المسلمین کی جانب مبذول ہوگی جنہیں ناصر اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتا ہے۔ اس کام میں اسرائیل ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ ایک یہ کہ امریکا و برطانیہ اور مصر کے درمیان ابھرنے والے خوشگوار تعلقات کو نقصان پہنچانا اور دوسرے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی تحریک الاخوان المسلمین کو ناصر کے ہاتھوں کچلوانا تھا۔

تخریب کاری کے لیے مصر کے کئی پرجوش یہودیوں کو بھرتی کیا گیا۔ ان میں دو کارکن بہت مشہور ہوئے۔ وکٹورین نینو اور دوسرا وکٹر سیموی۔ وکٹورین ایک انتہائی خوبصورت اور پرکشش یہودن، دوسرا ایک باہمت انجینئر۔ خاتون جاسوس وکٹورین کو جاسوسی دنیا کی قلوپطرہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ماضی کی اس ملکہ مصر نے اپنے حسن کے جادو سے روم کے شہنشاہ، انتھونی کو تگنی کا ناچ نچوایا تھا۔

جولائی ۱۹۵۴ء کو انہیں حکم ملا کہ مصر اور امریکا کے درمیان ہونے والے معاہدے کو روکنے یا ملتوی کرنے کے لیے

۱۔ انتظامی ادارے اور اطلاعاتی مراکز

۲۔ اقتصادی ادارے

۳۔ برطانوی حکومت نمائندے اور برطانوی شہری اور ان کی گاڑیاں

۴۔ کوئی دوسری ایسی چیز جو مصر و برطانیہ کے سفارتی اور سیاسی تعلقات خراب کرنے کا سبب بن سکے، سوئز نہر کے علاقے میں تخریب کاری کے امکانات کیا ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں فوری طور پر مطلع کرو۔ روزانہ ۷ بجے ڈیوبینڈ کی پر ہمارا پیغام سنا کرو۔ (موساد، ص ۵۸)

۱۴ر جولائی کو تخریب کار اسکندریہ میں امریکی مرکز اطلاعات کے کتب خانے میں آتش گیر مادہ رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کامیابی کے بعد انہوں نے کرنل ناصر کے انقلاب کی سالگرہ کے موقع پر قاہرہ کے سینما گھروں اور مرکزی ریلوے اسٹیشن پر بم رکھے جن میں کوئی بھی وقت پر نہ پھٹ سکا۔ ان کی دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ ایک ۱۹ سالہ تخریب کار فلپ تھمین سن کی جیب میں رکھا ہوا بم وقت سے پہلے پھٹ پڑا۔ بم اسکندریہ کے سینما گھر میں رکھنا تھا۔ مصری پولیس کی اسپیشل برانچ نے کیپٹن حسن المنادی نے پھرتی اور مہارت سے کام لے کر مذکورہ تخریب کار کو بری طرح جلنے سے بچا لیا۔

چند گھنٹوں کے اندر مصری پولیس نے تخریب کاری کے پورے نیٹ ورک کو لپیٹ کر رکھ دیا۔ اس کارروائی کے چار دن کے بعد مصری سیکورٹی والوں نے فاتحانہ اعلان کیا کہ انہوں نے گیارہ تخریب کاروں کو گرفتار کیا ہے جن میں دس مرد اور ایک خاتون ہے۔ قاہرہ کے اخبارات نے اس کو خونخوار صیہونی ٹولہ کا نام دیا۔ ان تخریب کاروں میں ڈاکٹر مرزوق اور سموئل آذر کو قاہرہ میں جنوری ۱۹۵۵ء کو پھانسی دی گئی۔ خوبصورت یہودن کو ۱۵ سال قید کی سزا سنائی گئی۔

اس نے ۲ مرتبہ خودکشی کی کوشش کی لیکن بچ گئی۔ ۱۹۶۸ء میں جنگی قیدیوں کے تبادلے میں وہ رہا ہوکر اسرائیل آئی۔ اسرائیل میں اس کا استقبال ایک قومی ہیروئن کے طور پر کیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں اس نے کرنل ایلی بوگر (Eli Boger) کے ساتھ شادی رچالی۔ اس شادی میں اسرائیلی وزیر اعظم مسز گولڈ امئیر اور اعلیٰ حکومتی عہدیداران نے شرکت کی۔

اسرائیل تخریب کار پکڑے تو گئے لیکن وہ اپنے مقصد میں اتنے کامیاب ہوگئے کہ کرنل ناصری حکومت کو امریکا کے بجائے سوویت یونین سے جدید ترین اسلحہ کی زبردست کھیپ اور جیٹ لڑاکا طیارے ملنے شروع ہوگئے۔ برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے مصر پر حملہ کرنے کی دھمکی دے دی۔ امریکی صدر آئزن ہاور کی سیاسی بصیرت کی داد دیں کہ اس کی ایک دھمکی نے ان خونخوار بھیڑیوں کی پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کردیا لیکن کرنل ناصر سوویت یونین کا ہوکر رہ گیا اور اندرون ملک اس نے اخوان المسلمین پر مظالم شدید ڈھائے۔

مغرب اور اسرائیل نے یہ پروپیگنڈہ زوروں پر شروع کردیا کہ پاکستان ''اسلامی بم'' بنا رہا ہے۔ یہ نام نہاد بم اسرائیل کے وجود کو ملیامیٹ کرکے رکھ دے گا۔ اب یہ موساد اور آمان (Aman) کا فرضِ منصبی قرار پایا کہ ایٹم بم کے اندیشے کو حقیقت کا روپ دھارنے سے بہرصورت روک دیا جائے۔ موساد کی رپورٹ کے مطابق ایٹم بم اور کیمیاوی ہتھیاروں کا نوری خطرہ عراق کی جانب سے ہے۔ عراق نے فرانس سے ۷۰ ریگاواٹ کا ایک ری ایکٹر خرید لیا ہے، اس کے ساتھ ہی دوسرا ری ایکٹر بھی فوری فراہمی کے لیے تیار ہے۔ یہ ری ایکٹر بغداد کے قریب لگنا تھا۔ ان دونوں ری ایکٹروں کی کل قیمت ۲۷۵ ملین ڈالر تھی۔ اس سودے میں ۱۲ ہزار کلوگرام یورینیم بھی شامل تھا۔ یہ مسالہ ۳ سے ۴ ہزار ایٹم بم تیار کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس سودے میں یہ شرط بھی شامل تھی کہ عراق، فرانس کو تیل بیچے گا۔ تیل کے بحران کے بعد فرانس کو تیل کی شدید ضرورت تھی۔ سودے میں یہ شرط بھی شامل تھی کہ

عراق، فرانس سے روایتی ہتھیار بھی خرید اکرے گا۔

فرانس میں ایسے بھی سائنسدان اور فنی ماہرین موجود تھے جنہوں نے ایٹمی ہتھیار تیار کرنے کے سلسلہ میں اسرائیل سے تعاون کیا تھا۔ اس وقت فرانس، اسرائیل کا زبردست حامی اور معاون تھا۔ لیکن بعد میں صدر ڈیگال نے اپنی اسرائیلی حمایت واپس لے لی۔ چونکہ موساد کی تھنکیلی ٹیم فرانسیسی سائنسدانوں کے ساتھ مل کر کام کرچکی تھی اس لیے عراق کے ایٹمی پروگرام کے متعلق مکمل معلومات حاصل کرنا ان جاسوسوں کے لیے کچھ مشکل کام نہ تھا۔ ایٹمی منصوبہ پر کام شروع ہوتے ہی موساد کے ان ایجنٹوں تک جو بغداد میں متعین اور موجود تھے، تمام معلومات پہنچ گئیں۔

۱۹۷۹ء کے موسم بہار میں فرانسیسی کمپنی CNIM (یہ اس کے فرانسیسی نام کا مخفف ہے) نے عراق کے لیے مذکورہ بالا دونوں ری ایکٹر مکمل طور پر تیار کرلیے۔ تمام سامان کریٹوں میں بند کرکے گودی کی ورکشاپ نمبر تین میں رکھ دیے گئے اور ان کی سخت حفاظت کی جانے لگی لیکن سخت حفاظتی انتظامات موساد کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ خود فیکٹری میں کام کرنے والے کچھ ماہرین سے موساد کے روابط تھے جن کے ذریعے ان ری ایکٹروں کے متعلق ساری معلومات اس تک پہنچ چکی تھیں۔

موساد کے کارندوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ ۸ اپریل ۱۹۷۹ء کو رات کے وقت یہ سامان ٹرکوں کے ذریعے فرانس کی بندرگاہ مارسیلز تک پہنچایا جائے گا اور پھر وہاں سے بحری جہازوں کے ذریعے عراق پہنچ جائے گا۔ اس منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے موساد کے ایجنٹ دو دن پہلے ہی (۶ اپریل کو) فیکٹری کے اندر گھسنے میں کامیاب ہوگئے اور اس ٹیم نے آتش گیر مادہ سے نیوکلیئر سامان کے اہم حصوں کو اڑا کر رکھ دیا۔ پولیس کی تحقیقات سے یہ معلوم ہوا کہ فیکٹری میں داخل ہوکر کارروائی کرنے والوں کے پاس شیڈ کی دہری چابیاں تھیں۔

اس کے بعد ایک اور واقعہ بھی ہوا۔ ۱۹۸۰ء کے موسم گرما میں فرانسیسی پولیس کو پروفیسر یحییٰ المشہد کی لاش ملی۔ ان کو ہوٹل میریڈین میں خنجروں کے وار سے نہایت بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ اڑتالیس سالہ یہ عراقی نیوکلیئر سائنسدان امریکہ اور اسکاٹ لینڈ میں تعلیم یافتہ تھا اور ایک معاہدہ کے تحت عراقی حکومت کے ایٹمی پروگرام کو آگے بڑھانے کے منصوبہ پر کام کررہا تھا۔ وہ فرانسیسی ایٹمی ایجنسی کی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے فرانس آیا ہوا تھا۔ اس کی موت پر اسرائیلی ریڈیو کا تبصرہ یہ تھا کہ ''یہ ان چند عرب سائنسدانوں میں سے تھے جو نیوکلیئر سائنس میں اچھی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ اس کی موت کے نتیجے میں عراق کا ایٹمی پروگرام ۲ سال پیچھے چلا گیا۔'' (موساد۔ص ۲۳۱)

موساد کے متعلق امریکی سی آئی اے کی ایک رپورٹ کے یہ الفاظ ریکارڈ پر ہیں۔ دنیا کا بہترین جاسوسی ادارہ، بلاشبہ سی آئی اے کے پاس بہت ہی زیادہ تکنیکی وسائل پائے جاتے ہیں۔ روسی کے جی بی موساد سے بڑا اور منظم ادارہ ہے لیکن دشمن ممالک کسی اور جاسوسی ادارے سے اتنے خائف نہیں ہوتے جتنے موساد سے۔

موساد یہودی عورتوں سے بھی کام لینا خوب جانتی ہے خصوصاً صحافی خواتین سے۔ عام طور پر یہ خیال ہے کہ خواتین صحافی عموماً اپنے کام کے لیے جاسوسی کا کام کرتی ہیں۔ نشریاتی اداروں میں کام کرنے والی اکثر خواتین سے جاسوسی کا کام لیا جاتا ہے۔ ایسی خواتین اپنے اداروں کے انٹرویو ریکارڈ کرنے کے بہانے بڑی بڑی بااقتدار شخصیتوں سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔ موساد کے لیے کام کرنے والی سلویا رافیل نامی ایک عورت کو ہم بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ وہ اُردن میں ایک فرانسیسی صحافی کے بھیس میں کام کرتی تھی تاکہ وہاں پر فلسطینیوں کی کارگزاریوں سے مکمل طور پر آگاہی حاصل کرے۔

موساد کے ایجنٹ امریکا اور یورپی ممالک کے نمائندوں کے بھیس میں موجود ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ملک (اسرائیل) کے مفادات کی نگرانی کے ساتھ سیاسی معلومات بھی اسرائیل کو پہنچاتے ہیں۔ موساد نے کئی سابقہ نازی افسروں کو قتل کیا ہے۔ سعودی حکمران شاہ فیصل شہید اور کئی اہم شخصیات کے قتل میں اسرائیلی موساد کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ پاکستان کا ایٹمی پروگرام پُرامن مقاصد کے لیے رہا ہے مگر اس پروگرام کو بھارت اسرائیل نے اسلامی بم کا نام دے کر اپنے لیے خطرہ سمجھا کیونکہ اسرائیل کو خوف تھا کہیں یہ ٹیکنالوجی عربوں میں نہ پھیل جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو اسرائیل کے لیے یہ بڑا خطرہ ہوگا۔ اس حوالے سے یہ بات ریکارڈ پر ہے۔ بھارت اور اسرائیل نے کئی مرتبہ مل کر پاکستان کے کہوٹہ پلانٹ کو تباہ کرنے کے لیے پروگرام بنایا۔ ۱۹۸۳ء میں اپریل شیرون (موجودہ وزیر اعظم اور سابقہ وزیر دفاع) نے تجویز پیش کی کہ بھارت اور اسرائیل مل کر پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو تباہ کردیں مگر وہ یہ کام اس لیے نہ کرسکے کہ بھارت اسرائیل سے یہ کام تنہا کروانا چاہتا تھا۔

موساد کے سابق کارکن وکٹر اوسٹووسکی (Victor Ostro Vsky) نے بتایا کہ جولائی ۱۹۹۴ء میں بھارت کے ایٹمی سائنسدانوں کی ایک ٹیم نے اسرائیل کا خفیہ دورہ کیا تاکہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو تباہ کرنے کی منصوبہ بندی کرسکیں کیونکہ اسرائیل ۱۹۸۱ء میں عراق کے ایٹمی ریکٹر پر کامیاب حملہ کرچکا تھا۔ کشمیر کے اندر کشمیریوں کی تحریکِ آزادی کو کچلنے کے لیے اسرائیل نے بھارت کے ساتھ تعاون کیا مگر اللہ کے فضل سے وہ اس تحریکِ آزادی کو دبا نہ سکے۔ بھارتی خفیہ ایجنسی را کے موساد کے ساتھ روابط ہیں۔ یہ اپنے ایجنٹوں کی تربیت کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔

۱۱ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسرائیل کی تنظیم موساد کا کردار ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس حوالے سے کافی باتیں سامنے آرہی ہیں۔ قتل، اغوا، تشدد اور اسی طرح کی دوسری ظالمانہ کارروائیاں موساد کی نظر میں غیر اخلاقی، غیر قانونی اور ظالمانہ کارروائیاں نہیں ہیں۔ موساد کے لوگ اخلاق، قانون اور انصاف کے تصور سے عاری ہیں۔ مسلمانوں خصوصاً عرب ممالک کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا ان کا فرض اولین ہے۔

ارفع کریم اور بل گیٹس

تشنہ بریلوی

ایک غنچہ مرے گلشن میں کھلا، پھول بنا
اُس کی خوشبو سے معطر مرے گلشن کی فضا
میرا گلشن ہی نہیں سارا جہاں اُس پہ فدا
پھر وہ مُرجھا بھی گیا
سب نے مانگی یہ دعا
کاش اے کاش کوئی معجزہ ہو بہرِ خدا
معجزہ تو نہ ہوا
اور اشکوں کا ہر اک آنکھ سے پرنالہ بہا
ایسا ماتم کبھی دیکھا نہ سنا
باغِ فردوس کا دروازہ کُھلا
بڑھ کے حوروں نے اُسے چوم لیا
دِل کو ڈھارس دو ذرا
موت کے ڈھنگ الگ زیست کے انداز جُدا
اب بھی زندہ ہے ہر اک دل میں وہ پیاری گُڑیا
اُس کے اوصاف تو بل گیٹس سے ہی پوچھو ذرا
مائیکروسافٹ کا بانی کہ جو دولت کا نہیں ہے رسیا
بلینیئر ایک بھی دیکھا نہیں ہم نے ایسا
اُس نے ارفع کو چُنا اور اُسے اعزاز دیا
آئن سٹائن کا شاید اُسے وجدان ملا
شاعرہ بھی وہ بنی شعر لکھا خوب لکھا
ہاں مگر جسم تو کمزور رہا
کتنا ٹیلینٹ ہے اس ملک میں ظاہر یہ ہوا
تُو ارفع تو بنی راہنما

سفر نامہ

نمازی دو سے تین سو کلومیٹر دُور سے
جمعہ پڑھنے آتے ہیں

یہ ذرا جاپان تک

نوید احمد زبیری

جاپانی معاشرے میں
گزارے ۳ ماہ کا
اچھوتا احوال

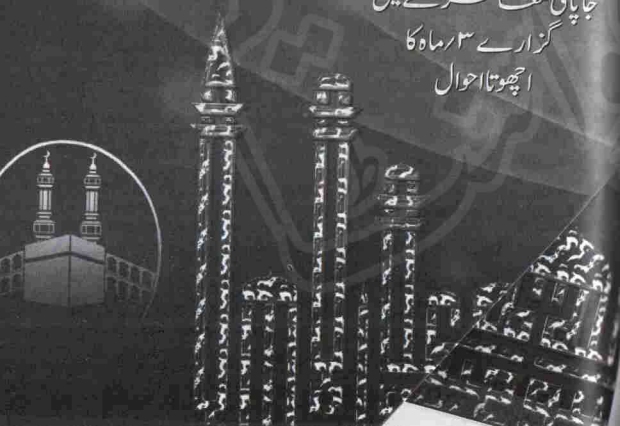

پائلٹ

اعلان کر رہا تھا کہ جہاز اس وقت ۳۰ ہزار فٹ کی بلندی پر محوِ پرواز ہے۔ اچانک مجھے اپنے استادِ محترم کی بات یاد آئی جو انھوں نے حفظِ قرآن کی تقریب میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمائی تھی ''بیٹا! میری بات یاد رکھنا، یہ قرآن آپ کو اُن بلندیوں پر پہنچائے گا جن کا آپ نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔'' بے شک استاد صاحب کی بات کا مطلب یہ بلندی نہ تھی لیکن بس ایسے ہی یہ بات یاد آگئی۔

۲۰۱۱ء میں جاپان کی ایک اسلامی فلاحی تنظیم اسلامک سرکل آف جاپان نے پاکستان سے ایسے ۸/حفاظِ قرآن کو جاپان آنے کی دعوت دی تھی جو رمضان المبارک میں نماز تراویح میں قرآن پاک سنا سکیں، نماز جمعہ اور دینی اجتماعات میں خطاب کرسکیں۔ خوش قسمتی سے میں بھی ان منتخب افراد میں شامل تھا جنھیں جاپان جا کر قرآن پاک سنانے کی سعادت نصیب ہوئی۔

۸/افراد میں سے ہم پانچ ۲۳/جولائی کو لاہور سے کراچی پہنچے۔ کراچی سے ہم نے سری لنکن ایئرلائن کے ذریعے ۹/گھنٹے بعد کولمبو کے لیے پرواز کرنا تھا۔ ہم نے یہ وقت کراچی ہوائی اڈے پر ہی گزارا۔ سری لنکن ایئرلائن نے تقریباً ساڑھے چار گھنٹے میں کولمبو پہنچا دیا۔ یہاں سے ہمیں جاپان کی پرواز ۵/گھنٹے بعد ملنی تھی۔ ہوائی اڈے پر نماز ادا کرنے کے لیے باقاعدہ جگہ بنی ہوئی تھی۔

سرزمینِ جاپان پر

۲۴/جولائی کو دوپہر ۱۲/ بجے (پاکستان میں اس وقت صبح کے ۸/ بجے تھے) ہم ٹوکیو کے ناریتا بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترے۔ ٹوکیو کا پرانا ہوائی اڈہ شہر کی آبادیوں کے درمیان گھر گیا ہے، وہاں اب صرف مقامی پروازیں اترتی ہیں یا کوئی خصوصی پرواز۔ نیا ہوائی اڈہ شہر سے تقریباً ۳/ گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ بہت بڑا اور بہت خوبصورت ہوائی اڈہ ہے۔

ہوئی جہاز سے ہم عمارت سے ملحقہ عمارت کے ذریعے ہوائی اڈے کی عمارت کے ہال کے اندر پہنچ گئے۔ ہال چاروں طرف سے بند تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اب کدھر جانا ہے۔ دراصل یہاں سے دوسری عمارت میں جانا ہوتا ہے جہاں امیگریشن کے حوالے سے سب کارروائی ہوتی ہے۔ دونوں ہالوں کے درمیان ریلوے لائن ہے۔ یہاں خودکار ریل کاریں چلتی ہیں۔ ایک ریل کار پر اِدھر سے امیگریشن والے ہال میں جاتے ہیں۔ دونوں عمارتوں کے درمیان ڈیڑھ ۱/۲ کلومیٹر کا فاصلہ ہے جو ۱۰/منٹ میں طے ہوتا ہے۔ پٹری زمین سے بلندی پر ہے۔ ریل کار کا ایک ہی ڈبا ہے جس میں چالیس پچاس افراد سوار ہو سکتے ہیں، ہم بھی اپنی باری آنے پر ریل کار میں سوار ہوئے اور دوسرے ہال میں پہنچ گئے۔ ہمارے ایک طرف ہوائی اڈے سے باہر کی دنیا نظر آرہی تھی اور دوسری طرف ہوائی اڈے پر کھڑے مختلف ملکوں کے جہاز اپنی نمائش کر رہے تھے۔

جب ہم دوسری عمارت میں پہنچے تو عملے کا کوئی آدمی کام نہیں کر رہا تھا۔ عملے کے کچھ افراد اِدھر اُدھر آپس میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ معلوم ایسا ہوتا تھا جیسے انھوں نے قلم چھوڑ ہڑتال کی ہوئی ہے۔ بہرحال چار پانچ منٹ بعد انھوں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا کہ ۱۱/ بجے ۲۰/منٹ کا وقفہ ہوتا ہے۔ اس وقفے میں بالکل کوئی کام نہیں ہوتا۔ ۱۲/بج کر ۱۹/منٹ پر ہر آدمی اپنے کام کی جگہ پر پہنچ جاتا ہے۔

ہر مسافر کو ایک کارڈ دیا گیا جو جاپانی زبان میں تھا۔ ہم نے اشاروں سے بتایا کہ ہم جاپانی نہیں ہیں۔ پھر ہمیں کارڈوں کا ایک پلندا دیا گیا۔ ہم نے ایسے کارڈ موجود تھے۔ اُردو میں تھا، انھوں نے کہا کہ اس کے علاوہ کوئی اور زبان کا خصوصی جھنجھلاہٹ ہمارے ساتھ نہ تھی بلکہ مسکراہٹ اور ہماری باتوں پر ہنسنا۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ سر ہوا۔

اب ہم پندرہ بیس کاؤنٹروں میں سے ایک کے سامنے قطار میں کھڑے ہوگئے اور جلد ہی ہماری باری آگئی۔ افسر نے پوچھا کہ آپ کو کس نے بلایا ہے؟ ہم نے بتایا کہ اسلامک سرکل آف جاپان نے ہمیں یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ اُن کا فون نمبر کیا ہے۔ ہم نے فون نمبر بتا دیا۔ (ہم نے محسوس کیا۔ ہمیں پتا چلا لیکن انھوں نے اسلامک سرکل کے دفتر فون کر کے معلوم کرلیا کہ انھوں نے ہمیں بلایا ہے۔) وہاں سے تصدیق کرنے کے بعد انھوں نے ہمارے پاسپورٹس پر مہریں لگا دیں۔

پاسپورٹس پر مہریں لگاتے لگاتے انھوں نے اُن ۲/ افراد کو ہم سے علٰحدہ کر دیا جو پچھلے سال بھی جاپان آئے تھے۔ انہیں وہ ایک طرف لے گئے۔ ہم ۳/افراد کا تفصیلی انٹرویو لینے کے لیے ایک افسر آگیا۔ ہم نے بتایا کہ ہم ''سین سے'' ہیں۔ ''سین سے'' جاپانی زبان میں استاد کو کہا جاتا ہے اور استاد کا یہاں بہت زیادہ احترام ہے۔ افسر کا رویہ ایک دم بہت مؤدبانہ ہوگیا۔ انٹرویو کے بغیر ہی ایک خاص دروازے سے اُس نے ہمیں باہر جانے کا اشارہ کیا جبکہ عام مسافر ایک اور دروازے سے جا رہے تھے۔ ہم دروازے سے باہر نکل کر پھر کھڑے ہوگئے۔ وہ افسر پھر آیا کہ اب کیا بات ہے؟ آپ اب کیوں نہیں جاتے؟ ہم نے اشاروں اور انگریزی کا سہارا لیتے ہوئے کہا کہ ہمارے ساتھی کہاں ہیں؟ وہ بیچارا ہمارے ساتھ ہم عمارت کی بالائی منزل سے اتر کر نیچے آئے۔ تھی وہاں کھڑے تھے۔ وہ ان کے پاس ہمیں لیتا چلا گیا۔

یہ سمجھ ہمنے کیرے کو دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا۔ ہم کسی پرانی تھے کہ ہم تو پہلی مرتبہ آئے ہیں سمجھ پکڑے گا۔ ان ساتھیوں پریشان تھے کہ ہمارے ساتھ کوئی مسئلہ بن گیا ہے اور کہیں واپس پاکستان نہ بھیج رہے ہوں۔

ہمارا استقبال کرنے کے لیے سعید بیگ صاحب آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا آئیں پہلے کچھ پانی وغیرہ پی لیں، پھر چلتے ہیں۔ وہاں ایک دکان تھی، وہ اس میں ہمیں لے گئے۔ سب سے پہلے تو یہ بات عجیب سی لگی کہ دکان کا تمام عملہ خواتین پر مشتمل تھا۔ ہم نے بوتلیں اٹھائیں، ڈھکن کھولے اور پینا شروع کر دیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں ادائی سے قبل بوتل پینے کا رواج نہیں۔ بہرحال لطیفہ ہوگیا۔

ہم ہوائی اڈے سے باہر آگئے

ہوائی اڈے سے ہم بذریعہ ہائی وے (ہماری موٹروے سمجھ لیں) سعید بیگ صاحب کے ساتھ روانہ ہوئے۔ سڑک کی دائیں طرف سبزہ، پہاڑیاں وغیرہ تھیں اور بائیں طرف جاپان کی مشہور کمپنیوں کے شوروم اور دفاتر۔ چالیس پچاس منٹ سفر کرنے کے بعد ہم ہائی وے سے باہر آگئے۔ یہاں آبادی کے درمیان ایک مسجد ہے جس کا نام حرا مسجد ہے۔ یہی اسلامک سرکل آف جاپان کا مرکزی دفتر بھی ہے۔

مسجد کے باہر ایسی کوئی علامت نہیں جس سے ظاہر ہو کہ یہ عبادت خانہ ہے۔ صرف ایک بورڈ لگا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرا مسجد ہے۔ اس کا رقبہ ایک اندازے کے مطابق ۱۰×۱۵/ مربع فٹ ہوگا۔ پہلی منزل پر وضو کی جگہ، بیت الخلا ہیں اور خواتین کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ دوسری اور تیسری منزل پر مردوں کے لیے نماز پڑھنے کا انتظام ہے۔ چوتھی منزل پر باورچی خانہ ہے۔

مسجد حرا میں ہماری ملاقات خرم تحسین سے ہوئی۔ آپ اسلامک سرکل کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ عشرت ہاشمی ملے جو سابق امیر ہیں۔ سعید بیگ کھانے کا ہم سے پوچھ کر پھنس گئے۔ اس وقت (دوپہر کے ۳/ بجے) سے اوپر وقت ہو چکا تھا اور ۳/ بجے تمام ہوٹل یہاں بند ہو جاتے ہیں۔

بہرحال بیکری کی تیارشدہ اشیا دوسری دکانوں سے مل جاتی ہیں۔ بیئر اور بوتلیں وغیرہ لے کر ہم نے پیٹ کو جاپانی دانے پانی سے متعارف کرایا۔

کھانے کے بعد مسجد حرا میں ہماری اجتماعی ملاقات ہوئی جس میں ہمیں تفصیل سے تمام حالات سے آگاہ کیا گیا۔ اسلامک سنٹر کی جاپان میں ۶/مساجد ہیں۔ چار پانچ مصلیٰ سنٹر ہیں۔ مصلیٰ سینٹر ایک عارضی بندوبست ہوتا ہے مثلاً رمضان المبارک کے لیے یا صرف جمعۃ المبارک کے لیے۔ ہر سال دس گیارہ حفاظ قرآن کو پاکستان اور بھارت سے بلایا جاتا ہے۔ اس سال پاکستان سے ۷/اور بھارت سے ۴/حفاظ آئے تھے۔ اسلامک سنٹر کے علاوہ تبلیغی جماعت، منہاج القرآن اور دعوتِ اسلامی والے بھی حفاظ کو بلاتے ہیں۔ جاپان میں اس وقت ۲۶۰/مساجد ہیں۔ ٹوکیو میں ترکی نے ایک بہت خوبصورت مسجد تعمیر کروائی ہے۔ اس مسجد میں ترکی کے امام نماز پڑھاتے ہیں۔ ٹوکیو میں ہی سعودی عرب کی تعمیر کردہ مسجد بھی ہے۔ ملاقات ختم ہوئی تو مسجد کے سامنے باغ میں چلے گئے۔

باغ تقریباً ۴۰/میٹر چوڑا اور ۸۰/میٹر لمبا ہوگا۔ وہیں ہماری ملاقات ڈاکٹر منصور علی سے ہوئی۔ وہ سعودی عرب کے اسلامک سینٹر کی دعوت پر جاپان آئے تھے۔ باغ میں رنگ برنگے لباسوں میں بچے کھیل رہے تھے۔ ان کے لیے ایک طرف جھولے وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ نشستیں لگی ہوئی تھیں۔ بچوں کی مائیں نشستوں پر بیٹھی آپس میں گپ شپ کررہی تھیں۔ جاپانی ایک خاموش طبع قوم ہے۔ بچے بھی خاموشی سے کھیل رہے تھے۔ بہت چھوٹے بچوں کے لیے فوم بچھایا گیا تھا اور وہاں کھلونے رکھے تھے۔ وہ وہاں کھیل رہے تھے۔ باغ کے چاروں طرف سائیکلیں چلانے کے لیے راستہ بنا ہوا تھا۔ بچے سر پر ٹوپ، جیکٹ اور خاص قسم کے جوتے پہن کر سائیکلیں چلا رہے تھے۔ سڑکوں پر بھی ہر سائیکل چلانے والا یہی اہتمام کرکے سائیکل چلاتا نظر آیا۔ ایک عورت چھوٹے بچوں کو جوڈو کرانے سکھا رہی تھی۔ (انھوں نے جوڈوکراٹے کا مخصوص لباس پہنا ہوا تھا)۔ ۵/بجے باغ میں ایک الارم سا بجا اور یہ پورے ملک میں بیک وقت ہر جگہ بجتا ہے۔ الارم بجتے ہی باغ خالی ہوگیا۔

وہ رات ہم نے حراسینٹر میں ہی گزاری۔ اگلے دن ۸/بجے صبح بھارت سے بھی ۴/حفاظ کرام تشریف لے آئے۔ ظہر کی نماز ادا کرکے ڈاکٹر منصور علی اور میں ملک امانت علی کی کار میں اگلی منزل کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر منصور علی کو کیتوکے اسٹیشن پر اتار کر ہم ہائی وے پر آگئے۔ یہ وہی ہائی وے ہے جو ہوائی اڈے سے آرہی ہے۔ ٹوکیو شہر آیا تو یہ بلند ہونا شروع ہوئی اور عام زمین سے ساٹھ ستر فٹ کی بلندی پر چلی گئی۔ سڑک کی دونوں جانب کئی کئی منزلہ عمارتیں نظر آرہی تھیں۔ ٹوکیو ٹاور اپنی بلندیوں سے ہمیں خوش آمدید کہتا نظر آرہا تھا۔

ٹوکیو سے جب باہر نکل آئے تو ہماری ہائی وے زمین پر واپس آگئی۔ چار پانچ گھنٹے سفر کرنے کے بعد اوتادارا پہنچے۔ یہاں ملک امانت علی کے بھانجے افتخار صاحب ہوتے ہیں۔ ملک امانت علی اس وقت اسلامک سینٹر آف جاپان کے امیر ہیں۔ ملک صاحب تو اپنے گھر چلے گئے، میں نے وہ رات افتخار صاحب کے گھر ہی گزاری۔ اگلے دن جمعہ تھا۔ ۱۱/بجے ملک صاحب تشریف لے آئے۔ اُن کے آتے ہی ہم ''اِقرا مسجد'' کی طرف روانہ ہوگئے۔ ۱۲/بج کر ۱۰/منٹ پر میں نے تقریر شروع کی اور ساڑھے بارہ بجے ختم کی۔

نمازِ جمعہ کے بعد کئی پاکستانی بھائیوں سے ملاقات ہوئی۔ حنیف گوندل صاحب کافی دیر میرے پاس بیٹھے اور مقامی حالات کے بارے میں بتاتے رہے۔ ظہر سمیت پچاس ساٹھ آدمیوں نے یہاں نماز ادا کی۔ کئی نمازی سو، دو سو، تین سو کلومیٹر سے یہاں نمازِ جمعہ کی ادائی کے لیے تشریف لائے تھے۔

نماز ادا کرکے ہم نے مسجد کا معائنہ کیا۔ اسی مسجد میں ہم نے رمضان المبارک (جو اگلے دن شروع ہو رہا تھا) میں نماز تراویح پڑھانی تھی۔ امام کے کمرے میں فریج، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ٹیلی فون غرض ہر سہولت موجود تھی۔ باورچی خانہ مسجد سے تیس چالیس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ حنیف گوندل صاحب کہنے لگے کہ مجھے یہاں بلدیہ کے دفتر میں کام ہے، چلیں آپ کو بلدیہ کا دفتر دکھا لائیں۔

بلدیہ آفس

ہم گاڑی میں بیٹھے اور چند منٹوں میں بلدیہ آفس پہنچ گئے جسے یہاں ''شیک شو'' کہتے ہیں۔ عوام کے ہر مسئلے کا حل یہاں موجود ہے۔ کئی منزلہ عمارت ہے۔ بجلی، پانی، گٹر کا مسئلہ ہو، کہیں آگ لگ گئی ہو، فائر بریگیڈ کو بلانا ہو، تھانے کا کوئی کام ہو، عدالتی مسئلہ ہو، زمینوں کے کاغذات کا معاملہ ہو، ہر سرکاری محکمہ کا کام یہاں ہوتا ہے۔ اندر داخل ہوئے تو سامنے لگی مشین سے اپنے متعلقہ شعبے میں اپنی باری کے نمبر کا ٹوکن لیا اور متعلقہ شعبے کی انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر میں باری آگئی۔ گوندل صاحب اُدھر افسر سے ملنے چلے گئے۔ وہ واپس آئے اور ہم ایک مشین کے پاس چلے گئے۔ مشین میں فارم ڈالا۔ سکرین پر فیس کی رقم آگئی۔ رقم گوندل صاحب نے مشین میں ڈال دی۔ فارم پر رقم وصولی کی عبارت چھپ گئی، فارم مشین سے باہر نکل آیا۔ گوندل صاحب نے متعلقہ افسر کو جا کر فارم دکھایا۔ اُس نے مہر اور دستخط کرکے کاغذات گوندل صاحب کو دے دیے۔

دفتر کا وقت ۹/سے ۵/بجے تک ہے۔ ۵/بجے سے ۲/منٹ پہلے بھی کوئی داخل ہوجائے اور مشین سے ٹوکن لے لے تو بلدیہ والے اُس کا کام کرنے کے پابند ہیں، چاہے ایک گھنٹہ لگ جائے۔ کبھی، کسی بھی صورت میں اس دفتر میں (یا جاپان کے کسی بھی دفتر میں) کوئی افسر یا سرکاری ملازم اپنے کام سے غیر حاضر (یا چھٹی) پر نہیں ہو سکتا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی موجود ہوگا۔ آپ یہ وہاں کبھی نہیں سنیں گے ''صاحب چھٹی پر ہے'' یا ''صاحب میٹنگ میں ہے'' یا ''آج آپ کا کام نہیں ہوسکتا، کل آئیں۔''

اِقرا مسجد میں رمضان المبارک

ہفتے کی شام چاند نظر آنے کی اُمید تھی۔ میں نے ایک نمازی سے پوچھا کہ چاند دیکھنے کا کیا طریقہ ہے؟ انھوں نے بتایا کہ یہاں کی حکومت نے ایک رویت ہلال کمیٹی بنا دی ہے جس میں تمام اسلامی تنظیموں کے نمائندے شامل ہیں۔ وہ یا تو خود چاند دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مطلع صاف نہ ہو تو حکومتِ ملائیشیا کے اعلان پر عمل کر لیتے ہیں۔ جاپان میں ۲/عیدیں نہیں ہوتیں۔ سب مسلمان رویت ہلال کمیٹی کے فیصلے کو مانتے ہیں۔ اگلے روز یعنی بروز ہفتہ نمازِ عشا کی ادائی کے بعد ۲۰/ تراویح پڑھی گئی۔ رات بہت چھوٹی تھی۔ ۲/گھنٹے بعد سحری کا وقت شروع ہوتا تھا اس لیے ہم سوئے نہیں۔ صبح نمازِ فجر ادا کرکے سوئے اور پھر ظہر کے قریب اٹھے۔ پورا رمضان ہمارے یہی اوقات رہے۔

اگلے دن ایک ڈراما ہوگیا۔ ہمارے ایک نمازی مسجد کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرکے مسجد کی طرف آرہے تھے۔ مسجد کی پارکنگ آدھا کلومیٹر دور ہے (گلی محلے میں گاڑی کھڑی کرنا جرم ہے)۔ پیدل چلتے چلتے حضرت کا فون آگیا۔ آپ نے اونچا اونچا بولنا شروع کردیا۔ مسجد کے سرکاری انچارج کو ایک محلے دار نے جا کر شکایت لگا دی کہ اس طرح ایک نمازی اونچا اونچا بولتا ہوا میرے گھر کے پاس سے گزر رہا تھا جس نے مجھے پریشان کیا ہے۔ سرکاری انچارج مسجد میں آگیا۔ اس نے کہا کہ جس آدمی نے یہ ''جرمِ عظیم'' کیا ہے، وہ اُس شخص سے جا کر معافی مانگے ورنہ پھر وہ شخص پولیس سے رجوع کرے گا۔ معافی مانگ کر جان چھڑائی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے ''مسجد کا سرکاری انچارج'' کون ہوتا ہے؟ مسلمانوں نے ہر ملک میں ہی اپنا اور اپنے دین کا نام خوب روشن کیا ہے۔ مسجدوں میں مسلمانوں کے آپس کے جھگڑوں اور مارکٹائی کی وجہ سے مسجدوں کو یہاں سرکاری تالے بھی لگتے رہے ہیں۔ ایک جاپانی سے دوستی

ہوگئی تھی۔ اس کا گھر مسجد کے قریب ہی تھا۔ اچھی طبیعت کا مالک اور ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہے۔ پچھلے سال اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ رمضان میں اکثر مسجد میں آجاتا تھا اور جو لوگ جاپانی زبان جانتے ہیں، ان سے گپ شپ کرتا رہتا تھا۔

غالباً اس دن ہمارا سولہواں روز تھا۔ پورے جاپان میں جشن کا سماں تھا۔ پورے ملک میں پھلجھڑیوں اور آتش بازی کا زور شور تھا۔ معلوم ہوا کہ اس مقدس دن تمام مُردوں کی روحیں اپنے گھروں میں واپس آتی ہیں۔ یہاں قریب ہی قبرستان ہے۔ جاپانی دوست مجھے وہاں لے گیا۔ ہر قبر دو ڈھائی مربع فٹ کی ہوتی ہے۔ جاپانی اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں۔ ہر بلدیہ آفس کے ماتحت مُردوں کو جلانے کی جگہ بنی ہوتی ہے۔ جلا کر مُردے کی راکھ جو ایک لفافے میں آجاتی ہے، یہاں لا کر دفنا دی جاتی ہے۔ ایک قبر میں کئی کئی مُردوں کی راکھ دفنائی جاتی ہے۔ مقدس دن پر قبروں پر مُردے کی پسندیدہ چیز مثلاً چاول، مالٹے، سیب، وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ قبرستان اس دن کھانے پینے کی چیزوں سے بھرا ہوتا ہے۔

رمضان میں مسلمانوں کی اکثریت کاروبار کم کر دیتی اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت عبادات میں صرف کرتی ہے۔ افطاری اور رات کا کھانا مسجد میں اجتماعی طور پر کھایا جاتا ہے۔ مسجد کے باورچی خانے میں تمام نمازیوں کے لیے کھانا پکایا جاتا ہے۔ تراویح پڑھنے والے ۴۰ر سے ۶۰ر کے درمیان ہوتے تھے۔ پانچ چھ جاپانی خواتین بھی روزانہ آتی تھیں۔ یہ سب پاکستانیوں کی بیویاں تھیں۔ پاکستانیوں کے علاوہ ایک دو افغانی، دو بنگالی اور دو افریقی بھی باقاعدگی سے نمازِ تراویح کے لیے آتے۔ کئی نمازی دو دو تین تین دن ادھر ہی رہتے۔

ایک دن ایک صاحب کہنے لگے کہ میں آپ کے لیے ایک تحفہ لایا ہوں لیکن میری بیوی (جو کہ جاپانی ہے اور ساتھ آئی ہوئی ہے) کو معلوم نہ ہو۔ وہ جاتے ہوئے کہنے لگے، یہ ہمارے گھر میں لگے ہوئے ناشپاتی کے درخت کا پھل ہے۔ میری بیوی ہو یا کوئی جاپانی، عام درخت کا پھل نہیں کھاتا، انہیں خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ جراثیم سے بھرا ہوا ہوگا۔ یہ لوگ ہمیشہ باغوں میں لگے ڈاکٹروں کی انتہائی نگہداشت میں پکے پھل کھاتے ہیں۔ میری بیوی مجھے بھی کھانے نہیں دیتی، میں چوری چوری کبھی کبھار کھا لیتا ہوں۔

یہاں گلی محلے میں دکانیں نہیں ہوتیں۔ پورے جاپان میں ہمارے ہاں کے بڑے سٹوروں جیسے سٹوروں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ہماری مسجد سے ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک بہت بڑا سٹور ہے۔ ہم وہاں سے اپنی ضرورت کی تمام اشیا لے آتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک پاکستانی نے حلال فوڈز کا کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ ان کی گاڑی بھی ہر ہفتے کی شام یہاں مسجد کے باہر آجاتی۔ اُن سے ہم گوشت اور پاکستانی مسالے وغیرہ لے لیتے۔ نمازی حضرات بھی اُن سے اپنی ضرورت کی چیزیں لے لیتے۔

اس مرتبہ رمضان ۲۹ر دن کا تھا۔ رویت ہلال کمیٹی نے عید کے چاند کا اعلان کیا۔ اُس کے مطابق ہم نے یہاں عید کی نماز پڑھی۔ تمام نمازیوں سے فرداً فرداً ملاقات کی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ جو ذمے داری اپنے سر لی تھی، وہ اس ذاتِ باری کی مہربانی سے بہت خوش اسلوبی سے ادا ہوگئی۔

رمضان کے بعد بھی اکتوبر کے آخری عشرے تک یہاں امامت کرانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ اسلامک سرکل آف جاپان کے دوسرے مراکز پر بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ واپسی سے قبل ڈزنی لینڈ کا بھی چکر لگایا، گاڑیوں کا جہاں نیلام (Auction) ہوتا ہے، وہاں بھی ہم گئے۔ ۲۰ر اکتوبر کی شام وطنِ عزیز کی سرزمین پر قدم رکھا اور بخیر و عافیت واپس پہنچ جانے پر خدائے واحد کی حمد و ثنا کرنے لگے۔

کھیل کھلاڑی

کھیلوں کی دنیا

دنیائے کھیل سے دلچسپ معلومات اور نئی خبروں کا دل لبھانے والا کالم

رانا محمد شاہد

بغیر چھکے کے..... ۲۱۰۵ رنز

برطانیہ کے جوناتھن ٹراٹ ٹیسٹ کرکٹ میں چھکے کے بغیر سب سے زیادہ یعنی ۲۱۰۵ رنز بنانے والے پہلے برطانوی بلے باز بن گئے۔ ان سے پہلے یہ ریکارڈ کیون پیٹرسن کے پاس تھا جنھوں نے ۳۴ ٹیسٹ میچوں میں ۲۰۶۱ رنز بغیر چھکے کے بنائے تھے۔

وکٹوں کی تیز ترین سنچری کا قومی ریکارڈ

سعید اجمل نے ٹیسٹ وکٹوں کی تیز ترین سنچری کا پاکستانی ریکارڈ بنا دیا ہے۔ اس سنگِ میل تک پہنچنے میں انھیں صرف ۱۹ میچ کھیلنا پڑے۔ اس سے قبل وقار یونس اور محمد آصف نے ۲۰، ۲۰ ٹیسٹ میچوں میں وکٹوں کی سنچریاں مکمل کیں۔ ٹیسٹ وکٹوں کی تیز ترین سنچری کا عالمی ریکارڈ انگلینڈ کے لوہمین کے پاس ہے۔ انھوں نے یہ کارنامہ ۱۶ میچوں میں انجام دیا۔ انگلینڈ کے خلاف اس ٹیم میں پاکستانی سپنروں نے ۱۹ وکٹیں لیں۔ ایک مرتبہ ۱۹۷۸ء میں انگلینڈ ہی کے خلاف عبدالقادر، توصیف احمد، اور اقبال قاسم جبکہ دوسری مرتبہ ۱۹۸۰ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف عبدالقادر، اقبال قاسم اور محمد نذیر جونیئر نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔

۱۵۶ کلومیٹر کا سفر ننگے پاؤں

ایک بھارتی نوجوان نے ۱۵۶ کلومیٹر کا فاصلہ ننگے پاؤں طے کر کے عالمی ریکارڈ قائم کر دیا۔ بھارتی ریاست آسام میں ۲۲ سالہ اجیت نامی نوجوان نے ۱۵۶.۲ کلومیٹر کا سفر ننگے پاؤں طے کر کے اپنا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج کروا لیا۔ اجیت پولیس میں ملازم ہے۔ اس نے بغیر آرام کیے یہ سفر طے کیا جبکہ گینز انتظامیہ کی جانب سے اسے آرام اور پاؤں میں مالش کی اجازت بھی دی گئی تھی۔ اپنی کامیابی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اجیت کا کہنا ہے کہ وہ اس سے قبل بھی کئی ملکی اور مقامی مقابلے جیت چکا ہے۔

بھارت میں فٹ بالروں کی لاکھوں ڈالر بولی

بھارت میں کرکٹ کے ٹورنامنٹ آئی پی ایل کی کامیابی کے بعد اسی طرز پر شروع ہونے والی فٹ بال پریمیئر لیگ کے کھلاڑیوں کی نیلامی شروع ہوگئی۔ بھارت کے مشرقی شہر کولکتہ میں پریمیئر لیگ سوکر کے نئے کھلاڑیوں کی نیلامی ہوئی۔ اس میں ۵/ٹیموں کے مالکان نے غیر ملکی کھلاڑیوں اور کوچوں پر ۷/لاکھ ڈالر کی بولی لگائی۔ ارجنٹائن کے سابق سٹرائیکر ہرنن کریسپو کی سب سے زیادہ بولی لگی۔ انھیں ۸/لاکھ ۲۰ ہزار ڈالر میں خریدا گیا۔

بنگلہ دیشی ایمپائر نے کرکٹر کی جان لے لی

بنگلہ دیش میں ایمپائر نے کرکٹ کے ۱۵/سالہ کھلاڑی کے سر پر بلا مار کر اس کی جان لے لی۔ بنگلہ دیش کے ضلع کشور گنج میں ہونے والے ایک میچ کے دوران فیصلے پر احتجاج کرنے والے نذر الاسلام کو ایمپائر نے غصے میں آ کر بلے باز سے چھینا گیا بلا سر پر دے مارا۔ میچ کے دوران تو کھلاڑی نے کسی قسم کی تکلیف ظاہر نہیں کی لیکن

جیفری بائیکاٹ شرط لگا کر مکر گئے

سابق برطانوی کپتان اور معروف کمنٹیٹر جیفری بائیکاٹ ابوظہبی ٹیسٹ میں انگلش ٹیم کی شکست پر اپنے ۳/گھر فروخت کرنے کی شرط لگا کر مکر گئے۔ کمنٹری کے دوران بائیکاٹ نے برطانوی ٹیم کی کامیابی کا دعویٰ کیا اور کہا کہ اگر ٹیم ہار گئی تو وہ اپنے تینوں گھر فروخت کر دیں گے لیکن جب صورت حال تبدیل ہوئی تو انھوں نے کہا کہ وہ مذاق کر رہے تھے۔ دوسری طرف انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں نے ۲۵/برس کرکٹ کھیلی اور ۳۳/سال کمنٹری کی۔ مگر اس عرصے میں انگلینڈ کو اتنے بُرے طریقے سے ہارتے کبھی نہیں دیکھا۔

اُسی رات نذرالسّلام کو سر میں درد کی وجہ سے ہسپتال لایا گیا جہاں وہ وفات پا گیا۔ پولیس نے ایمپائر کے خلاف مقدمہ درج کرلیا۔

تھائی لینڈ عالمی بیڈریس

تھائی لینڈ میں ہونے والی سالانہ بیڈریس میں دنیا بھر سے آنے والے سیاح خوب لطف اندوز ہوئے۔ تھائی لینڈ کے ساحلی شہر پٹایا میں ہونے والی اس دلچسپ ریس میں مقامی لوگوں کے ساتھ ساتھ دنیا بھر سے آنے والے سیاح بھی حصہ لیتے ہیں۔ ریس کے شرکاء بستر نما ٹرالیوں کو بڑی خوبصورتی سے سجاتے ہیں۔ گزشتہ ۲۴ سال سے ہونے والی اس منفرد ریس میں ۶/ افراد پر مشتمل کئی ٹولیاں حصہ لیتی ہیں۔ اس سال بارش کے باوجود دوڑ کو جاری رکھا گیا۔ شرکاء نے اپنے بیڈ کو مختلف شکلیں دے رکھی تھیں جنھیں دیکھ کر شائقین خوب محظوظ ہوئے۔ جیتنے والی ٹیم کو انعام میں ایک ٹرافی دی جاتی ہے۔

ٹنڈولکر نے کی سنچری بھارت میچ ہارا

دنیائے کرکٹ میں اَن گنت ریکارڈوں کے مالک بھارتی بلے باز سچن ٹنڈولکر کے حوالے سے ایک متفی رائے یہ بھی ہے کہ ٹنڈولکر ریکارڈ کے انبار لگانے میں اس لیے کامیاب ہوئے کہ انھوں نے ہمیشہ اپنی انفرادی کارکردگی کو اہمیت دی۔ ٹیم کی فتح میں ان کا کوئی کردار نہیں ہوتا اور وہ میچ وِنر بلے باز نہیں۔ یہ درست ہے یا محض اتفاق کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب ٹنڈولکر نے سنچری کی، بھارت میچ ہار گیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ۲۰۱۱ء میں بھی ٹنڈولکر نے ۲/ سنچریاں لیں تو بھارت کیا میچ جیتا؟ جی نہیں، ایک میچ میں بھارت کو شکست ہوئی اور ایک میچ غیر یقینی طور پر ٹائی ہوگیا۔ ورلڈکپ ۲۰۱۱ء میں ٹنڈولکر نے انگلینڈ کے خلاف ۱۲۰/رنز کی اَنگز تراشی، جواب میں اینڈریو سٹراس نے ۱۲۵/ رنز کی جوابی اَنگز کھیل کر انگلینڈ کی پوزیشن مستحکم کردی۔ بہرکیف، آخری اوور میں انگلینڈ نے ۳۳۸/ رنز بنا کر مقابلہ برابر کردیا۔ یہ بلاشبہ سال کے سنسنی خیز مقابلوں میں سے ایک تھا۔ ٹنڈولکر نے ۲۰۰۱ء میں دوسری چیمپئن ورلڈکپ ہی میں جنوبی افریقا کے خلاف بنائی۔ اس میچ میں ٹنڈولکر نے ۱۱۱/ رنز بنائے۔ بھارت نے ۲۹۷/ کا ہدف دیا لیکن جنوبی افریقا نے سنسنی خیز مقابلے کے بعد یہ میچ ۳/ وکٹ سے جیت لیا۔ حقیقت چاہے کچھ بھی ہو، ۲۰۱۱ء کا سال ثابت کرگیا کہ ٹنڈولکر نے جب سنچری کی، بھارت میچ نہیں جیت سکا۔

اولمپکس اچھوتے ڈاک ٹکٹ کا اجراء

لندن میں جولائی/ اگست میں ہونے والے اولمپکس کی تیاریوں کو آخری شکل دی جارہی ہے۔ اسی سلسلے میں گزشتہ دنوں پیرا اولمپکس کے منفرد اور اچھوتے ڈاک ٹکٹ بھی فروخت کے لیے پیش کردیے گئے۔ برطانیہ کی ملکہ کی تصویر کے ساتھ ساتھ اب عام شائقین اولمپکس کو کو بھی مستقبل کے حوالے سے اپنی یادوں میں سموسکیں گے۔ یوں برطانیہ میں رہنے والے شائقین یہ ڈاک ٹکٹ عام دکانوں اور ڈاک خانوں سے خرید سکیں گے جبکہ برطانیہ میں ڈاک کا محکمہ ''رائل میل'' بھی اس کے علاوہ خصوصی طلائی تمغے اور تمثیلیں جاری کرنے کے سلسلے میں تیزی سے تیاریاں کررہا ہے۔

شدید سردی میں تیراکی کا سالانہ مقابلہ

جرمنی کے دریائے ڈینوگ میں شدید سردی کے باوجود تیراکی کے سالانہ مقابلے منعقد ہوئے۔ ان میں سیکڑوں افراد نے حصہ لیا۔ دریا کے کنارے اس سخت سرد موسم میں ہر سال سیکڑوں افراد اکٹھے ہوتے اور گروہ کی شکل میں دریا میں چھلانگ لگاتے ہیں۔ وہ کچھ دیر دریا میں تیرنے کے بعد کنارے پر نکل آتے اور گرم مشروبات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ۴۵/منٹ کی تیراکی میں ۱۵/سال سے زائد عمر کے افراد حصہ لے سکتے ہیں۔

مہر محمد خلیل کے دِن پھر گئے

مارچ ۲۰۰۹ء میں سری لنکا ٹیم کو حملے کے دوران موت کے منہ سے نکالنے والے بس ڈرائیور مہر محمد خلیل کے دن پھر گئے ہیں۔ کل کا بس ڈرائیور آج کا کاروباری بن چکا ہے۔ وہ پاکستان سے فرنیچر منگوا کر مراکش میں فروخت کررہے ہیں جبکہ جلد ہی وہ نئی شاخ مراکش کے دارالحکومت رباط میں کھولنے والے ہیں۔ اس سے قبل کا سابلا نکا میں ان کا کاروبار بخوبی کامیابی سے چل رہا ہے۔ مہر محمد خلیل کاروباری بننے کے باوجود ایک مرتبہ پھر سری لنکا ٹیم کی بس چلانے کے خواہاں ہیں۔

اونچا ترین شاٹ

ٹیسٹ کرکٹ کے ابتدائی دنوں کی بات ہے، آسٹریلیا کی ٹیم کا ایک کھلاڑی جارج جان بالز تھا۔ اس بلے باز کا قد ۶/فٹ ۶/انچ اور وزن تقریباً ۱۰۲/کلوگرام تھا۔ اسے عام طور پر آسٹریلوی ہرکولیس کہا جاتا تھا۔ جارج بالز زوردار ہٹیں لگانے کا ماہر تھا۔ اس نے آسٹریلوی ٹیم کے ساتھ انگلینڈ کے ۵/ دورے کیے اور کل ۱۷/ٹیسٹ میچ کھیلے۔ ۱۸۸۰ء میں جب انگلینڈ کی سرزمین پر پہلا ٹیسٹ اوول کے میدان میں کھیلا گیا تو جارج نے ایک اونچی ہٹ لگائی اور ایسی اونچی کہ گیند کے نیچے آنے تک وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ ۲/رن مکمل کرکے تیسرے رن کے لیے مڑا ہی تھا کہ میچ آؤٹ ہوگیا۔ بالز اپنی ٹیم کے لیے پہلی اَنگز میں صرف ۴/ رن ہی بنا سکا تھا۔ یہ ٹیسٹ کرکٹ کی منفرد شاٹ تھی کہ جس کے نیچے آتے آتے ۲/رنز بن چکے تھے۔

کرکٹ کی جگہ فٹ بال

برطانیہ میں ساتواں کرکٹ ورلڈکپ جاری تھا۔ ایک کے بعد ایک فتوحات سمیٹتی ہوئی پاکستانی ٹیم کے کھلاڑی ڈریسنگ روم میں خوش گپیوں میں مشغول اور اپنی پُرلطف باتوں سے محفل کو کشتِ زعفران بنائے ہوئے تھے۔ ایسے میں لیگ اسپنر مشتاق احمد فٹ بال کے ساتھ مختلف کرتبوں کا مظاہرہ کرنے میں بھی مصروف نظر آتے تھے۔ وہ فٹ بال کو کبھی دائیں پاؤں کی انگلیوں کی مدد سے اوپر اچھالتے اور کبھی بال لے کر تھوڑا آگے بڑھاتے، کبھی ڈربل کرتے اور یونہی کھیلتے کھیلتے ان کے ذہن میں نہ جانے کیا بات آئی کہ انھوں نے ساتھی کھلاڑیوں کو متاثر کرنے کے لیے (کہ میں کرکٹ کے علاوہ فٹ بال بھی بہت اچھی طرح کھیل سکتا ہوں) فٹ بال کو کک لگادی۔ بال ہوا میں بلند ہوا اور زوردار دھماکے کے ساتھ شیشے سے جا ٹکرایا، چھن کی آواز آئی اور شیشہ اور ٹیوب لائٹ کرچی کرچی ہوگیا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ مشتاق احمد کو اپنی شوخیوں کا خمیازہ ساتھی کھلاڑیوں کے قہقہوں کی صورت میں بھگتنا پڑا۔

ایک یادگار مہم جوئی

امریکا کی ایک مہم جو ٹیم نے چین کا خطرناک ترین دریا شوانگو عبور کرلیا۔ پانی کا بہاؤ ۱۲۰۰/ کیوسک فٹ فی سیکنڈ تھا۔ سفر کے آغاز میں وہ ایک آبشار سے گزرے۔ پھر اچانک دریا کا حجم دگنا ہوگیا اور کشتیاں گہری کھائی میں چلی گئیں۔ وہاں اندھیرے میں ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے چیزیں مسلسل پانی میں گر رہی ہوں۔ ایک جگہ ایرک اور ہنری پانی میں اترے تو وہ اس طرح گھومنے لگے جیسے واشنگ مشین میں کپڑے دھوئے جارہے ہوں۔ ہنری کا ہیلمٹ گر گیا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں جبکہ ایرک آبشار کے نیچے پھنس گیا اور مسلسل آبشار سے لڑتا رہا حتیٰ کہ اس کے ساتھیوں نے اسے بچالیا۔ وہ مہم ادھوری چھوڑ کر واپس لوٹ گئے مگر ان کا کہنا ہے کہ وہ خوش قسمت ہیں کہ سبھی ساتھی زندہ بچ گئے۔

ماں! میں نے تمھارے ساتھ جانا ہے....

۲۳ مارچ کے موقع پر ایک دُکھی کرنے والی یاد

اعجاز شیخ

قیامِ پاکستان کے لیے برصغیر کے مسلمانوں نے تقریباً ۱۰ر لاکھ جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ ہندوستان کی تقسیم کے جرم میں کانگریس کی سرپرستی میں سکھوں اور ہندو غنڈوں نے مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ڈھایا یہ ایسا غم ناک داستان ہے جسے بیان کرتے ہوئے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایک ملک سے اتنی بڑی ہجرت پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ تاہم ہمارے ادیبوں نے یہ المناک باب بیان کرنے میں قدرے بخل سے کام لیا ہے۔ اسی لیے آج نئی نسل قیامِ پاکستان کے مقصد سے کماحقہ واقف نہیں۔ انھیں تو یہ خطہ پاکستان سونے کی طشتری میں رکھا مل گیا، وہ نہیں جانتے کہ یہ سرزمین حاصل کرنے کے لیے کتنی بیٹیوں، ماؤں اور معصوم بچوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ پاکستان ہجرت کرنے والوں میں میری ایک عزیزہ بھی شامل ہیں۔ ان کی کہانی بھی ایک ایسا دردناک باب ہے جو شاید ان کی موت کے بعد ہی ختم ہو۔ گو وہ اب ۴ر بچوں کی ماں ہیں۔ ان کے میاں ایک پنکھا ساز کمپنی کے مالک اور صاحبِ حیثیت ہیں۔ مگر وہ جس کرب میں مبتلا ہیں، وہ ایک ماں ہی جان سکتی ہے۔ ان کی ایک پیاری، معصوم اور پھول سی بیٹی دریائے بیاس کے کنارے رہ گئی تھی۔

یعنی جب ان کا قافلہ دریائے بیاس کے قریب پہنچا، تو سکھ درندوں نے حملہ کر دیا اور بے یار و مددگار قافلے کو تہ تیغ کرنے لگا۔ میری عزیزہ اپنی ۶ر اور ۴ر سالہ بچیوں کے ساتھ درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپ گئیں۔ بدقسمتی سے جاتے ہوئے ۴ر سکھوں نے ماں بیٹیوں کو چھپتے دیکھ لیا۔ تبھی ایک سکھ نے کہا ”تو معراج دین دی کڑی تے نئیں؟“ (تم معراج دین کی بیٹی تو نہیں؟)

میری عزیزہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگیں ”ہاں میں اس بدنصیب باپ کی بیٹی ہوں۔ تم نے میرے ماں باپ کو شہید کر دیا، لو مجھے بھی مار ڈالو۔“

تمر سکھ کہنے لگا ”تیرے باپ نے ایک مرتبہ مجھ پر احسان کیا تھا اور پھر ہی میں میرے حق میں گواہی دی تھی۔ اس کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ میں تجھے دریا پار کرا دوں گا۔“

میری عزیزہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس سکھ کے ساتھ چل پڑیں۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ایک اور جتھے نے حملہ کر دیا۔ شام ہونے میں ابھی تھوڑا سا وقت تھا۔ دریائے بیاس کا پانی ہر چیز بہائے لے جا رہا تھا۔ بارش اور بجلی کوندنے سے منظر اور بھی خوفناک ہو گیا تھا۔ وہ سکھ کہنے لگا ”میں دونوں بچیوں سمیت تمھیں دریا پار نہیں کروا سکتا۔ صرف ایک بچی ساتھ لے لو، دوسری یہیں چھوڑ جاؤ۔“

اسی اثنا میں شور بلند ہوا۔ جس میں مظلوموں کی چیخ و پکار اور آہیں شامل تھیں۔ سکھ جتھے بچے کچے بے آسرا لوگوں کو مار رہے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری عزیزہ نے اپنی چھوٹی بچی کو تھوڑے سے چنے دے کر کیکر کے نیچے بٹھایا اور بڑی کو لے کر چل پڑی۔ تبھی چھوٹی بچی نے چلا کر کہا ”ماں! میں نے تمھارے ساتھ جانا ہے۔“ سکھ نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا جس سے وہ زمین پر گر گئی۔ سالوں عشروں بعد بھی میری عزیزہ ہنستے ہنستے رو پڑتی اور روتے روتے ہنس پڑتی ہیں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگیں ”بھائی! مجھے موت کیوں نہیں آجاتی؟ کاش وہ سکھ مجھے وہیں قتل کر دیتا۔ مجھے ایسی سزا تو نہ ملتی۔ مجھے بیٹی روبینہ بہت یاد آتی ہے۔ وہ نہ جانے کس حال میں ہوگی۔ اس کی آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے ”ماں! میں نے تمھارے ساتھ جانا ہے.....“

سروے

یہ نادانی ہے یا اندر کی کمزوری کا اظہار

دوسروں کے تہوار منانے میں اِتنی بے تابی کیوں؟

فریدہ خانم

بھٹکتے ہوئے لوگ پھر لوٹ آئیں
محبت کے اُن کو اگر چند پل دیں
کہ مغرب سے مرعوب لوگوں کو خانمؔ!
حدیثِ محمدؐ کا کوئی عمل دیں

ہمارے دین کی پہچان محبت، بھائی چارہ اور سادگی ہے۔ اسی لیے اس کی رسوم و رواج اور تہواروں میں پاکیزگی ہے اور وہ بناوٹ اور تصنع سے عاری ہیں۔ ہمارا دین زندگی میں آسانی پیدا کرتا اور راستہ دکھاتا اور اپنے ماننے والوں کو دوسروں سے مختلف، منفرد اور اچھا بناتا ہے۔ اِس کے عقائد، اِس کی عبادات، رسم و رواج سبھی دوسروں سے مختلف ہیں اور اُنھیں بطورِ خاص دوسروں سے مختلف رکھا گیا ہے اور اِس کی تلقین بھی کی گئی ہے۔

حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

"جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی، وہ کل قیامت کے دن ان ہی میں شمار ہوگا۔" (ابوداؤد)

ہمارے تہوار مثلاً نکاح، ولیمہ، عیدین، شب برأت، رمضان المبارک اور عید میلاد النبی ﷺ بڑے نفیس، خوبصورت اور قابلِ احترام ہیں جن میں کہیں بھی نمائش یا خود نمائی نہیں۔ لیکن کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بعض ہم وطن اپنے تہوار چھوڑ کر ماڈرن کہلانے کے چکر میں دوسروں کے مذہبی و ثقافتی تہوار مناتے اور رسوم بڑے فخر سے اپنانے کی نادانی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ کیا مہندی، شادی پر دھوم دھڑکا، ویلنٹائن ڈے، اپریل فول، اور بسنت وغیرہ ہمارے تہوار ہیں؟ آیئے دیکھتے ہیں کہ مختلف مکاتبِ فکر کے لوگ ان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔

حاجی میاں ایرج کارکن تحریک پاکستان (گولڈ میڈلسٹ)

ہمارا مذہب اسلام اتنا عظیم ہے کہ وہ تمام آسمانی مذاہب کی عزت کرنے کا درس دیتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا مذہب بھی آسمانی ہے لیکن اسلام آنے کے بعد پچھلے تمام مذاہب اور ان کی کتب جن میں انہوں نے خود ہی تبدیلی کر لی تھی، متروک ہوگئے۔ اسلام ہی سچا اور آخری مذہب ہے چنانچہ ہمیں دین کے بتائے گئے تہواروں اور ہدایات پر عمل کرنا چاہیے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہی ہماری پہچان ہیں۔

کرنل محمد سلیم ملک کارکن تحریک پاکستان (گولڈ میڈلسٹ)

میں غیر اسلامی تہواروں مثلاً ویلنٹائن ڈے، بسنت وغیرہ کے سخت خلاف ہوں۔ آخر بسنت منانے سے ہمیں کیا حاصل ہوتا ہے؟ کروڑوں روپے کا سرمایہ ضائع ہو جاتا ہے، جو پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کے لیے خرچ ہونا چاہیے۔ اسی طرح ویلنٹائن ڈے منانے میں کیا فائدہ ہے؟ ہماری نئی نسل بے راہ روی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ہمیں بچوں کو اپنے مذہب کے بارے میں صحیح طرح آگاہ کرنا چاہیے، تاکہ وہ راہ سے نہ بھٹک سکیں۔

شاہد کشمیری پرنسپل گورنمنٹ شالیمار کالج، باغبانپورہ، لاہور

پچھلے چند عشروں سے دیگر مذاہب و اقوام کے طور طریقے اور رسم و رواج شدّ و مدّ سے اپنائے جا رہے ہیں۔ صورت حال یقیناً تشویش ناک ہے کہ ہماری قوم کے چند بھٹکے ہوئے آہو جو سوئے حرم جانا بھول چکے، ان تہواروں میں بھرپور شرکت کرتے ہیں۔ ہندوؤں کی تہذیب اور مغرب کی ثقافتی یلغار اپنی مصنوعی کشش سے ہمارا دامن دل و نگاہ کھینچ رہی ہے۔ کافروں اور مشرکوں کے تہوار منانے میں بے تابی اور اپنوں سے دوری ہمارے جذبۂ ایمان کی کمزوری، ملی روایات سے دوری اور تہذیبی شعور میں کمی کی علامت ہے۔ اگر ہم نے بروقت ہوش کے ناخن نہ لیے تو ہماری تہذیبی بربادی یقینی ہے۔

روبینہ شاہین رکن قومی اسمبلی (پی۔پی۔۱۱)/ سربراہ امیر بیگم ٹرسٹ، لاہور

امیر بیگم ٹرسٹ کے تحت ہم نے اجتماعی شادیوں کی بنیاد رکھی اور اب تک ۵۰۰ بچیوں کی شادیاں کروا چکے۔ یہ شادیاں سادگی اور مذہبی روایات کے مطابق کروائی گئیں۔ ہمارا مذہب اسلام ہمیں بھائی چارے کا سبق دیتا ہے۔ چنانچہ ہمارا مقصد معاشرے کے بے وسیلہ لوگوں کی مدد کرنا ہے۔ صدرِ پاکستان، وزیرِ اعظم، وزیرِ اعلیٰ، گورنر اور دیگر اہم شخصیات یتیم و غریب بچوں کو اپنے دستِ شفقت سے رخصت کرتی ہیں۔ اس طرح امیر و غریب اکٹھے بیٹھ کر بھائی چارہ کی فضا قائم کرتے ہیں اور یہی ہمارے مذہب کا درس ہے۔ اس لیے ہمیں ویلنٹائن جیسے دوسروں کے تہواروں کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اپنے تہواروں اور سوچ پر فخر کرنا چاہیے۔

عفت علوی شاعرہ/ براڈ کاسٹر ریڈیو پاکستان

ہم لوگ دوسروں کے تہوار اور عالمی دن بہت شوق سے مناتے ہیں، یہ سوچے بنا کہ یہ صحیح ہیں یا نہیں، مثلاً "ویلنٹائن ڈے" زور شور سے منا کر بدکاری کی تقلید کرتے ہیں جو ہمارے مذہب میں جائز نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ غیروں کا تہوار منانے سے پہلے اس کی تاریخ ضرور پڑھ لیں، تاکہ گناہ گار ہونے سے بچ جائیں۔

سمندر منصوری شاعر/ نثر نگار/ ٹرانسپورٹر

تہوار منانا بُری بات نہیں، مگر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کوئی خاص تہوار منا کے ہم اپنا مذاق تو نہیں اُڑا رہے، جیسا کہ اپریل فول۔ اس روز انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کو قتل کر کے اُن کے سر طشت میں سجا کے باپ کے سامنے پیش کیے اور کہا "اپریل فول"۔ لہٰذا یہ تہوار منانا اپنا ہی مذاق اُڑانے کے مترادف ہے۔

زاہد ہُما شاہ شاعر/ ادیب/ انفارمیشن آفیسر حکومت پنجاب

دُنیا میں یہ روایت رہی ہے کہ معاشروں میں حاکم اقوام کی تہذیب و ثقافت رفتہ رفتہ رائج ہوگئی۔ تاریخِ عالم گواہ ہے کہ جب بھی کسی زبردست قوم نے دوسری کو بزورِ شمشیر مغلوب کیا، تو وہاں اپنی تہذیب اور تمدن کو رائج کیا۔ یہ سلسلہ ازمنہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ آج کے زمانے میں گلوبلائزیشن کے زیرِ اثر دنیا چھوٹا سا گاؤں بن گئی ہے۔ لہٰذا اب ٹیکنالوجی ہماری عملی تہذیب و ثقافت قرار پائی۔ اس کے زیرِ اثر آج دنیا کی اکثر اقوام تہذیب و ثقافت اور تمدن کے باغ میں ایک دوسرے سے بہت زیادہ اخذ و استفادہ بھی کرتی ہیں۔ نتیجے میں ایک قوم یا علاقے کی مذہبی، ثقافتی و تمدنی روایات دوسری اقوام یا ممالک میں بھی رواج پا رہی ہیں۔ ان میں سے ایک ویلنٹائن ڈے بھی ہے۔

تسنیم طاہر پرنسپل ادارہ بحالی معذوراں، لاہور

ہمارا مذہب بہت سادہ اور رحمتوں والا ہے۔ لیکن ہم نے دوسروں کے تہوار منا اور نقالی کر کے خود کو مصیبتوں میں پھنسا لیا۔ جیسے شادیوں پہ مہندی اور تیل کی رسم پر بے جا اصراف اور کھانے کا زیاں جس پر لاکھوں روپیہ ضائع ہو جاتا ہے۔ اگر ہم اپنے مذہب سے مثال لینا چاہیں تو پیارے رسولؐ کی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ کی شادی سامنے ہے۔ کائنات کی سب سے عظیم ہستی ﷺ کے جگر کا ٹکڑا اور ایسی سادگی سے بیاہ، سبحان اللہ۔ آپؐ نے شادی طے کرتے ہوئے حضرت علیؓ سے فرمایا، اپنی زرہ بکتر بیچو، کیونکہ اُن کے پاس کچھ نہ تھا۔ اُس سے حضرت فاطمہؓ کا ایک جوڑا، جائے نماز، آٹا پیسنے کی چکی اور کھانا پکانے کے لیے تھوڑے سے برتن خریدے گئے۔ نکاح میں کھجور اور دُودھ سے تواضع ہوئی۔

بر جیس اویس معلّمہ لاہور گرائمر سکول، لاہور

آج کے مسلمانوں کا ایمان کمزور ہو چکا ہے، اسی لیے وہ دوسرے مذاہب کے تہوار منانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مثلاً ویلنٹائن ڈے اور بسنت جیسے غیر اخلاقی اور بے

بھارت کی سب سے بڑی ریاست میں

مسلمان بادشاہ گر بن گئے

مسلمانوں کی مخالف انتہا پسند ہندو جماعتیں بھی اُن سے ہاتھ ملانے پر مجبور ہوگئیں

رضوان علی

۸/ اکتوبر

اکتوبر ۲۰۱۱ء کو لکھنؤ میں بی۔جے۔پی (بھارتیہ جنتا پارٹی) کا ایک انوکھا جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسے میں ۹۹ فیصد حاضرین مسلمان تھے۔ یہ انوکھی بات تھی کیونکہ بابری مسجد شہید کر کے اس کی جگہ رام مندر تعمیر کرنے والی بھارتی سیاسی جماعت کسی طرح مسلمانوں کے لیے مفید ثابت ہوسکتی ہے؟ لیکن اقتدار کی لیلا کے بھی رنگ ڈھنگ نرالے ہیں۔ اُسے پانے کی خاطر بعض سیاست دان گدھے کو بھی باپ بنانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بھارت کی سب سے بڑی ریاست، یو۔پی (اتر پردیش) میں بی۔جے۔پی کو یہی

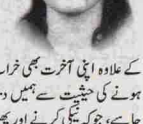

حیائی کے شکار تہوار جو ہمارے مذہب میں ہرگز شامل نہیں۔ یہ تہوار منا کر وقتی خوشی حاصل کرنے والوں کو یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ جانی و مالی نقصان کے علاوہ اپنی آخرت بھی خراب کر رہے ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں دینِ اسلام کی اصل روح چاہیے، جو کہ نیکی کرنے اور پھیلانے کا درس دیتا ہے۔ اس لیے مسلمان بہن بھائیوں سے گزارش ہے کہ ایسے تہوار منانے سے خود گریز کریں اور اردگرد دوسرے لوگوں کو بھی سمجھائیں۔

حافظ محمد کاشف محمود کنوینگ آفیسر بی۔پی۔او، لاہور

بسنت کا تہوار اصل میں ہندوؤں کا ہے، مسلمانوں نے اُن کی نقالی کرتے ہوئے اپنا لیا۔ یہ ایک قاتلانہ دن ہے کیونکہ کئی معصوم بچے ظالم ڈور سے پھول کی طرح کھلنے سے پہلے ہی مُرجھا جاتے ہیں۔ غیر ملکی تہوار منانے والوں سے درخواست ہے کہ وہ غور کریں، کیا غیر مسلم لوگ ہمارے تہوار مثلاً عید میلاد النبی ﷺ، شب قدر یا عیدیں مناتے ہیں؟ پھر ہم ان کے فضول تہواروں پر کیوں پیسا ضائع کرتے ہیں؟ ہمیں اچھے مسلمان اور شریف شہری ہونے کے ناتے ایسے دنوں کو بڑھاوا دینے کے بجائے ختم کرنا چاہیے اور جو رقم ان فضول تہواروں پر صرف ہوتی ہے، وہ اپنا کل سنوارنے پر خرچ کیجیے۔

ادیبہ حسن ملک مظفر

بعض لوگ بدیسی تہوار مثلاً ویلنٹائن ڈے، بسنت، اپریل فول اور شادیوں کی بے جا رسمیں اپنا کر اپنے آپ کو روشن خیال اور ماڈرن ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں حضورؐ کی زندگی کو مثال بنا کر ان پہ عمل کرنا چاہیے اور یہی ایک مسلمان کا فرض ہے۔

مکرم خان ترین موٹر بائیک سیاح، نیشنل ریکارڈ ہولڈر

ہمیں بے شک ہر مذہب کا احترام کرنا چاہیے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان کی رسوم بھی اپنا لیں۔ ہم مسلمان ہیں لہٰذا ہمیں اپنی رسومات اور تہوار اسی مذہبی جوش و جذبے سے منانا چاہیے۔ یہی ایک مسلمان کی شان اور ایمان ہے۔ دینِ اسلام سے وابستہ ہونا ہم پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم اور احسان ہے۔ ہمارا دین ہمیں جو احکام اور ہدایات دیتا ہے، اسی پر عمل کرنے میں ہماری فلاح اور بقا ہے۔

اِرم قریشی ہیڈ ان ہیڈز ڈیلز کمپنی

اگر ہم اپنی نئی نسل کو اپنے مذہب کی صحیح تعلیم دیں تو وہ ویلنٹائن ڈے جیسے تہوار نہ منائیں۔ ویلنٹائن کو محبت کا دن سمجھا جاتا ہے۔ لوگ معاشرے کی غیر ضروری اور پرانی گھٹن زدہ روایت سے گھبرا کے اسے منانا پسند کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنے مذہب کی روایات پر عمل کریں تو ایسے دن منانے کی کبھی کوشش نہ کریں کیونکہ اسلام اتنا جامع اور پسند مذہب ہے جس میں ہمارے سب مسائل اور پریشانیوں کا حل موجود ہے۔

معاملہ درپیش ہے۔

یو۔پی کی آبادی تقریباً ۲۰ کروڑ ہے۔ یعنی یہ بحیثیت مملکت دنیا کا پانچواں بڑا ملک ہے۔ اس میں ۱۸ سے ۲۰ فیصد گویا ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ سے ۴ کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ یہ آبادی انھیں کئی اہم مسلم ممالک مثلاً عراق، مراکش یا تیونس سے بھی بڑی اکائی بنا ڈالتی ہے۔

یو۔پی ریاستی اسمبلی کی ۴۰۳ نشستیں ہیں۔ ان میں سے ''۱۳۰'' نشستوں کے انتخابات میں مسلمانوں کے ووٹ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اپریل، مئی میں ریاستی انتخابات کا اعلان ہوا تو تمام قومی و مقامی سیاسی پارٹیاں مسلمان راہنماؤں وعوام سے دوستی کی پینگیں بڑھانے لگیں۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے آگے پیچھے پھرنے لگیں۔

واضح رہے، ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۲ء تک مسلمان کانگریس کو ووٹ دیتے رہے لیکن اسی سال بابری مسجد کی شہادت نے مسلمانوں کو کانگریس سے بدظن کردیا۔ انھوں نے پھر دلت راہنما، ملائم سنگھ یادو کی سماج وادی پارٹی کو ووٹ دیا۔ لیکن جب ملائم سنگھ بی۔جے۔پی کی گود میں جا بیٹھا، تو مسلمان اس سے بھی دُور ہوگئے۔ انھوں نے پھر ایک اور دلت رہنما، مایاوتی کی پارٹی کو ووٹ دیا جو عرصۂ دراز سے برسرِ اقتدار چلی آرہی ہے۔ مایاوتی نے مسلمانوں کے کام کیے، لیکن اتنے نہیں جن کی انھیں توقع تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اب مایاوتی سے بھی خوش نہیں۔

اسی لیے اب کانگریس، بی۔جے۔پی، سماج وادی پارٹی، مایاوتی کی بی۔ایس۔پی (بہوجن سماج پارٹی) بھرپور سعی کررہی ہیں کہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ مسلم ووٹ اپنی طرف کھینچ سکیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کی بھی بہت سی سیاسی جماعتیں نمودار ہوگئی ہیں، تاہم وہ کسی نہ کسی قومی یا مقامی بڑی جماعت ہی سے وابستہ ہیں۔

کانگریس کا اقدام

یو۔پی کے مسلمانوں کا دل جیتنے کے لیے موجودہ وفاقی کانگریسی حکومت نے سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں ان کا ''۴.۵ فیصد'' کوٹہ منظور کرلیا ہے۔ یہ کوٹہ دینے کی سفارش ۲۰۰۷ء میں سچر کمیٹی رپورٹ میں کی گئی تھی، تاہم وفاقی حکومت نے معاملہ لٹکائے رکھا۔ اب سب سے بڑی ریاست کے انتخابات جیتنے کی خاطر کانگریسی حکومت نے یہ بڑا اہم قدم اٹھایا ہے۔

ظاہر ہے، سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں ۴.۵ فیصد کوٹہ ملنے سے بھارتی مسلمان خوش ہیں۔ تاہم وہ چاہتے ہیں کہ اسے کم از کم ۷ فیصد کیا جائے۔ پھر بھی مسلمانوں کے لیے مفید قدم کانگریس کو یو۔پی میں خاصی تقویت پہنچا سکتا ہے۔ یاد رہے، یو۔پی کے مسلمان زرخیز اسلامی تہذیب وتمدن رکھتے ہیں لیکن آزادی کے بعد وہی تعلیمی ومعاشرتی لحاظ سے سب سے زیادہ پس ماندہ ہوگئے۔

یو۔پی کے مسلمانوں کا ایک بڑا مطالبہ یہ ہے کہ آبادی میں تناسب کی رو سے ریاستی اسمبلی میں انھیں نشستیں دی جائیں۔ یہ حق دلتوں کو مل چکا جو ریاستی آبادی کا ۲۱ فیصد ہیں۔ چنانچہ ہر بار انتخابات میں ۸۵ فیصد دلت منتخب ہوکر اسمبلی میں پہنچتے ہیں۔ اس تناسب کی رو سے مسلمانوں کو ہر حال میں ۵۵ نشستیں ضرور ملیں گی۔ جبکہ فی الوقت اسمبلی میں ۵۵ مسلمان ارکان موجود ہیں۔

مسلمانانِ یو۔پی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ متحد نہیں اور سیاسی، فرقہ ورانہ یا معاشرتی گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کی تقسیم شدہ قوت سے غیر مسلم فائدہ اٹھاتے ہیں جبکہ مسلمان متحد نہ ہونے کے باعث ترقی وخوشحالی سے محروم ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنی حالتِ زار سے سبق نہیں سیکھتے۔ اس وقت بھی ان کے ووٹ مختلف قومی ومقامی جماعتوں کے مابین بٹے ہوئے ہیں۔ پھر بھی ان کی آبادی اتنی زیادہ ہے کہ بی۔جے۔پی جیسی انتہاپسند ہندو جماعت بھی مسلمانوں سے مدد مانگنے پر مجبور ہے۔

عمر ۱۸ سال
قد صرف ۲ فٹ

دنیا کی سب سے پست قامت لڑکی

جس کے حوصلہ وجذبہ نے اسے کئی قد آور لوگوں میں ممتاز کردیا

رضیہ فضل

یہ ۱۹۹۳ء کے وسط کی بات ہے، بھارتی شہر ناگ پور کی باسی، رنجنا اکی نے اپنے شکم کا اسکین کرایا۔ وہ ۶ ماہ کی حاملہ تھی اور اُسے یقین تھا کہ اب بچہ اسکین میں نظر آجائے گا۔ لیکن ڈاکٹر نے اسکین کیا تو کچھ نظر نہ آیا۔ ڈاکٹر نے اُسے بعد میں آنے کو کہا۔ چنانچہ افسردہ رنجنا گھر واپس چلی گئی۔

اگلا اسکین ۳ ماہ ہوا جب حمل کے ۹ مہینے پورے ہو چکے تھے۔ حیرت انگیز طور پر تب بھی چھوٹا سا دھبا ہی ظاہر ہوا۔ ڈاکٹر نے رنجنا اور اس کے شوہر کشن کو بتایا کہ بچے کی نشوونما صحیح نہیں ہوئی، اگر وہ زندہ پیدا بھی ہوا، تو دس پندرہ منٹ بعد موت اس کا مقدر بن جائے گی۔ یہ سن کر رنجنا بیوی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

مگر ڈاکٹروں کے سبھی اندازے غلط ثابت ہوئے۔ گو رنجنا کی بیٹی صرف ۳ پاؤنڈ کی تھی، مگر وہ زندہ رہی۔ یہ رب تعالیٰ کا بڑا معجزہ تھا۔ اسی لیے ماں باپ نے بچی کا نام جیوتی رکھا، اس سنسکرت لفظ کے معنی ہیں ''زندگی'' یا ''روشنی''۔ جیوتی نے بھی اپنے نام کی لاج رکھی اور زندگی کو نیا مفہوم بنانے کا سبب بنی۔

جیوتی دراصل ماں کے پیٹ ہی میں ایک جینیاتی مرض، اچونڈرو پلاسیا (Achondroplasia) میں مبتلا ہوگئی تھی۔ یہ بھنگے پن کی ایسی قسم ہے جس میں کرکری ہڈی کی نشوونما میں نقص کے باعث انسان بڑھ نہیں پاتا۔ جب وہ ۳ سال کی ہوئی، تب والدین کو اس مرض کا پتا چلا کیونکہ جیوتی اتنی عمر کی ہوجانے کے باوجود تتلی ''ممی'' کا کی'' نظر آتی تھی۔ چنانچہ وہ اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ تب رنجنا اور کشن پر انکشاف ہوا کہ ان کی پیاری بچی معمول کے بچوں سے الگ ہے۔

شروع میں تو قدرتاً وہ غم و اندوہ کا شکار رہے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ سوائے پست قامتی کے، جیوتی میں کوئی خامی نہیں، تو انھوں نے مقدر کا لکھا قبول کرلیا۔ اُدھر جیوتی نے جوں جوں شعور سنبھالا، اس نے اپنے بھنگے پن کے باعث احساسِ کمتری کا شکار ہونے سے انکار کردیا۔ اس کے برعکس جیوتی نے اپنی بظاہر خامی کو خوبی

میں بدل ڈالا۔

ہوا یہ کہ پست قامتی کی وجہ سے جیوتی اپنے محلے میں مشہور ہوگئی۔ جب وہ ۱۰/سال کی تھی، تو اس کا قد صرف ایک فٹ تھا اور وہ نوزائیدہ بچی نظر آتی لیکن وہ بالغ بچیوں کی طرح باتیں کرتی، تو سبھی اُسے دلچسپی سے دیکھتے۔ مرکزِ نگاہ بن کر جیوتی کو خوشی ہوتی۔ یوں مثبت طرزِ فکر نے جیوتی پر غم و مایوسی کو طاری نہ ہونے دیا اور وہ عام بچوں کی طرح زندگی گزارنے لگی۔

البتہ جب وہ پہلی بار اسکول گئی، تو اُسے دیگر بچیوں میں بیٹھ کر کچھ خوف محسوس ہوا۔ ظاہر ہے، بڑی بڑی اجنبی لڑکیوں نے شروع میں اس کا مذاق اُڑایا۔ شاید کسی نے ڈرایا دھمکایا بھی ہوگا لیکن جب جماعت کی لڑکیاں اس سے گھل مل گئیں، تو انھیں یہ احساس ہوا کہ یہ بڑی سادہ مزاج اور نیک طینت لڑکی ہے۔ یوں جیوتی کی مقبولیت نے جماعت میں بھی قدم جما لیے۔

جماعت میں جیوتی ننھی منی میز کرسی پر بیٹھتی ہے۔ گھر میں بھی اس کا ننھا سا بستر ہے۔ کپڑے بھی خصوصی ڈیزائن کے تیار ہوتے ہیں۔ اس کی ۲/بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ چاروں مل جل کر رہتے ہیں۔ درحقیقت والدین اور بھائی بہنوں کی مدد کے ذریعے ہی جیوتی میں خود اعتمادی آئی اور اس نے اپنی معذوری کو بوجھ نہیں سمجھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اداکارہ بننا جیوتی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔ ابھی اسے کانڈا زبان کی ایک فلم میں کردار بھی مل گیا ہے لیکن وہ بالی وڈ جا کر ''خان بادشاہوں'' کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہے۔ شاہ رُخ اور سلمان خان اس کے پسندیدہ اداکار ہیں۔

مستقبل میں ممکن ہے کہ جیوتی کی خواہش پوری ہو جائے کیونکہ اب وہ دنیا کی سب سے ٹھگنی لڑکی ہونے کے باعث بین الاقوامی شہرت رکھتی ہے۔ پچھلے سال ماہِ دسمبر میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے ریکارڈ جمع کرنے والے مشہور برطانوی ادارے، گینز ورلڈ ریکارڈز کا ایک نمائندہ مع ڈاکٹر ناگ پور پہنچا۔ انھوں نے پھر جیوتی کا قد ناپا اور طبی معاینہ کیا۔ ۳/بار پیمائش کے ذریعے جیوتی کا قد ۲۴/اعشاریہ ۷/انچ اور وزن ساڑھے پانچ کلو ریکارڈ ہوا۔

جیوتی سے قبل ۲۲/سالہ امریکی، بریجت جارڈن دنیا کی سب سے پست قامت لڑکی تھی لیکن جیوتی اس سے پورے ۷/سینٹی میٹر چھوٹی نکلی۔ یوں وہ باضابطہ طور پر دنیا کی سب سے چھوٹی لڑکی یا صنفِ نسواں سے تعلق رکھنے والی رکن بن گئی۔ واضح رہے، جیوتی ان برتنوں میں کھانا کھاتی اور پانی پیتی ہے جو عموماً گڑیوں کے لیے بازار سے ملتے ہیں۔

جیوتی انسانی تاریخ میں سب سے پست قامت لڑکی نہیں۔ یہ اعزاز ہالینڈ کی پالین مسٹرز کو حاصل ہے جو ۱۸۷۶ء تا ۱۸۹۵ء زندہ رہی۔ وہ صرف ۲۴/انچ قد رکھتی تھی۔ چونکہ ٹھگنے انسانوں کی ہڈیاں بھربھری ہوتی ہیں لہٰذا وہ کم ہی جیتے ہیں۔ جیوتی بھی مسلسل دوائیں کھاتی ہے تاکہ تندرست رہے۔ ایجونڈریا پلاسیا پیدا ہونے والے ۲۵/ہزار بچوں میں سے صرف ایک کو نشانہ بناتا ہے۔

جیوتی حقیقتاً اپنے پست قامت ہونے پر رب تعالیٰ کی شکرگزار ہے کیونکہ بقول اس کے اسی وجہ سے اسے دنیا بھر میں نام و مقام ملا۔ پھر گینز ریکارڈ ہولڈر کی حیثیت سے اسے یورپ اور جاپان کی سیر کرنے کا بھی موقع ملے گا۔ جیوتی کو اس اَمر پر بھی مسرت ہے کہ موصوفہ نے عالمی نقشے میں ناگ پور کو نمایاں کر دیا۔

جیوتی کی خود اعتمادی اس بات سے بھی عیاں ہے کہ وہ میٹرک پاس کر چکی ہے۔ اب وہ یونیورسٹی سے تاریخ یا معاشیات کے موضوع پر ڈگری لینا چاہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تعلیم یا علم ایسی دولت ہے جو ایک محتاج و غریب کو بھی نہال کر سکتی ہے۔

جیوتی بحیثیت انسان ہمارے سامنے ایک بڑا سبق بھی لاتی ہے۔ وہ یہ کہ کامیابی اور ناکامی کے پیمانے میں ایک انسان کا قد کوئی حیثیت و اہمیت نہیں رکھتا۔ کامیاب انسان وہی ہے جو تمام تر مشکلات کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔ اس لحاظ سے جیوتی کو یقیناً ایک فتح مند لڑکی تصور کیا جائے گا۔

مینیجر

صاحب اب تک نہیں آئے تھے۔ ان کا انتظار کرتے پورا ایک گھنٹہ ہوگیا تھا۔ میری جیب میں ان کے نام میرے ایک دوست کا لکھا سفارشی رقعہ پڑا ہوا تھا۔ اس میں پُرزور الفاظ میں لکھا تھا کہ حاملِ رقعہ کو جس طرح بھی ہو سکے، دفتر میں ملازم رکھ لیجیے۔ حصولِ ملازمت کی کوشش مجھے کراچی کھینچ لائی تھی۔ بحری جہازوں کی مرمت کرنے والی اس کمپنی میں میرے لیے یقیناً گنجائش نکل سکتی تھی۔ دفتر بند ہو چکا تھا۔ پھر بھی چپراسی اخلاقاً مینیجر صاحب کی واپسی تک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اس خیال سے کہ مینیجر صاحب کے دوست کا دوست ہوں اور ان سے ملنے لاہور سے آیا ہوں، کوکا کولا پلا دیا۔ یوں بھی باہر کی چلچلاتی دھوپ، سمندر کی گرم گرم لُو اور طویل سفر کی تھکن کمرے میں داخل ہوتے ہی ختم ہوگئی۔

اس چھوٹے سے کمرے کو بجلی کی طاقت سے برف کی طرح یخ بنا لیا گیا تھا۔ لمبی چوڑی آبنوسی میز پر آدھ انچ موٹا شیشہ بچھا تھا۔ نیلیفون کے ساتھ ایک خوبصورت چھتری والا ٹیبل لیمپ جل رہا تھا جس کی ہلکی ہلکی سبز روشنی شیشے کے عجیب و غریب قلم دان، لال نیلی پنسلوں اور گھومنے والی نئی کرسی پر پڑ رہی تھی۔ کرسی کے دائیں طرف دیوار کے کونے میں ایک چھوٹی میز پر پھلوں کی گلدستہ رکھا ہوا تھا۔ کمرے کے نفیس ماحول میں پھلوں کی بھینی بھینی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

قلم دان کی طرف سے ایک چیونٹی رینگتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی۔ آئے آئے محترمہ تشریف لائیے، آپ کا ہی انتظار تھا۔ آپ وقت گزارنے کے لیے بہترین ساتھی ہیں۔ میں چیونٹی سے کھیلنے میں مصروف ہوگیا۔ پہلے میں اسے بھاگ جانے کی مہلت دیتا۔ جب وہ عین میز کے کونے میں پہنچ کر غائب ہونے لگتی، میں پھر راستہ روک کر اسے انگلی کے ساتھ ساتھ چپ میدان میں لے آتا اور اسے چھوٹے چھوٹے چکر کھلانے لگتا۔ کوئی ایک فٹ کے دائرے میں وہ دیر تک میری انگلی کے اشارے پر ناچتی رہی۔ پھر جانے مجھے کیوں خیال آیا کہ اسے ایک انچ کے اندر اندر چکر کھلائے جائیں تو کیسا رہے گا؟ دائرہ محدود ہوتے ایک انچ میں سمٹ گیا۔ کسی مجبور کو اور زیادہ مجبور کرنے میں کتنی لذت ہے! نسیم کو مجبور کرنے میں فرقان کو بھی ایسی ہی لذت ملی ہوگی.....

آٹھ برس پہلے کی بات ہے، رشید نے مجھے اپنے گاؤں بلایا۔ ہم دونوں باغ میں مالی کی کوٹھڑی کے باہر بیٹھے مالٹے کھا رہے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ درختوں کے سائے ان کے آس پاس جم کر رہ گئے تھے۔ ہرے ہرے پتوں میں سنہرے مالٹے چمک رہے تھے۔ باغ کی شمالی کھائی کی طرف سے ایک شخص آہستہ آہستہ ہماری طرف آیا۔ اس نے اوورکوٹ پہنا ہوا تھا۔ منہ میں سگریٹ تھا، بغل میں کتاب تھی۔ اس کے سر پر استادہ سرکنڈے کے اونچے چیڑ کی آخری شاخ پر ایک کالی چڑیا خاموش بیٹھی تھی۔ کالی چڑیا کے پیچھے بہت دور گہرائی میں نیلے آسمان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی چیز کو بھی دوام حاصل نہیں۔ آسمان کا یہ چھوٹا سا نیلا ٹکڑا، خاموش کالی چڑیا، اداس اداس چلتا ہوا آدمی اور یہ باغ سب ایک دن یوں ہی خزاں خراماں لڑھک جائیں گے۔

اگلے ہی لمحے میں نے محسوس کیا کہ بے ثباتی کے اس ہولناک احساس کا سبب نئے آدمی کی عجیب و غریب چال ہے۔ قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ استقامت بھی تھی اور کوئی تیسری چیز بھی جسے میں اس وقت سمجھ نہ سکا۔ رشید نے بتایا ”یہ شخص میرا جگری دوست ہے، بہت گریٹ آدمی ہے، نام بھی فرقان عظیم ہے۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ہے۔ چار سال سے میرے ہی پاس رہتا ہے۔ غالباً میرے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ تھوڑی دیر کے لیے بھی اِدھر اُدھر ہو جاؤں تو پاگل ہو جاتا ہے۔ فلسفے اور ادب کا شیدائی ہے۔ میں جب کبھی شہر جاؤں، اس کے لیے کتابیں خرید کر لاتا ہوں۔ اسے میرے اور کتابوں کے سوا دنیا کے کسی اور کام سے دلچسپی نہیں۔“

وہ جب بالکل قریب آگیا تو ہم احتراماً کھڑے ہوگئے۔ اس لیے بھی کہ وہ ہم دونوں سے عمر میں بھی بڑا تھا اور پھر اس کے پورے وجود پر چھائی متانت نے ہمیں مجبور سا کر دیا تھا۔ متانت سے بھی زیادہ خاص چیز اس کی آنکھوں میں کوندتی وہ بے قرار چمک تھی جو زندگی کو پوری شدومد سے بسر کرنے والوں کی آنکھوں میں خودبخود پیدا ہوجاتی ہے۔ چہرے اور ماتھے پر لکیریں، جھریاں یقیناً نہیں تھیں۔ روح کو چکل دینے کی جنگ کے اعصابی آثار تھے۔ نقوش اچھے خاصے تیکھے خوبصورت اور نوک دار تھے۔ شیو بڑھی ہوئی، گدّی پر پال بڑھے ہوئے، قمیص کا غلیظ کالر ایک طرف سے اوورکوٹ میں چھپا ہوا اور دوسری طرف سے بڑے بے ہنگم طریقے سے باہر کو بڑھا ہوا۔ کالے کالے ناخن بڑھے ہوئے، ناک کے بال بڑھے ہوئے، شخصیت میں تراش خراش کی ضرورت تھی۔

تعارف کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے ہاتھ ملانے سے پیشتر یونہی ہنس کر کہا ”رشید صاحب! آپ کے یہ دوست مجھے قاتل معلوم ہوتے ہیں۔“ یہ بات کہتے ہی مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ اس کی چال میں جو چیز میری سمجھ میں نہ آرہی تھی، اسے میں نے خود پر واضح کرلیا۔

رشید نے اپنے دوست کی طرف بامعنی نظروں سے دیکھا جس کا مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ واپس اپنی جگہ چلا گیا اور اس کی چبھتی نظریں برابر مجھ پر جمی رہیں۔ رشید نے کہا ”میں ابھی آتا ہوں، آپ دونوں باتیں کریں۔“

وہ چلا گیا تو میں اپنے والے موڑھے پر جا بیٹھا۔ وہ رشید والے موڑھے پر بیٹھتا بیٹھتا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات بھی نہ کی۔ بس مالٹے چھیل چھیل کر مجھے دینے لگا۔ مالٹے پر چھری کی نوک رشید کے مقابلے میں بڑی نفاست سے چلاتا، چار آر پار لکیریں ڈال کر چھری سے وہ چھلکے اتارتا، پھر چھری ہی سے مالٹے کا ایک ایک بال دھیرے دھیرے اتارتا، نظر کی باریکی مالٹے پر معمولی سا بال بھی فوراً ڈھونڈ لیتی۔ اس کے حرکت کرتے ہاتھوں کی دو انگلیاں سگرٹوں کے دھوئیں میں جل جل کر مالٹی رنگ کی ہوگئی تھیں۔ بس اسی وجہ سے اس کا چھیلا ہوا مالٹا کھانے سے طبیعت میں میل سا آجاتا۔ اس کی روح پر چھایا ہوا میل میری روح میں داخل ہوتا محسوس ہوتا۔

شام ہوگئی، مگر رشید اپنے کاموں میں مصروف رہا، ہمارے پاس نہ آیا۔ فرقان نے مجھے اس کا آلوؤں والا کھیت دکھایا۔ تمباکو کی پنیری دکھائی۔ کلھو میں گنے بیلتے ہوئے دکھائے، گنجی، گاجر اور مولی کی الگ الگ کیاریاں دکھائیں۔ اس سفر کے دوران میں وہ خاموش نہیں رہا۔ اس نے ادب، فلسفہ، شاعری، سیاست، ہر موضوع پر مجھ سے باتیں کیں۔ ہر موضوع پر اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس کی رائے بڑی سچی تلخ اور حقیقت پسندانہ ہوتی تھی۔ سب کچھ ٹھیک تھا مگر لہجے میں استقامت اور لڑکھڑاہٹ کے ساتھ ساتھ وہ تیسری چیز کیا تھی جواب پھر میری سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ ایسا واضح شخص قاتل نہیں ہوسکتا۔ مگر اس کی آنکھوں کی زندہ چمک اور انگلیوں میں جمے ہوئے دھوئیں میں آخر تعلق کیا ہے؟ جس کی آنکھوں میں جینے کی ایسی امنگ ہو، وہ اپنے آپ کو دھوئیں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔

باتوں ہی باتوں میں وہ میرے اس قدر قریب آگیا تھا کہ اس کی چال اور لہجے میں چھپی تیسری چیز کے متعلق کچھ جاننے کا خیال خودبخود ختم ہوگیا۔ دوستی کے نوکیلے احساس نے کھوپڑی میں اُگنے والے شاخ در شاخ خیالات کی جڑیں کاٹ دیں۔ میرا دوست اصل میں رشید تھا اور میں اسی کے بلاوے پر یہاں آیا تھا لیکن وہ ہماری نئی دوستی کی ڈور مضبوط کرنے کے لیے کٹی پتنگ کی طرح اِدھر اُدھر ڈول رہا تھا۔ ہم اسے دور ہی سے بھی اپنے مکان کی بالائی منزل میں جاتا دیکھتے، کبھی مزارعوں کے پاس کھڑا دیکھتے۔ اس کا تعاقب کرتی فرقان کی خاموش نگاہیں رشید کے اس خیال کی توثیق کر رہی تھیں ”غالباً یہ میرے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔“

حد یہ ہے کہ رشید رات کو کھانے کے وقت بھی ہمارے پاس نہیں آیا۔ بس ایک منٹ کے لیے بمبل لے کر آیا اور کہنے لگا ”بھئی معاف کرنا تم اتنی دور سے آئے ہو اور میں خاطر مدارت نہیں کر رہا۔ دراصل مجھے سخت بخار

ہوگیا ہے۔ لو یہ کمبل لو، باقی جس چیز کی ضرورت ہو، اوپر سے منگوالینا۔'' کمبل دے کر وہ پھر اوپر چلا گیا۔

کھانا کھاتے ہی میں تو اتنا غفیل ہوگیا۔ آخری غنودگی میں دیکھا تھا کہ فرقان لیمپ کی روشنی میں کتاب کھولے بیٹھا ہے مگر پڑھ نہیں رہا۔ تقریباً آدھی رات کے وقت کسی نے لحاف کا پلو ہٹا کر مجھے جگایا۔ میں فوراً اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا اور پورے ہوش و حواس سے اپنا سانس روک لیا۔ گھپ اندھیرے میں میری آنکھیں غور سے اس خنجر کو ڈھونڈتی پھر رہی تھیں جو ابھی مجھے قتل کرنے والا تھا۔

بیٹھک کے روشن دان سے اندر آنے والی چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں مجھے بس ایک سایہ نظر آیا جو دونوں ہاتھوں سے بستر پر مجھے ڈھونڈ رہا تھا ''بھئی کہاں چلے گئے آپ؟'' یہ لب و لہجہ قاتل کا نہیں ہوسکتا، میں نے اپنا اتا پتا بتانا چاہا لیکن جیسے سانپ نے کاٹ رکھا تھا، سانس روکے کھڑا رہا۔ وہ اپنی چارپائی کی طرف گیا تو میں نے چاہا کہ چپکے سے بھاگ جاؤں، لیکن وہ فوراً ہی واپس آگیا۔

اس نے دیا سلائی جلائی اور ہنس کر بولا ''ارے آپ مجھ سے ڈر گئے۔'' میں ندامت اور خوف سے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا رہا۔ جب اطمینان ہوگیا کہ ہاتھوں میں تو کچھ نہیں، دل میں کچھ ہو تو ہو، میں چارپائی سے نیچے اتر آیا۔

اس نے چپکے سے کہا ''چلو میرے ساتھ باہر چلو۔''

میں نے بھی چپکے سے جواب دیا ''یہ تو بہت مشکل بات ہے۔ اس سردی میں آپ باہر کہاں لے جارہے ہیں مجھے؟''

بولا ''چلیے تو سہی کسی کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔''

میں نے کہا ''جو بات کرنی ہے یہیں کر لیجیے۔''

بولا ''مجھے تنہائی چاہیے۔''

میں نے ذرا بلند آواز سے کہا ''تنہائی تو یہاں بھی ہے۔''

کہنے لگا ''آہستہ بولو، جلدی چلو، ابھی آجائیں گے۔''

میں کچھ مجبوراً کچھ اخلاقاً جوتا پہننے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا اوورکوٹ پہنا، ربڑ کے چپل پہنے، سگرٹوں کی ڈبیا اور ماچس اٹھائی۔ میں رشید کا کمبل اوڑھ کر اس کے ساتھ ہولیا۔

بیٹھک کا دروازہ آہستہ سے بند کرکے اس نے کہا ''ذرا آہستہ چلو کوئی، جاگ نہ جائے۔'' اس بات سے مجھے پورا یقین ہوگیا کہ کوئی گہرا راز ہے جو میرے سینے میں اتارنا چاہتا ہے..... اور وہ خنجر کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے مقتل کی طرف لے جایا جارہا ہے۔

فرقان نے گفتگو کا آغاز کیا ''دوپہر کو آپ نے میرے متعلق جو رائے دی تھی.....''

میں نے کہا ''ارے صاحب! وہ تو مذاق کی بات تھی۔''

فرقان بولا ''مگر میرے لیے بہت سنجیدہ بات ہے۔''

میں نے کہا ''میں آپ سے حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے محض مذاق کیا تھا۔''

فرقان ایک دم تلخ ہوگیا ''مذاق مذاق میں قتل بھی ہو جاتے ہیں، آپ نے میری کس بات سے یہ اندازہ لگایا؟ کیا مجھ میں کوئی قاتلوں والی بات آپ کو نظر آئی تھی؟''

اچانک جھوٹ نے مجھے بچنے کی ایک نئی راہ دکھائی ''جی ہاں! جب آپ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے آپ کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ لی تھیں۔''

فرقان میرے قریب کھسک آیا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر بولا ''اب غور سے دیکھیے، یہ قاتل کا ہاتھ نہیں ہوسکتا۔ میں نے کبھی کسی کا قتل نہیں کیا، میں تو ایک چیونٹی تک نہیں مار سکتا۔''

میں اس کے ہاتھ کی لکیریں بظاہر غور سے دیکھنے لگا۔ میں دست شناسی (پامسٹری) پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ پھر بھی بعض لوگوں کو اکثر دھوکا دیتا رہا تھا۔ میں نے محض دکھاوے کی خاطر اس کی لکیروں کو خوب ٹٹول ٹٹول کر دیکھا۔ اس نے میری مدد کے لیے یکے بعد دیگرے کئی دیا سلائیاں جلا کر مسلسل روشنی بہم پہنچائی۔ آخر میں نے فیصلہ سنایا ''جناب دوپہر کو مجھے دھوکا ہوا تھا۔ دراصل یہ لکیر جو انگوٹھے کی طرف مڑ گئی ہے، اس نے آپ کو بچا لیا۔ اگر یہ دماغ کی لکیر سے مل جاتی تو یقیناً آپ سے قتل کا ارتکاب ہوجاتا مگر اب آپ بال بال بچ گئے۔''

فرقان بولا ''آپ مجھے بنا رہے ہیں۔ آپ کا دوپہر کا مشاہدہ ٹھیک تھا، میں نے تو ایک قتل کر رکھا ہے۔''

میں نے اپنے لہجے میں وثوق پیدا کرتے ہوئے کہا

"نہیں جناب! آپ میں قتل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ ہاتھ کی کوئی لکیر مجرمانہ ذہنیت کا پتا نہیں دیتی۔ پھر آپ کا ماتھا بھی میں نے پڑھا ہے۔ قیافہ شناسی کا کوئی اصول آپ کے مجرم ہونے کا سراغ نہیں دیتا۔ پھر آپ کی آنکھوں میں جو معصوم سی چمک ہے، وہ مجرم کی آنکھوں میں ہو ہی نہیں سکتی۔ کسی ریاضت کرنے والے ہی کی آنکھوں میں یہ خاص چمک ہوتی ہے۔"

فرقان بولا "ریاضت اپنے گناہ چھپانے کے لیے بھی تو ہو سکتی ہے۔ آپ نے دوپہر کو مجھے قاتل کہہ کر ایک عجیب عذاب میں مبتلا کر دیا۔ آج تک مجھے اپنے قاتل ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں پورا یقین نہیں تھا مگر آج آپ نے مجھے یقین دلا دیا۔ اب یہ یقین ہی میرے لیے عذاب بن گیا ہے۔"

میں نے کہا "آخر قصہ کیا ہے، کچھ تو بتا چلے، مجھے اپنا دوست سمجھو اور جو کچھ آپ کے دل میں ہے، سب اگل ڈالو۔"

فرقان بولا "قصہ بہت معمولی ہے۔ ایک شخص تھا، بہت ہی بھولا بھالا، سیدھا سادھا، ذہین اور شوخ۔ اس نے ایک لڑکی سے محبت کی۔ لڑکی کچھ عرصے کے بعد اس سے چھن گئی۔ کوئی اور اسے اپنے ساتھ انجانے شہر لے گیا۔ وہ شخص اس ناکامی کو برداشت تو کر گیا مگر کچھ اس انداز سے کہ ماں باپ سے جھگڑ کر الگ رہنے لگا۔ سارے دوست احباب سے کنارہ کر لیا۔ چپکے چپکے شراب اس سے چمٹ گئی اور شراب کے بعد عورت! وہ ہر عورت کو، جو بھی اس کے سامنے آتی، چیونٹی کی طرح مسل کر گزر جاتا۔ بے شمار چیونٹیاں اس نے روند ڈالیں۔ پھر جب اس نے سوچا کہ ایک چیونٹی بھی تو راہ میں ایسی نہیں آئی جو اس سے بچ کر نکل جائے یا سے کاٹ ہی لے، تو اس نے چاہا کہ شہر چھوڑ کر کہیں دور نکل جائے۔

وہ شخص ریل میں بیٹھا جا رہا تھا کہ راستے میں ایک شخص اسے ملا۔ وہ اس کا دوست بن گیا اور چند روز کے لیے اسے اپنے گاؤں لے گیا۔ وہاں اس نے ایک بہت ہی خوبصورت، بھوری بھوری سی چیونٹی دیکھی، جس نے پہلے ہی دن اسے اپنی نشیلی آنکھوں سے زور سے کاٹ لیا۔ اب اس شخص نے ایسے چکر کھلانے شروع کیے، اسے خوب ہی اپنے اشاروں پر نچایا اور اس رات وہ اسے چکر دیتا دیتا یہاں اس کنوئیں کی مینڈھ تک لے آیا۔ یہ نہ سمجھیے کہ وہ اسے مسلنا چاہتا تھا، ہرگز نہیں، اس خیال سے وہ توبہ کر کے گھر سے نکلا تھا۔

"آہ قیامت کی رات تھی وہ۔ یہی چاند ان کے سروں پر چمک رہا تھا اور وہ کہہ رہی تھی، میں تجھ سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ اگر تو محض مذاقاً بھی مجھے کنوئیں میں چھلانگ مارنے کے لیے کہے تو ابھی کود پڑوں گی۔ اس شخص نے آزمانے کے لیے نہیں بس ویسے ہی ازراہِ مذاق اس سے کہا، اچھا ذرا کود کر تو دکھا، تجھے کتنی محبت ہے۔ ابھی یہ فقرہ لڑکی نے پورا سنا بھی نہ تھا کہ دھم سے پانی میں گرنے کی آواز آئی۔

"اس شخص کو یہ سوچنے میں کئی منٹ لگے کہ یہ مذاق ہے یا سچ سچ کچھ ہو گیا۔ ایسی جذباتی کہانیاں اس نے پڑھی تو بہت تھیں مگر دیکھی آج تھی۔ ان دنوں کنوئیں میں یہ بالٹیاں نہ تھیں۔ پانی سڑا ہوا تھا اور اس شخص کے پاس اپنے دوست اور اس کے مزارعوں کو جگانے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اگر کوئی جواز تھا تو یہ کہ وہ خود بھی کنوئیں میں گر پڑا۔ پانی کی دلدل میں دیر تک ہاتھ پاؤں چلانے کے بعد آخر کار اسے وہ لڑکی مل گئی مگر وہ جا چکی تھی۔ اس شخص نے بھی گہرائیوں میں اترنے کی پوری کوشش کی لیکن لوگوں نے اسے بچا لیا۔ ہوش میں آنے کے بعد موصوف نے اپنے دوست کو بتایا کہ جب رات کو اٹھا تو اس کی بہن کسی کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ اس نے ان کا تعاقب کیا۔ وہ شخص تو فرار ہو گیا اور نسیہ نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ اسے بچانے کے لیے وہ بھی کود پڑا۔"

میں نے کہا "فرقان صاحب! سوال یہ ہے....."

فرقان جھنجھلا کر بولا "میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس شخص کو نسیہ کے مرنے کا کوئی افسوس نہ تھا۔ اس نے موت کو بھی اہمیت نہیں دی۔ زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے نزدیک فقط وہ اہم ہے۔ اب اس میں یہ احساس شدت پکڑ گیا کہ اس نے دوست کو دھوکا دیا ہے۔ اس سے جھوٹ بولا ہے۔ اگر وہ اس سے صاف صاف کہہ دیتا، ہاں دوست تیری بہن میری ہی وجہ سے چلی گئی ہے تو اس کے ضمیر کو وہ دکھ نہ جھیلنے پڑتے جو وہ اب تک جھیلتا رہا ہے۔ اسے خوب معلوم تھا کہ اگر وہ گاؤں سے چلا گیا تو چندون کے بعد ہی دوست کو یہ احساس ہو جائے گا کہ میری بہن کا قاتل وہی تھا اور اصل وجہ وہ قیامت تک بھی نہ سمجھ سکے گا۔

"اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لیے باقاعدہ ریاضت کی ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس نے اپنے دوست کو تنہا نہیں چھوڑا کہ کہیں تنہائی میں سچائی اس کے کانوں میں اپنا جادو نہ بھر دے۔ لیکن دوست تم نے سارا طلسم توڑ دیا۔ جس وقت تم نے کہا تھا، رشید صاحب! آپ کے یہ دوست مجھے قاتل معلوم ہوتے ہیں، تو تمہیں کیا معلوم، رشید نے مجھے کن نظروں سے دیکھا تھا۔ میری ساری ریاضت اکارت چلی گئی۔ وہ اسی لمحے مجھے اپنی بہن کا قاتل سمجھنے لگا اور اسی لمحے سے وہ مجھ سے دور ہٹتا چلا گیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی مجھ سے جدا نہیں رہ سکتا تھا مگر وہ آج میرے پاس آیا ہی نہیں۔ تم نے یہ کیا کر ڈالا دوست، مجھے عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب مشورہ دو مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا یہاں سے بھاگ جاؤں یا اعترافِ جرم کر لوں۔"

میں نے کہا "بھاگنے سے یا اعتراف کر لینے سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ اعتراف کر لینے سے اس کی بہن واپس نہیں آ جائے گی۔ اس پر خاموشی ہی کا پردہ پڑا رہنے دو، بھاگ جانے سے تمھاری زندگی کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ تم بھاگ کر کہیں اور ڈراما پیدا کرو گے۔ تمھاری روح کا خلا فرار ہونے سے پُر ہوگا نہ اعتراف کر لینے سے۔ اصل علاج یہ ہے کہ تم ایک چیونٹی اور مسل دو..... بس آخری چیونٹی....."

☆☆

میں نے لمبی چوڑی آبنوسی میز کے شیشے پر اب تک چیونٹی کو خدا جانے کتنے چکر کھلا دیے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میرے میز کے دوسرے سرے پر ایک چار پانچ برس کی پیاری سی لڑکی کھڑی ہے، میں ایک دم حیران رہ گیا کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور گھومنے والی کرسی کے عقب میں دیوار پر لگے سنہرے ہینڈل پر ننھا سا ہاتھ رکھا۔ دروازہ کھل گیا، چوں کی آواز نہ آئی۔ اس کے غائب ہوتے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ ہارڈ بورڈ کی دیوار اور آواز آپس میں یوں پیوست ہو گئے کہ بغور دیکھنے سے دروازے کی لکیریں نظر آ سکیں۔

اب میں اسی حیرزدہ کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ اوہو، میری چیونٹی کہاں چلی گئی؟ میں نے پوری میز پر تلاش کیا۔ کاغذوں کی ٹوکری کو اٹھا کر دیکھا، ٹیلیفون اور ٹیبل لیمپ تک اپنی اپنی جگہ سے مل گئے۔ آخر وہ مجھے پنسل کی دم سے چمٹی مل گئی۔ میں پھر اسے انگلی کے ساتھ ساتھ بیچ میدان میں لے آیا۔ بہت خوب محترمہ، آپ ہمیں تنہا چھوڑ چلی تھیں۔ اب کے دروازہ کھلا تو بچی کے ساتھ ساتھ چھ سال کا لڑکا بھی نمودار ہوا۔ دونوں کے چہروں میں غضب کی مشابہت تھی۔ گورے گورے بےمنوی چہرے، تیکھے نقوش اور نوک دار بڑی بڑی آنکھیں اور ان کی زندہ اور معصوم سی چمک۔

لڑکے نے پوچھا "آپ تس سے ملنا چاتے ایں؟"

میں نے بڑے ادب سے کہا "مینیجر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

لڑکے نے پھر پوچھا "ہمارے ابو سے ملنا چاتے ایں؟ وہ تو امی کے ساتھ باہر دیے ایں۔ شام کو آئیں دے۔"

لڑکی نے اپنا ننا سا ہاتھ اٹھا کر کہا "وہ ریے امارے ڈیڈی۔"

میں نے گھوم کر اس دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے داخل ہوا تھا۔ میں نے کہا "یہاں تو کوئی بھی نہیں۔"

لڑکا ہنس پڑا "ارے تیسے بدھو ہیں آپ، ہمارے ابو نظر نہیں آتے۔ وہ ریے سامنے۔"

میں نے پھر گھوم کر دیکھا۔ دروازے کے اوپر ایک سنہرے فریم کی تصویر میں یہ دونوں بچے فرقان کی گود میں بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ فرقان کی آنکھوں کی چمک میں کچھ اور بھی زندگی آ گئی تھی۔ بال سنورے ہوئے تھے۔ چہرے پر صحت کے آثار نمایاں تھے۔ شخصیت میں بڑی تراش خراش تھی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوا، میں دیوانہ وار میز پر اپنی چیونٹی ڈھونڈنے لگا۔ وہ میز کے آخری کونے پر پہنچ کر غائب ہو رہی تھی۔ میں نے اسے وہیں مسل دیا۔

اُردو ادب

وارث

اختر عباس

ایک بیٹی کا دلخراش ماجرا
اس کی ماں نے اُسے
اپنا وارث بنا ڈالا تھا

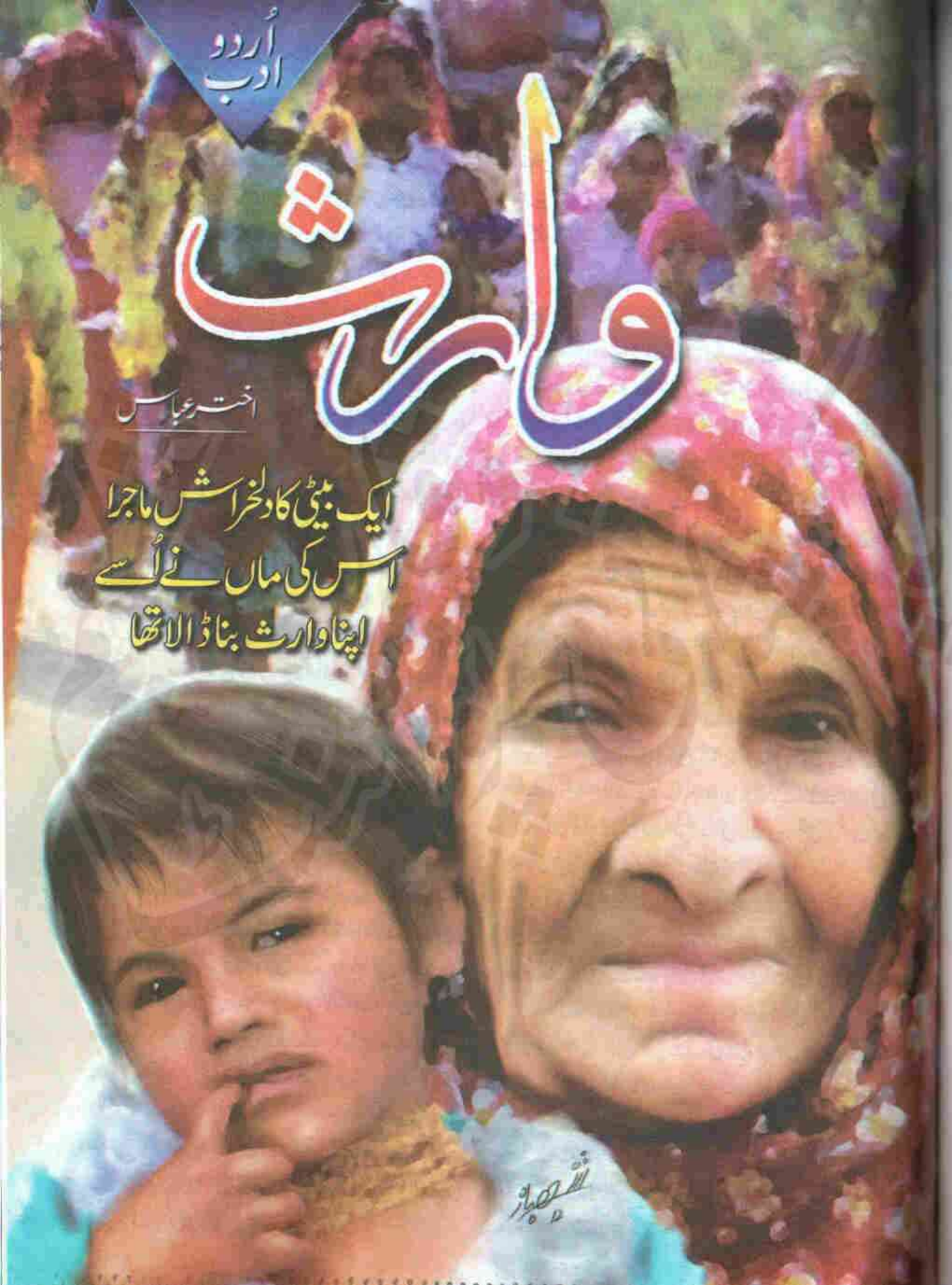

ماچس

کی تیلی ابھی جلی ہے۔ ایک شعلہ سا لپکا ہے اور تنی اگربتیاں سلگنے لگی ہیں۔

دھواں اوپر جا رہا ہے۔ خوشبو چاروں طرف دھیرے دھیرے سفر کر رہی ہے اور میں سوچ رہی ہوں ''بس یہی ہے انسانی زندگی کی کہانی، کچھ اس سے زیادہ ہو تو مجھے بھی بتلاؤ!''

دادی وہ سب کی تھیں پر میری دادو تھیں۔ جانے کیا بات ہے، وہ رخصت ہوئیں تو گھر میں سبھی کے تاثرات مختلف تھے۔ خود مجھ کو یوں لگا جیسے میرے قدموں میں جھکا آسمان یکا یک بلند ہو گیا ہو۔ میری دسترس اور پہنچ سے دور نکل گیا ہو۔ دادو دوسرے لوگوں کی پہنچ سے تو پہلے ہی دور نکل گئی تھیں۔ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ان دروازوں جیسے ہوتے ہیں جو چاہنے کے باوجود بھی سب پہ نہ کھلتے ہیں، نہ اندر جانے کی راہ دیتے ہیں۔

چند سال قبل دادو جب ہمارے گھر آئیں تو یہ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ چونکہ تازہ تازہ بند ہوا تھا۔ کواڑ ابھی زنگ آلود نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے تھوڑی محنت اور مسلسل کوشش سے میں اس کو اس قدر کھولنے میں کامیاب ہو ہی گئی کہ جس سے اندر جھانکا جا سکتا ہو۔ اندر ایک سنسانی اور ویرانی کا عالم تھا جہاں کوئی خواہش زندہ تھی نہ آرزو باقی تھی۔ حالانکہ سنا ہے خواہشیں تو زندگی ہیں۔ نہ ان کا کوئی اول ہوتا ہے نہ آخر۔ انہی سے زندگی لگتی ہے۔ یہ نہ ہوں تو زندگی بھی خالی ہو جاتی ہے۔

ابو، دادو کا ہاتھ پکڑے جب گھر لوٹے تھے تو ہم سب کو ایک جانب لے جا کر کہا تھا: ''دیکھو! دادو کی یادوں کا خزانہ چوری ہو گیا ہے۔ دل کے گوداموں میں اب سب بوریاں خالی پڑی ہیں۔ تم ان کو بھر سکو تو بہت خوش کن بات ہوگی۔ مگر ان خالی بوریوں کو ٹٹولنے مت بیٹھ جانا۔'' چند ماہ بعد اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کھانے سے فارغ ہوئے تو دادو نے ابو سے کہا:

''بیٹا عبدالباسط! میرا بڑا جی چاہنے لگا ہے کہ تیری یہ رانو، پھولوں کی طرح ہنکے اور کسی بے فکری چڑیا کی طرح چہکے۔ اس کے اندر بڑی ہی محبتی روح ہے۔ یہ چھوٹی اور ناتواں ہو کر بھی حکم چلانا اور دلوں کو گرمانا جان گئی ہے۔ کوئی زور نہ زبردستی، لیکن اپنی خدمت اور محبت سے یہ حکمرانی کرتی ہے۔ نئے دور میں تراشے ہوئے لب و رخسار اور شفق رنگ رنگت سے زیادہ اسی سانچے میں ڈھلی لڑکیاں راج کریں گی۔''

دادو اتنی ہی اچھی تھیں جیسی ان کی بات۔ پھر وہ راج کیوں نہ کر سکیں؟

ممکن ہے اس لیے کہ بھارت کے شہر گرداسپور سے پاکستان آتے ہوئے ان کے میاں، اپنی بیوی اور بچوں کو شمشوں اور ہندوؤں کے گھڑسوار جتھوں سے بچاتے ہوئے اپنی جان ہی ہار بیٹھے تھے۔ جس کے سر کا سائیں نہ رہے، وہ بھلا کیا راج کرتی، کس کے سر پر کرتی؟

ہاں ایک بیٹے کا آسرا تھا۔ عبدالباسط، بھئی اپنے ابو کی بات کر رہی ہوں۔ دادو کی عجیب عادت تھی کہ وہ نام پورا بلاتی تھیں حتیٰ کہ گھر کے کام کاج والے حسینے کو بھی غلام حسین کہہ کر بلاتی تھیں اور نامعقول آواز کو سن کر یوں لپکتا تھا جیسے پٹرول کو دیکھ کر شعلہ لپکتا ہے۔ نوکر سمجھدار ہو تو گھر والوں سے تنخواہ کے علاوہ عزت بھی پاتا ہے۔ حسینا..... معاف کیجیے! غلام حسین بھی اسی قبیلے سے تھا۔ ایک روز کیا ہوا کہ ہم لوگ باہر لان میں بیٹھے تھے۔ دادو کی آواز آئی تو ابو تیزی سے لپکے۔ امی نے روکا بھی کہ حسینے کو بلا رہی ہیں۔ ابو کے بغیر بولے:

''بابا! وہ پہلے میری ماں ہیں۔ جب میں گھر پہ ہوں پھر ان کی بات سننا میرا حق ہے۔ فرض والی بات تو الگ ہے۔ غلام حسین تو میرے کہنے پہ ان کی خدمت کرتا ہے نا۔''

دادو ہمارے گھر آ کر بڑی شانت ہو گئی تھیں۔ ہلکی پھلکی، مطمئن۔ شاید گھر کہتے ہی اس کو ہیں جہاں آدمی مطلوب ہو..... محبوب ہو..... جن کے درود یوار کے درمیان اس کا وزن ہی نہ ہو، وہ اس کا گھر کیونکر ہو سکتا ہے۔

یہ گھر ہی تو ہوتا ہے، جہاں ساتھ ساتھ جیا جاتا ہے۔ ایک ساتھ دھوپ اور ایک ساتھ بارش سہی جاتی ہے۔ جہاں

کسی کی آہٹیں پہچانی جائیں۔ اس کے چہرے پہ آئے رنگوں کو پہچانا جائے۔ گھر کو محبت کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں یہ دولت ہو، وہاں تیور ہی اور ہوتے ہیں۔

دادو جس گھر میں عمر بھر رہیں، وہ ان کا اپنا گھر تھا۔ مگر چھ بیٹیوں کی شادیاں کیں اور ساتویں کو اسی گھر میں آباد کر دیا۔ آخری کئی سال وہ اپنے گھر میں مہمان ہو گئیں۔ مالکن سے مہمان اور وہ بھی غیر مطلوب، تو پھر دل بھر بھر کیوں نہ آئے۔ لیکن کمال بات یہ تھی کہ دادو نے ہمارے ہاں آ کر بھی اپنے گھر کو یاد نہیں کیا۔ اپنا گھر، محلہ، شہر، ہر ایک یاد کا پورا جہان ہوتا ہے۔

یادوں کا کیا ہے، یاد رکھی جائیں تو ہر بات ایک یاد ہے اور انہی سے زندگی عبارت ہے۔ کچھ لوگ تو یادوں کو ہی زندگی بنا لیتے ہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ یادیں کل زندگی نہیں..... زندگی یادوں سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ نئے گھر میں یادیں، ماحول اور پذیرائی سے جڑی ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے پل اور نقش ماند پڑ جاتے ہیں۔ بھول جاتے ہیں اور کبھی ایک لمحے کی بات کانٹا بن کر باقی زندگی، رگِ جاں کو جلائے رکھتی ہے۔ تلملائے رکھتی ہے۔ زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ چبھن باقی رہتی ہے۔

دادو کی گود میں مجھے کم ہی بیٹھنے اور لیٹنے کا موقع ملا۔ مگر وہاں بہت گداز اور مضاس بہت تھی۔ ایک روز وہ کہنے لگیں:

''رانو! تجھے پتا ہے گرداسپور میں ہمارا کتنا بڑا گھر تھا۔ حویلی تھی۔ زنان خانہ الگ، مردان خانہ الگ، نوکر چاکر، ڈھور ڈنگر، تیرے دادا کو لوگ ملنے آتے۔ فیصلوں کے لیے بلاتے۔ وہیں چہ مولا نے مجھے سات بیٹیاں اور ایک بیٹا دیا۔ سبھی مبارکیں دینے آئے کہ یہ بیٹا بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔ تو میں نے کہا تھا، نا جی ناں سہارا صرف رب سوہنے کا..... یہ بیٹا تو اس کی امانت ہے۔ یہ ''جین جوگا'' ہماری خوشی ہے۔ ہماری آبرو اور سہارا بننا..... یہ تو اس کی اپنی مرضی ہے۔ کسی کے کہنے سمجھانے سے کوئی تھوڑا بڑا بنتا ہے۔

میں نے بات سنتے سنتے پوچھ لیا۔ ''دادو! وہاں کے گھر اور لوگ اب یاد آتے ہیں؟'' بولیں ''میری جان! گھر یاد ملک، عمارتوں سے یاد نہیں آتے..... مکینوں سے یاد آتے ہیں۔ اگر وہاں من بھاتے لوگ ہوں تو وہی جگہ جنت مکاں لگتی ہے۔ اس کی ہوائیں، موسم، تاریخ سبھی دل کو بھاتا ہے۔ اپنا لگتا ہے۔ ورنہ خالی اینٹیں، روڑے اور وہ کس کام کا..... اس حویلی میں اب کوئی چوڑا رہے یا چمار..... میرے سر کا سائیں تو انھوں نے چھین لیا تھا۔ ہم نے تو حویلی ویسے بھی ان کو دے دی تھی، سارے مال اسباب کے ساتھ۔ بس ان ظالموں کی تسلی نہیں ہوئی۔ انھوں نے بچوں کے سامنے ان کے باپ کو بلموں پر رکھ لیا۔ اس بیٹھتی نے بھی نہ زاری کی نہ بھاگا بلکہ ہمیں جانے کا کہہ کر خود ان کا ہدف بنا دیا۔ ان عقل کے اندھوں نے اپنے ہی پرانے سنگی ساتھی کو مار دیا۔ بعد میں کسی نے بتایا تھا کہ تمھارے دادا جنتی کو انھوں نے جلتی چتا میں ڈال دیا تھا اور بہت سے لوگوں کی طرح۔'' تب دادو نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔ ''جہاں لالچ اور نفرت کی آگ لگی ہو وہاں صرف آگ ہی نظر آتی ہے۔ جلنے والی چیزوں کا وجود کب رہتا ہے۔ دھوکا ہو یا دکھ، تب ان کا صدمہ اور بھی زیادہ اور شدید ہوتا ہے جب انسان ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہ ہو۔ کئی صدمے کے نتیجے میں جان ہی بار دیتے ہیں۔''

دادو اپنے بچوں کو لے کر کھیتوں کھلیانوں سے ہوتی قریبی گاؤں تک پہنچ گئیں، جہاں اپنی جان و مال کے خوف سے لرزاں و ترساں مخلوق ایک قافلہ بنی بیٹھی تھی۔ اتنے لوگ اور اس سے زیادہ خوف۔ نہ کوئی رہبر، نہ محافظ۔ نہ وہاں ٹھہر سکتے تھے، نہ چل سکتے تھے۔ اسی عالم میں دشمن نے پہلا وار کیا اور آدھے سے زیادہ قافلے کو خاک کا حصہ بنا دیا۔ باقی لوگ زندگی کی تلاش میں بھاگے اور سڑکوں پگڈنڈیوں سے بچتے، جنگلوں، ویرانوں سے ہوتے، نئے ملک کی نئی سرحد کی تلاش میں دن رات چلتے رہے۔

چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ، کھانے پینے کی چیزوں سے محرومی، بلکتے اور روتے بچے بھی قافلے کے آگے بڑھتے قدموں کو نہ روک سکے۔ کوئی زیادہ بیمار

ہوجاتا، کوئی زخموں کے باعث چلنے سے معذور ہوجاتا تو قافلے والے اپنی زندگیوں کے لالچ میں، اسے وہیں ویرانے کی نذر کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ انہی راستوں پہ انھیں بے شمار آدھ کھائی لاشیں ملیں۔ لٹے قافلوں کے ہجرت اثر نشان اور سامان ملے۔ ان کو دیکھ کر زندگی اور پیاری لگنے لگتی۔ آزادی اور حفاظت سے نئے ملک کی سرزمین پہ پہنچنا خواب جیسا لگنے لگتا۔

ایک شام جب دل تو آگے بڑھنے پہ آمادہ تھے مگر ٹانگیں سفر کے لیے آگے بڑھنے سے قاصر ہوگئی تھیں۔ قافلے نے ایک کنوئیں کے پاس پڑاؤ ڈالا۔ بھوک اور پیاس سے بُرا حال تھا۔ چند نوجوانوں نے بھاگ کر کنوئیں سے پانی نکالا اور پھر پانی نکالنے والے بوکے کو ہی منہ لگا دیا۔ انھیں دوبارہ پانی نکال کر پینا اور قافلے کے کمزور اور ناتواں لوگوں کو پلانے کا موقع ہی نہ ملا۔ وہ پانی جس جس نے پیا، اس کی انتڑیاں کاٹتے ہوئے گزر گیا۔ وہ جو چند لمحے قبل قافلے میں سب سے جوان اور طاقتور تھے، بے جان پڑے تھے۔ ان کے ہونٹوں اور کانوں سے خون رس رہا تھا۔ اس دکھ بھرے منظر نے اتنا دہلا دیا تھا کہ سبھی اٹھ کر آگے چل دیے۔ تھوڑی دور تک جاتے ہی ایک جگہ پھر بہت سا لٹا ہوا سامان اور کٹے پھٹے جسم ملے۔ ان مرنے والوں کے زخم ابھی تازہ تھے۔

سبھی خوف سے رک گئے کہ خیال تھا مارنے اور لوٹنے والے لٹیرے زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ سانس درست ہوئے تو احساس ہوا کہ بھوک نے بُرا حال کر رکھا ہے۔ متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا تو پتا چلا کہ کئی مرنے والوں کے سامان کے ساتھ کھانے کی پوٹلیاں پڑی ہیں۔ مگر اب کے کسی میں ہاتھ بڑھا کر پوٹلی اُٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ کئی بڑے بوڑھوں نے بتایا کہ ہندو اور سکھ جتھے راستے کے ہر کنوئیں میں زہر ملاتے گئے ہیں۔ کیا خبر ان کھانوں پر بھی زہر چھڑک گئے ہوں۔ انہی بزرگوں میں سے ایک دانا نے مشورہ دیا کہ ایسا کرتے ہیں، یہ کھانا پہلے کسی بچی کو چکھا دیتے ہیں۔ کچھ ایسا ویسا ہوا تو کم سے کم قافلے کے

جیل جانا

گزشتہ دنوں میرے ایک دوست کو غلطی سے پولیس پکڑ کر لے گئی۔ یاد رہے کہ یہ غلطی میرے دوست نہیں پولیس کی تھی۔ لہٰذا اسے فوراً یعنی ۳ دن بعد چھوڑ دیا گیا۔ مجھے اس خوش قسمت پر رشک آرہا تھا جسے بلاوجہ جیل میں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی ورنہ یہاں جانے کے لیے بڑے بڑے لوگوں کو بھی گھنٹوں تقریریں، توڑ پھوڑ، مار کٹائی اور نہ جانے کیا کیا ناپسندیدہ فعل کرنا پڑتے ہیں، پھر کہیں جا کر انھیں جیل جانے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن مجھے حیرانی ہوئی کہ لوگ اسے رہا ہونے کی مبارکباد دے رہے تھے۔ حالانکہ مبارکباد تو اسے اس بات کی دینی چاہیے تھی کہ اب وہ عام آدمی نہ رہا تھا۔ کیونکہ عام آدمی جیل جاتے ہی اتنا اہم ہوجاتا ہے کہ اس کی ملاقات کے لیے کئی کئی سفارشی رقعے لانا پڑتے ہیں۔ گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر وہ جھروکوں سے جھلک دکھاتا ہے۔

جسے کسی نے کبھی آنکھ بھر کر نہیں دیکھا ہوتا، اسے دیکھتے ہی آنکھیں بھر جاتی ہیں۔ جیل جانا دراصل شرافت کی نشانی ہے۔ شریف وہ ہے جو جرم نہ کرے اور جرم ہمیشہ وہ کرتے ہیں جو جیل سے باہر ہوتے ہیں۔ بلکہ جیل تو دنیا کا وہ خطہ ہے جہاں سب سے کم چوریاں، ڈاکے اور قتل ہوتے ہیں اور پھر جیل بنانے کا اس سے بڑا فائدہ اور کیا ہوگا کہ جو بھی ملنے آئے اس سے یہ ڈر نہیں ہوتا کہ ابھی قرض مانگ لے گا۔ مجھے جب سے یہ پتا چلا ہے کہ چاند پر پانی نہیں ملتا۔ لمبی لمبی راتیں، طویل دن، سخت موسم اور سانس لینے کے لیے آکسیجن نہیں، تب سے مجھے جیل جانا تو چاند پر جانا ہی لگتا ہے۔

(ڈاکٹر یونس بٹ کی ''شیطانیاں'' سے اقتباس)

دوسرے لوگ مرنے سے بچ جائیں گے۔ اس تجویز پہ نہ کسی نے ہامی بھری نہ انکار کیا۔ مگر سب کی نظریں ایسی بچی کو ڈھونڈنے لگیں جسے قربانی کی بھینٹ چڑھایا جاسکے۔

پھر نگاہیں میری ۶/ سالہ عائشہ بی بی پر جا کر ٹھہر گئیں۔ وہ بخار سے تپ رہی تھی اور میری ٹانگ پہ سر رکھے رو رہی تھی۔ پہلے وہ دیکھتے رہے، اسے نگاہوں میں تولتے رہے پھر ایک آواز آئی ''تمھاری تو اتنی ساری بیٹیاں ہیں اور یہ تو ویسے بھی بیمار ہے۔ پتا نہیں اتنے لمبے سفر میں بچتی بھی ہے یا دم دے دیتی ہے۔ اسے.....'' اس سے زیادہ مجھ سے سنا ہی نہیں گیا۔ میں بجلی کی سی تیزی سے اس پوٹلی کی طرف لپکی، جس کا زہر میری بیمار بچی کے جسم میں آتا تھا۔ میں زور زور سے چیخ رہی تھی، بڑبڑا رہی تھی اور زمین پر گری پوٹلی سے دونوں ہاتھوں سے کھا رہی تھی۔

''میں ماں ہوں اپنے جگر کے ٹکڑے کو کیسے قربان ہونے دوں۔ تم نے زہر کی تصدیق ہی کرنی ہے ناں..... لو میں نے کھالیا۔ اب دیکھو اور انتظار کرو کہ میں زندہ بچتی ہوں یا مر جاتی ہوں۔ مگر اپنی بچی کو جو میری وارث ہے، کیسے مرنے دیتی۔''

کئی لوگ تیزی سے میری طرف بڑھے تھے تاکہ مجھے اس حماقت سے روک سکیں مگر میں تب تک آدھی پوٹلی کھا چکی تھی اور جس آدمی کے ہاتھ سے چھینی تھی، وہ ہکا بکا کھڑا دیکھ رہا تھا۔ وہ عجیب دکھ اور خوف سے بھرے لقمے تھے۔ لقمے کھا چکی تو میری آواز بند ہوگئی اور میں بے بسی اور بے چارگی سے زمین پر گر گئی۔ میری خالی اور اداس آنکھیں کسی بھی خواب اور خیال، امید اور یقین سے آزاد تھیں۔ حتیٰ کہ ان میں کوئی آنسو تھا، نہ حسرت، نہ گلہ، نہ شکوہ، نہ کوئی آس نہ امید۔ اذیت برداشت سے بڑھ جائے تو آنکھوں سے ساری آنسو ہی پی لیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔''

تب دادو نے اپنی بات یوں سمیٹی تھی جیسے کوئی چہرے پہ آئی اداسی سمیٹے۔ یا کوئی ماتھے پہ پڑے بل سمیٹ لے۔ عائشہ کو میں نے اپنا وارث مان لیا۔ ساری بچیاں بیاہ دیں مگر خود اسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اس پہ مجھے بھروسا اور مان بہت تھا۔ پھر وہ خود کلامی کے انداز میں شعر پڑھنے لگیں:

وارث نہ کر مان وارثاں دا
رب بے وارث کر ماردا ای

دادو کو میں نے بہت دفعہ یہ شعر پڑھتے دیکھا۔ ان کا رونے کو بھی بہت من کرتا مگر شاید انھیں آنسوؤں میں اپنی بیٹی کی شکل نظر آتی تھی جس کو انھوں نے زہر سے بچایا تھا اور پھر اپنا وارث بنایا تھا۔

زندگی بھر انھوں نے سب سے زیادہ محبت اس بیمار لڑکی عائشہ سے کی۔ اسے کبھی بھی ساتھ لے کر وا بگھہ چلی جاتی اور سرحد سے ذرا پہلے اُگے پھولوں اور جڑی بوٹیوں کو پیار سے دیکھتیں، کبھی آنکھوں سے لگاتی، کبھی ہونٹوں سے چومتیں پھر کہتیں ''عائشہ بی بی! کون جانے ان پھول بوٹوں کے نیچے کس کس کے بیٹے اور کس کس کی بیٹی کا خون ہے۔ کس کس کے پیٹ میں زہر بھرے لقمے ہوں اور کس کس نے زہریلا پانی پیا ہو، مجھے تو ان پھولوں میں، ان شہیدوں کے خون کی لالی اور خوشبو آتی ہے۔''

دادو کو جب گھر سے قبرستان لے جا رہے تھے تو میں نے ان کا چہرہ دیکھا تھا۔ بڑا روپ آیا تھا۔ ایسے موقعوں پہ رونا اس لیے زیادہ آتا ہے کہ آنسوؤں کی فصل اپنوں پہ بہانے کے لیے بڑی زرخیز ہوتی ہے۔ جتنی خرچ کرو اتنی اور امنڈی آتی ہے۔

دادو کے جنازے پر سبھی آئے، نہ آئی تو دادو کی وہ وارث بیٹی نہ آئی۔ اس پر جب ہم نے غصہ کیا تو ابو صرف اتنا بولے تھے ''اس پر غصہ نہ کرنا، وہ بدقسمت تو اس غصے کے قابل بھی نہیں ہے۔ دادو کی زندگی میں وہ ان کی وارث تھی، ان کی ساری محبت کی مالک۔ مگر اس بدقسمت نے سب کچھ کھو دیا۔ اب ماں کے مرنے پہ اس کی یادوں کے جنگل میں کئی آگ مدتوں اسے جلائے گی، دیر تک بجھ نہ پائے گی۔''

اس روز ابو نے پہلے بار بتایا ''جب میں دادو سے ملنے آخری بار، ان کے گھر گیا تھا تو شام ڈھلے بہت دیر ہو

چکی تھی۔ بجلی گئی ہوئی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، ہاتھ سے بجایا۔ گھماری پھوپھو سیڑھیاں پھلانگتی، بڑبڑاتی نیچے اتر رہی تھیں تو برتن گرنے کی آواز آئی۔ مجھے اندر لے جا کر اس نے لابی میں بٹھا دیا۔ موم بتی جلائی اور اوپر چلی گئی۔ اوپر جاتے قدموں کی آواز مدھم ہوئی تو ایک جملہ میرے کانوں میں پڑا۔ وہ اپنی بیٹی سے کہہ رہی تھیں:

''سائن گر گیا تو کیا ہوا۔ جلدی سے اٹھا کر پلیٹ میں ڈال لو۔ بڑی اماں کو دے آؤ، انھیں اس کی عادت ہے۔'' وہ جملہ ایسا زہر تھا جو میرے کانوں میں پڑا اور روح تک اتر گیا۔ مجھے اپنی ماں سے وہاں ہونے والے سلوک کا اندازہ ہوا اور میں یہ ٹھان کر اٹھ کھڑا ہوا کہ ماں جی کو یہاں ایک لمحے کو نہیں رہنے دوں گا۔ میں ان کے کمرے میں گیا تو وہ دروازے سے لگی کھڑی تھیں۔ آنسوان کی آنکھوں سے نکلنے کی راہ پانے والے تھے کہ میں ان کے گلے جا لگا۔ ماں جی! میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ بہت رہ لیا آپ نے یہاں اپنی وارث کے ساتھ۔ وہاں میرے علاوہ رانو بھی ہے۔ اسے بھی تو اپنی دادو کی خوشبو آنے دیں۔ اسے بھی تو اپنے سائے میں بڑا ہونے کا موقع دیں۔''

ماں جی نے تیاری کی، بیگ اٹھایا اور میرے ساتھ آگئیں۔ ایک معاہدہ سا تھا جو ہم دونوں کے بیچ ہوگیا تھا۔ آپ آپ کہ اس لمحے کا ذکر نہیں کرنا۔ میرے ساتھ ساتھ ان جملوں کا زہر ان کے کانوں میں بھی اترا تھا۔ وہ درد انھوں نے بھی سہا تھا۔

یہ دکھ اس بیٹی نے دیا تھا جس کو انھوں نے اپنا وارث بنایا تھا۔ جس کے حصے آنے والا زہر خود کھایا تھا۔ اس لیے ہوتا ہے کبھی کبھی، کچھ لوگ دکھ اور شدتِ درد سے ان دروازوں جیسے ہو جاتے ہیں جو چاہنے کے باوجود نہ کھلتے ہیں نہ اندر جانے کی راہ دیتے ہیں۔ بس خاموش اور بند ہو جاتے ہیں پھر اسی خاموشی میں ہی شہرِ خموشاں جا بستے ہیں۔''

دادو نے جانے سے چند روز پہلے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور خود کلامی کے انداز میں بولیں:

موتی کی قیمت

ایک بُرا اور بدنام شخص عمر و دان کی باتیں کر رہا تھا۔ لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا اور بولے ''بھلا اس کی باتیں کیوں کوئی سنے؟ یہ تو ایک نہایت بُرا اور بدنام زمانہ شخص ہے۔''

وہیں سقراط بھی موجود تھا۔ اس نے کہا ''لوگو! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ شخص جو قیمتی باتیں کر رہا ہے اسے غور سے سنو اور ذہن نشین کرلو کیونکہ اس شخص کی حیثیت خوط خور جیسی ہے۔ غوط خور کے ذلیل ہونے سے موتی کی قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔''

(عبدالسمیع، لاہور)

''رانو بیٹی! تیری پھوپھو نے بھی کیا قسمت پائی ہے۔ اس کی ماں تھی جس نے اس کو وارث جانا، وارث بنایا اور وہ خود بے وارثی ہوگئی۔ گھر میں ماں نہ ہو، ماں جیسی کوئی چیز تو ہو..... دعا کا دروازہ تو کھلا رہتا ہے۔ میرے آنے سے وہ نیک بخت تو اس نعمت سے بھی محروم ہوگئی۔'' پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ساتھ وہ مَنہ پڑھنے لگیں جو مجھے سینے سے لگا کر سناتا اور گایا کرتی تھیں:

بیری تے آیا بیر اے
رانو نال دکھ ونڈیا
ساڈے حصے آیا ڈھیر اے

(بیری کے درخت پر بیر لگ گئے ہیں۔ جیسے بیر بانٹتے ہیں اسی طرح میں نے رانو سے اپنا دکھ بانٹا تھا۔ اب میری قسمت دکھ کر رانو کے ہاتھ تو زیادہ کچھ نہیں لگا البتہ دکھ کا سارا ڈھیر میرے حصے میں ہی آگیا ہے۔)

ماچس کی تیلی ابھی جلی ہے۔ ایک شعلہ سا لپکا ہے اور کئی اگر بتیاں سلگنے لگی ہیں۔ دھواں اوپر جا رہا ہے اور خوشبو چاروں طرف دھیرے دھیرے سفر کر رہی ہے اور میں سوچ رہی ہوں ''بس یہی ہے دادو کی کہانی، کچھ اس سے زیادہ ہو تو مجھے بھی بتلاؤ!''

امریکی ادب

امریکا کے ممتاز افسانہ نگار کے قلم سے

معافی

ایک پولیس افسر کا دل چھو لینے والا ماجرا
اسے بہت دیر بعد اپنے "جرم" کا احساس ہوا

برنارڈ مالمود
پروفیسر عبدالسلام

کینال

سڑیٹ پر گشت کرتی پولیس گاڑی نے گرمیوں کی ایک صبح موڑ کاٹا۔ گاڑی میں بیٹھے ۴ر پولیس والوں میں سے ایک نے سڑک کنارے چلتے، سیاہ ٹوپی پہنے ایک بوڑھے کو انگلی کے اشارہ سے پاس آنے کو کہا۔ بوڑھے نے سوتی پٹی کی مدد سے ایک بڑا ڈبا اپنے کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔ دوسرا چھوٹا ڈبا ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔

''اوئے ادھر آؤ۔''

لیکن پھیری والے بوڑھے نے سُنا نہیں یا پھر وہ توجہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ بدستور چلتا رہا۔ یہ دیکھ کر ایک نوجوان سپاہی پھرتی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر کودا۔ تیز قدموں سے چلتا قریب پہنچا اور بوڑھے کے کندھے سے لٹکے ڈبے کو ٹھوکر مار تے ہوئے ہاتھوں کی پوری طاقت سے اپنی طرف یوں گھمایا جیسے وہ گھاس پھوس کا بنا ہو۔ بوڑھے پھیری والے نے حیرت اور خوف سے نوجوان پولیس والے کو دیکھا۔ بوڑھا بہت نحیف اور دبلا پتلا تھا لیکن اس کی آنکھیں بڑی روشن اور چمکدار تھیں۔ ایک لمحے کے لیے سپاہی نے اسے غور سے دیکھا پھر بولا:

''کیا تم بہرے ہو؟''

بوڑھے پھیری والے کے ہونٹ اس طرح ہلے جیسے کہہ رہا ہو کہ ہاں وہ بہرا ہے۔ مگر تھوڑی دیر بعد چلّا کر کہا

''تم نے مجھے دھکا کیوں دیا؟''

بوڑھے پھیری والے نے اپنی گرجدار آواز سے نوجوان پولیس والے کو حیرت زدہ کردیا۔ وہ بدبدا کر بولا

''جب میں نے تمھیں پکارا تو تم رکے کیوں نہیں؟''

''کب پکارا تھا؟ کیا تم نے میرا نام لیا؟'' بوڑھے پھیری والے نے چھدرے پیلے دانت بھینچ کر کہا۔

''تمھارا لائسنس کہاں ہے؟''

''کون سا لائسنس؟ کیسا لائسنس؟''

''چالاک مت بنو، پھیری لگانے کا لائسنس۔ ہم نے تمھیں چیزیں بیچتے دیکھا ہے۔''

بوڑھا پھیری والا خاموش رہا، اس نے یہ الزام نہیں جھٹلایا۔

''اس بڑے ڈبے میں کیا ہے؟''

''۱۰۰ رواٹ۔''

''کیا؟ کیا کہا تم نے؟''

''بجلی کے ۱۰۰ رواٹ والے بلب۔''

''اور دوسرے میں؟''

''۶۰ رواٹ۔''

''کیا تمھیں پتا نہیں کہ بغیر لائسنس پھیری لگانا جُرم ہے؟''

بوڑھے نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن وہاں گاڑی میں بیٹھے ادھیڑ عمر کے اونگھتے سپاہی کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ نوجوان پولیس والے نے اپنی نوٹ بک کھولی اور بولا:

''ڈبا خالی کرو۔ کہاں رہتے ہو؟''

بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''جلدی کرو، لیئو۔'' گاڑی میں بیٹھے ادھیڑ عمر پولیس والے نے چلّا کر کہا۔

''ایک سیکنڈ والٹر، یہ بوڑھا بڑا اڑیل ہے۔''

نوجوان سپاہی نے پھر پنسل سے بوڑھے کو ٹھوکا دیا۔ وہ اب بھی نیچے زمین کو تک رہا تھا۔ آخر کار وہ بولا:

''میرے پاس لائسنس بنانے کے لیے رقم نہیں۔''

''لیکن تمھارے پاس بلب خریدنے کے لیے تو رقم ہے۔ کیا تمھیں پتا نہیں کہ تم اپنی قانونی فیس ادا نہ کرکے اس شہر کے ساتھ دھوکا کر رہے ہو۔''

بوڑھے نے کوئی جواب نہ دیا۔

''بولو۔''

''جلدی کرو لیئو۔'' گاڑی میں بیٹھے سپاہی نے کہا۔

''یار تم خود یہاں آجاؤ، یہ بوڑھا بکرا تو بول کر ہی نہیں دیتا۔''

اب دوسرا پولیس والا ہولے ہولے چلتا گاڑی سے باہر آیا۔ وہ بھاری بھرکم جسامت اور بھورے بالوں والا شخص تھا۔ چہرہ پسینہ سے چمک رہا تھا۔ بولا: ''بابا! آپ اس کے سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتے؟''

بوڑھا پھیری والا جسم اکڑائے دونوں پولیس والوں کو گھورتا رہا۔ اس وقت تک وہاں کافی لوگ جمع ہوگئے تھے، لیکن لیئو نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں بھگا دیا۔

''ٹھیک ہے والٹر۔ مجھے تھکنی دو، یہ بوڑھا تھانے جائے گا۔'' نوجوان سپاہی نے فیصلہ کرلیا۔

والٹر نے نوجوان پولیس والے کو غیر یقینی انداز سے دیکھا، جیسے پوچھ رہا ہو ''کیوں؟''

''پولیس کے کام میں مداخلت۔''

لیئو نے بوڑھے کا بازو پکڑا اور چلنے کا اشارہ کیا۔ تبھی بلبوں کا چھوٹا ڈبا بوڑھے کے شانے سے گر پڑا۔ وہ اسے اٹھانے جُھکا، تو خود بھی گھٹنوں کے بل گرا۔ والٹر نے لیئو کی مدد کی اور دونوں نے بوڑھے کو گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈال دیا۔ نوجوان پولیس والے نے بڑا ڈبا کھینچ کر گاڑی کے پچھلے حصے میں رکھا۔ جیسے ہی گاڑی روانہ ہوئی، ایک دکان کے سامنے کھڑے آدمی نے چھوٹا ڈبا اٹھایا اور چلّا کر بولا: ''جناب! آپ یہ ڈبا بھولے جا رہے ہیں۔'' لیکن دونوں میں سے کسی نے آواز نہیں سنی اور بوڑھا..... وہ تو ایسے لگتا تھا جیسے سننا ہی نہیں چاہتا۔

تھانے جاتے ہوئے وہ بروک لین پل سے گزرے۔

''ایک سیکنڈ لیئو! پل پار کرنے کے بعد گاڑی موڑ کر میرے گھر کے سامنے روک دینا۔ میں پسینے میں نہا گیا ہوں۔ اب قمیص تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔''

لیئو بولا ''ابھی نہیں، پہلے ہم اس کمبخت بوڑھے کو حوالات میں بند کردیں۔''

لیکن والٹر نے اپنی بات زور دے کر دہرائی اور کہا کہ اس وقت تک بہت دیر ہوجائے گی۔ لیئو جانا نہیں چاہتا تھا لیکن آخر کار مان ہی لی۔ والٹر کا گھر پُل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دونوں نے کوئی بات نہیں کی۔ جب والٹر گاڑی سے اترا تو بوڑھے پھیری والے سے کہا ''اگر تم جرمنی میں ہوتے تو وہ لوگ تمھیں قتل کر دیتے۔ ہم تو صرف اتنی ہی قانونی کارروائی کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں تمھیں زیادہ سے زیادہ ایک ڈالر جرمانہ ہوگا۔''

تھوڑی دیر انتظار کے بعد لیئو بے چین ہوگیا اور زور زور سے ہارن بجانے لگا۔ دوسری منزل کی کھڑکی کھلی، والٹر نے زیرجامہ پہنے جھانکا اور بولا ''صرف ۵/منٹ لیئو، اپنا پسینہ خشک کر رہا ہوں۔''

کچھ دیر بعد والٹر تیز قدموں سے چلتا واپس آیا۔ گاڑی دوبارہ پل پر آئی۔ ایک جگہ بھیڑ کی وجہ سے گاڑی کو آہستہ کرنا پڑا۔ بوڑھے نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا اور پُل کے جنگلے کی طرف دوڑا۔ وہ معجزانہ طور پر مخالف سمت سے آتے ہوئے ٹرالروں اور ٹرکوں کی زد میں آتے آتے بال بال بچا۔ پھر کودتا ہوا فٹ پاتھ پر آیا اور پُل کے جنگلے پر چڑھ گیا۔ لیئو نے پھرتی کے ساتھ بوڑھے کا پیچھا کیا اور اس کے کوٹ کا پچھلا کونا پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ بوڑھا پل سے چھلانگ لگانے کو تیار تھا۔

لیئو نے جھٹکے کے ساتھ اسے زمین کی طرف کھینچا۔ بوڑھا زمین پر گرا اور اس کا سر فٹ پاتھ سے ٹکرایا۔ لوٹی اچھل کر دور جا گری۔ لیکن بوڑھا بے ہوش نہیں ہوا، زمین پر لیٹا کراہتا اور دونوں ہاتھوں سے منہ اور سینہ نوچتا رہا۔ دونوں پولیس والے حیرت زدہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے؟ اسی دوران ایک بوڑھی عورت وہاں سے گزری جو شدید گرمی کے باوجود سر پر شال اوڑھے ہوئے تھی۔ کندھے سے دبتے والی ٹوکری لٹکی ہوئی تھی جس میں پانچ سینٹ والے نمکین بسکٹوں کے ڈبے بھرے تھے۔ بوڑھی رکی تاکہ معلوم کرسکے کہ کیا ہوا ہے۔ پھر زمین پر گرے بوڑھے کو دیکھتے ہی چلّائی ''بلواسائن۔''

لیکن بوڑھے نے اس کی طرف نہیں دیکھا، وہ لگاتار اپنا سینہ پیٹتا رہا۔

''کیا آپ اس کو جانتی ہیں؟'' لیئو نے پوچھا۔

''ہاں یہ بلواسائن ہے، ہمارے محلے میں رہتا ہے۔''

''کہاں؟''

عورت نے تھوڑی دیر سوچا پھر بولی ''میرے والد کہا

کرتے تھے کہ بلواسٹائن سیکنڈ ایونیو پر واقع اشیائے صرف کی ایک بہت بڑی دکان کا مالک تھا۔ لیکن پھر اس کا کاروبار تباہ ہوگیا۔ پھر اس کی بیوی مرگئی اور لڑکی آگ میں جل مری۔ اسے کوئی لاعلاج خارش کی بیماری ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب یہ پھیری لگا کر بجلی کے بلب بیچتا ہے۔''

''کیا تمھیں اس کا پتا معلوم ہے؟''

''نہیں، لیکن اس نے کیا کر ڈالا؟''

''جو کچھ بھی اس نے کیا ہے، سزا سے نہیں بچ سکتا۔'' والٹر بولا۔

''خدا حافظ بلواسٹائن! مجھے اسکول پہنچنا ہے۔'' بوڑھی عورت نے معذرت کی۔ بسکٹوں کی ٹوکری اٹھائی اور چل دی۔ اب بوڑھے نے اپنا منہ اور سینا نوچنا بند کردیا۔ وہ سکون سے زمین پر لیٹا رہا۔ سورج کی تیز شعاؤں کے باوجود بوڑھے نے آنکھیں نہیں جھپکائی تھیں۔

''اسے جانے دو۔'' والٹر نے اپنے ساتھی سے کہا۔

انھوں نے بوڑھے کو کھڑا کیا۔ کوٹ سے مٹی جھاڑی۔ مڑی تڑی ٹوپی اس کے سر پر رکھی۔ پھر اپنی گاڑی میں بٹھایا۔ چند ہی منٹ بعد بوڑھے کو بلبوں والے ڈبے کے ساتھ ٹھیک اسی جگہ چھوڑ دیا جہاں سے پکڑا تھا۔

لیکن اُس رات جب اپنا گشت مکمل کرنے کے بعد لیو نے والٹر کو گھر کے سامنے اتارا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہی بوڑھا وہاں کھڑا تھا۔

''سنو لیو!'' والٹر نے ساتھی کو روکنا چاہا لیکن وہ تیزی سے گاڑی نکال کر لے گیا۔ اب والٹر کو تنہا ہی بوڑھے کا سامنا کرنا تھا۔ بوڑھا اپنے بلبوں والے ڈبے کے ساتھ ویسا ہی دکھائی دیا جیسے آج صبح، سوائے ایک فرق کے کہ اب اس کی ٹوپی مڑی تڑی تھی اور چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔

''تمھیں کیا چاہیے؟'' والٹر نے پوچھا۔

بوڑھے کے ہونٹ ہلے۔ اس نے بلبوں کے ڈبے کی طرف اشارہ کیا اور کہا ''میرے بلبوں کا چھوٹا ڈبا!''

''کیا؟ کیا ہوا اس کو؟''

''کہاں ہے؟ کیا کیا تم نے اس کا؟؟''

والٹر نے تھوڑی دیر غور کیا تو اسے بوڑھے کا چھوٹا ڈبا یاد آگیا۔

''تمھیں یقین ہے کہ تم نے اسے کہیں اور نہیں چھپایا؟'' والٹر نے سختی سے پوچھا۔

بوڑھے نے والٹر کی طرف دیکھا تک نہیں اور خاموش کھڑا رہا۔

والٹر کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ بولا ''ٹھیک ہے، ہم کوشش کریں گے اسے تلاش کرنے کی۔ لیکن پہلے میں رات کا کھانا کھانا چاہتا ہوں، مجھے سخت بھوک لگی ہے۔''

والٹر زینے پر چڑھا۔ وہ مڑ کر بوڑھے سے کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن اوپر سے بیوی آئی تو وہ ٹوپی اُتار کر اس کی طرف مسکرایا اور اندر داخل ہوگیا۔ کھانے کے بعد والٹر کی خواہش تھی کہ وہ تھوڑی دیر آرام کرتے ہوئے ریڈیو سنے لیکن اس نے وردی اتار کر گھر کے کپڑے پہنے اور بیوی سے کہا کہ وہ قریب ہی جا رہا ہے۔ اس کے سینے پر بوجھ سا تھا۔ بوڑھا ٹھیک اسی جگہ موجود تھا جہاں اس نے چھوڑا تھا۔

''چلو، میری گاڑی گیراج میں ہے۔''

بوڑھا اپنے ڈبے کے ساتھ والٹر کے پیچھے پیچھے آگیا۔ گیراج میں والٹر نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بوڑھے نے اپنا ڈبا گاڑی کے پچھلے حصہ میں رکھا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ والٹر گاڑی چلاتا، پُل پار کرتا اس جگہ آیا جہاں صبح انھوں نے بوڑھے کو اٹھایا تھا۔ گاڑی کھڑی کی، باری باری سامنے کی تینوں دکانوں میں گیا اور اپنا پولیس کارڈ دکھاتے ہوئے دریافت کیا کہ کسی نے بوڑھے کا ڈبا تو نہیں دیکھا؟ کسی کو بھی اس کا علم نہیں تھا، سوائے تیسری دکان کے ایک کلرک کے۔ اس نے بتلایا کہ شاید ڈبا محلے کے ایک شخص کے پاس ہے۔ کلرک نے اس شخص کا پتا دیا۔ یکدم اسے ایک خیال آیا اور اس نے تھانے فون کرکے کلرک سے پوچھا کہ وہاں بلبوں کا کوئی چھوٹا ڈبا تو نہیں؟ کلرک نے جواب دیا کہ آج اس نے کوئی ڈبا وصول نہیں کیا۔ واپس آکر والٹر نے بوڑھے سے پوچھا کہ ڈبے میں کتنے بلب تھے؟

"۵/۵ درجن۔"

"کیا قیمت ہوئی؟ قیمت خریدتھوک میں۔"

"۸/سینٹ۔"

"اس کا مطلب ہوا ۴/ڈالر ۸۰/سینٹ۔" والٹر نے پھر بٹوہ سے ۵/ڈالر کا نوٹ نکالا اور بوڑھے کے حوالے کیا لیکن اس نے اُسے قبول نہیں کیا۔

"کیا چاہتے ہو خبیث بڈھے؟" وہ خفگی سے بولا۔

"میرا چھوٹا ڈبا!"

"میرا خیال ہے تمھیں گاڑی میں گھومنے کا شوق ہے۔"

کار پھر چل پڑی۔ والٹر نے کلرک کے دیے ہوئے پتے پر گاڑی روکی۔ لیکن وہاں کسی کو اس شخص کے بارے میں علم نہ تھا جس کے پاس بلیوں کا ڈبا دیکھا گیا۔ آخر کار نیکر پہنے ایک گنجا شخص اوپر کی منزل سے آیا اور والٹر سے کہا کہ اسے جس شخص کی تلاش ہے، وہ اس کا چچا ہے۔ والٹر نے چچا کو یقین دلایا کہ کوئی سنگین معاملہ نہیں۔ اتفاقاً اس کا بھتیجا بلیوں کے ایسے ڈبے کے متعلق معلومات رکھتا ہے جو غلطی سے سڑک پر رہ گیا تھا۔ چچا نے بتایا کہ اس کا بھتیجا ایک کلب میں موجود ہوگا۔ لیکن وہ کلب کا پتا اسی صورت میں دے سکتا ہے جب معاملہ سنگین نوعیت کا ہو۔ والٹر کو جو پتا ملا وہ شہر کے شمالی حصے کا تھا، یعنی وہاں سے کئی میل دور!

"اوخدایا! یہ تو میں بے وقوفوں والی حرکتیں کر رہا ہوں۔" والٹر بڑبڑایا۔ گاڑی کی طرف آتے ہوئے والٹر نے سوچا کہ اگر وہ کام سستی سے کرے تو شاید بوڑھا عاجز آ کر خود ہی دفع ہو جائے۔ لہٰذا اس نے ایک ریستوران کے سامنے گاڑی روکی اور کافی پینے لگا۔ اسی دوران ٹی۔ وی پر دس راؤنڈ کی مکمل کشتی بھی دیکھی۔ وہ پیسے میں شرابور باہر آیا۔ لیکن بوڑھا اسی طرح گاڑی میں موجود تھا۔ والٹر اپنی بغل کھجانے لگا۔

"مچھلی کے لیے کون سی چیز مفید ہے؟" والٹر نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بوڑھے سے دریافت کیا۔

بوڑھے نے کوئی جواب نہ دیا، بس سامنے گھورتا رہا۔

اب وہ بڑے اطمینان سے گاڑی چلا رہا تھا۔ آخر کلب جا پہنچا جہاں اب بھی رقص جاری تھا۔ اُس نے نکٹ کلرک سے بھتیجے کے متعلق معلوم کیا۔ نکٹ کلرک نے جواب دیا کہ اس نام کا کوئی شخص کلب میں موجود نہیں۔

"کوئی سنگین بات نہیں، سوائے اس کے اسے بلیوں کے ایسے ڈبے کے بارے میں علم ہے جس کا مالک میری گاڑی میں بیٹھا ہے۔" والٹر نے کہا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔" کلرک بولا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔"

والٹر پھر چند منٹ دروازے میں کھڑا رقاصوں کو دیکھتا رہا لیکن وہ وہاں کسی کو پہچان نہ سکا۔ وہ واپس چلا آیا۔

"تم ابھی تک موجود ہو؟" والٹر نے پوچھا۔

بوڑھا گم سم اسے گھورتا رہا۔

اب والٹر نے اپنی گاڑی چھٹی ایونیو پر واقع ایک ریستوران کے سامنے روکی اور نیا مشروب خریدا۔ گاڑی میں واپس آ کر مشروب کا ایک لمبا گھونٹ بھرا اور بولا "پیو گے؟"

بوڑھا بلوا سائن گاڑی کی پچھلی نشست پر خیف اُلو کی طرح پیاسا بیٹھا تھا۔ اس نے گھور کر والٹر کو دیکھا لیکن ہاتھ نہیں بڑھایا۔ گاڑی کافی دیر تک اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ والٹر دیر تک اسٹیرنگ ویل پکڑے محویت کے عالم میں بیٹھا رہا۔ ٹھیک اس لمحے جب اسے کوفت محسوس ہوئی تو اسے ایک خیال آیا۔ اسے وہ اتنا بھایا کہ فوراً گاڑی چلائی اور شہر کی طرف مڑ گیا۔ وہ شہر کے اس علاقے میں پہنچا جہاں رات کے وقت بھی دکانیں کھلی رہتی تھیں۔ اس نے گاڑی ایک دکان سے تقریباً ٹکرا ہی دی۔ ۱۰/منٹ بعد وہ ایک ملفوف ڈبے کے ساتھ واپس آیا جس میں ۶۰/واٹ کے ۵/درجن بلب تھے۔

"مفت کی تفریح ختم ہوئی دوست۔" وہ بولا

بوڑھا بھیری والا گاڑی سے باہر آ گیا۔ والٹر نے بڑا ڈبا نکال کر سڑک کنارے رکھے چھوٹے ڈبے کے ساتھ رکھا اور تیزی سے گاڑی دوڑا لے گیا۔ پل پر گاڑی چلاتے ہوئے والٹر نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ وہ سونے کے لیے بے چین تھا کیونکہ دوسرے دن صبح ۶/بجے کام پر

جانا تھا۔ والٹر نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی اور زینہ پھلانگتا مکان میں داخل ہوا۔ وہ گھر میں بہت احتیاط سے چل رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے اور بیوی کو جگانا نہیں چاہتا تھا۔

کپڑے تبدیل کرنے کے بعد جب وہ بستر میں لیٹا تو گرمی کے باوجود اسے اپنا جسم برف کی طرح سرد محسوس ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور کھڑکی کے نزدیک کھڑا ہوگیا۔ خاموش سڑک چاندنی میں بھیگی ہوئی تھی۔ درختوں کے سیاہ سائے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ اچانک مکان کے سامنے والے درخت کے سائے میں اسے ایک ٹیڑھا میڑھا بھدا سایہ نظر آیا۔ والٹر نے اپنا چغا اور چپل پہنے اور دوڑتا ہوا نیچے آیا۔

"اب کیا بات ہوئی؟" اس نے دریافت کیا۔

بوڑھا بلوا سائن سڑک کے کنارے کھڑا اسے گھورتا رہا۔

"اب کیا چاہیے؟"

بوڑھا دوبارہ خاموش رہا۔

"بہتر ہوگا بلوا سائن کہ تم اب یہاں سے چلے جاؤ۔ مزید گڑبڑ کے لیے رات کا یہ پچھلا پہر موزوں نہیں۔ تمھیں تمھارے بلب مل گئے، بہتر ہوگا کہ تم اپنے گھر جاؤ اور میرا پیچھا چھوڑو۔ مجھے پولیس بلانے سے نفرت ہے۔ جاؤ اپنے گھر۔"

والٹر اُکڑاتے ہوئے زینہ چڑھ کر اوپر آیا۔ اس نے اپنے کمرے میں بیٹے کے کراہنے کی آواز سنی۔ اب والٹر لیٹنا تو جلد ہی سو گیا۔ لیکن پھر بارش کی آواز سن کر جاگ اٹھا۔ کھڑکی پر آ کر اس نے نیچے دیکھا، بوڑھا بارش میں کھڑا بدستور موجود تھا۔ اس نے اپنا چہرہ اوپر کھڑکی کی طرف اٹھا رکھا تھا۔ والٹر کو وہ چہرہ اتنا نزدیک لگا جیسے کھڑکی کی سِل پر رکھا ہو۔

والٹر اندر دوڑا۔ اس نے الماری سے چھتری تلاش کی جو اسے نہ مل سکی۔ اسی دوران بیوی جاگ گئی۔ وہ بلند سرگوشی میں بولی "کون ہے؟"

وہ بے حرکت کھڑا رہا۔ بیوی نے ایک منٹ انتظار کیا اور پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ چھتری نہ ملنے پر اس نے ایک پرانا کمبل نکالا اور کھڑکی کے پاس آ کر بوڑھے کی طرف اچھال دیا۔

والٹر پھر واپس خواب گاہ میں مصمم ارادہ کر کے آیا کہ اب کئی گھنٹے لگاتار سوئے گا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے محسوس کیا کہ بارش تھم چکی۔ وہ بوڑھے کو دیکھنے اُٹھا۔ کمبل ٹھیک اسی جگہ سڑک کے کنارے پڑا تھا جہاں اس نے پھینکا تھا۔ بوڑھا بلوا سائن بھی درخت کے نیچے اسی طرح موجود تھا۔ والٹر سلیپر پہنے نیچے آیا۔ اب گرمی کا زور م ہوگیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ درخت کے پتے ہوا کے ساتھ کانپ رہے تھے۔

"بلوا سائن!" والٹر نے پکارا۔ اسے اپنی آواز کانپتی محسوس ہوئی۔ پھر اسے اپنے اندر خالی پن کا احساس ہوا۔ سڑک کنارے چلتے ہوئے والٹر نے تمام دن کی باتوں پر غور کیا، پھر اپنا سر اٹھایا اور نرمی سے بولا:

"بلوا سائن! تمھاری معافی مجھ پر قرض ہے۔ مجھے دلی افسوس ہے کہ یہ سارا واقعہ رونما ہوا۔ میں اب تک سو نہیں سکا..... میں تم سے دلی معافی چاہتا ہوں۔"

بلوا سائن نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے جن میں چاند چمک رہا تھا، اسے گھور کر دیکھا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ والٹر کو ایسا محسوس ہوا کہ بوڑھے کا جسم اور اس کا سایہ بھی ڈھیلا پڑ گیا۔ والٹر نے بوڑھے کو الوداع کہا اور پھر اپنی خواب گاہ میں چلا آیا۔

"کیا بات ہے؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

بیوی نے دوسری طرف کروٹ لی اور بولی "سنی کو مت جگانا۔"

"اچھا۔"

والٹر کچھ دیر لیٹ کر پھر اٹھا اور کھڑکی کی طرف گیا، نیچے سڑک کی طرف دیکھا اور سکون کا سانس لیا۔

وہ بڑبڑایا "ہاں چلا گیا۔" بوڑھا بھیری والا بجلی کے بلبوں والے ڈبے کے ساتھ مع کمبل اب وہاں موجود نہ تھا۔

والٹر نے دوبارہ سڑک کو دیکھا لیکن چاندنی سے روشن لمبی سڑک اسے اس سے پہلے کبھی اتنی سنسان نہیں لگی تھی۔

یورپی ادب

ایک منصوبہ ساز کے ذہنِ رسا کا ماجرا

گڑھا

اُس نے بہت دُور کی سوچی تھی
پل پل بدلتی، وسوسوں بھری ایک آرزش کی کہانی
وہ مایوسی بھرے حالات میں بھی فیصلے کرنے پر قادر تھا

فریڈرک فورسیتھ
ڈاکٹر افتخار حسین جعفری

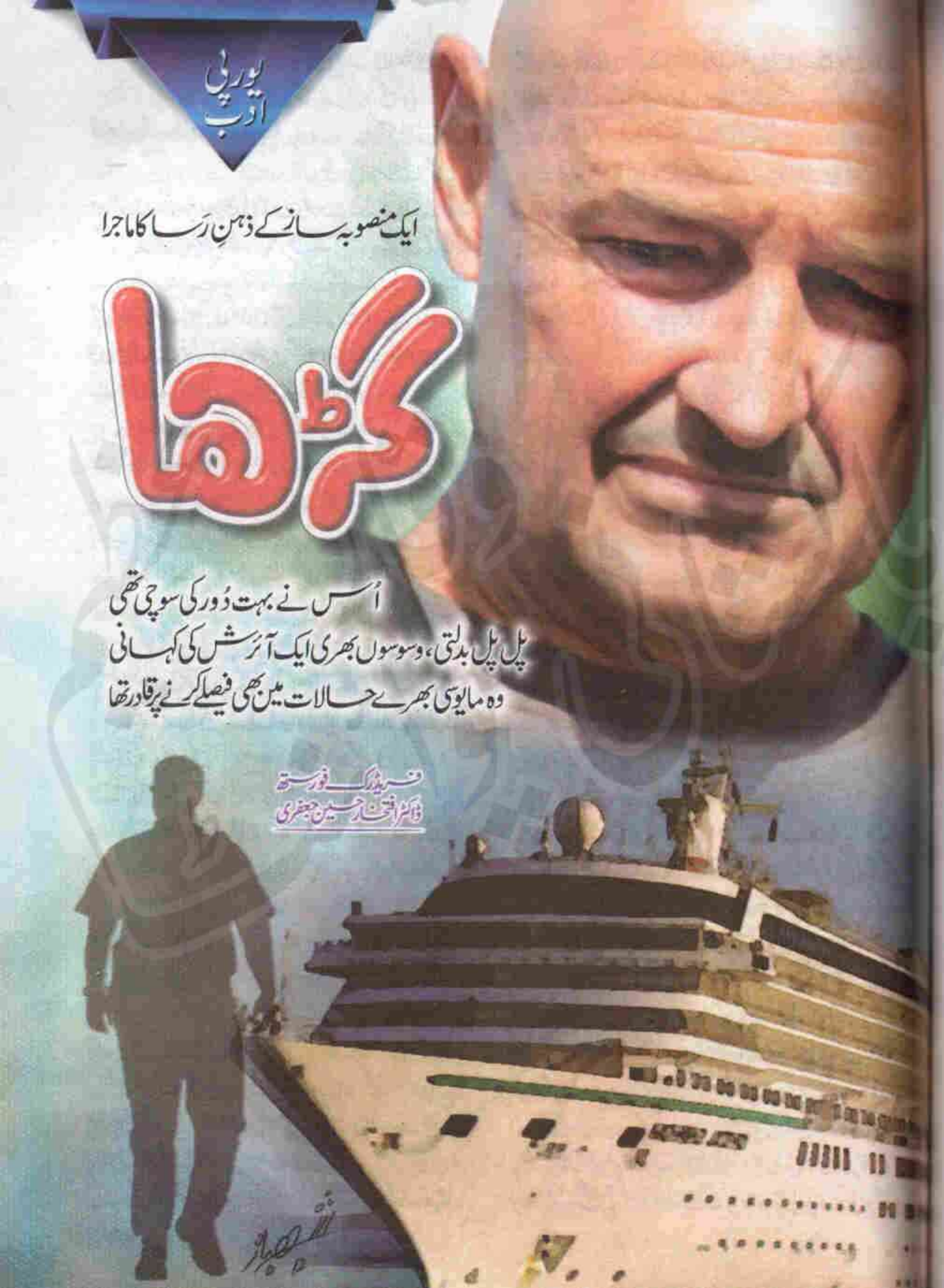

سینٹ

کلین لیلیک بڑا بحری جہاز تھا جو تھیم کی بندرگاہ لی ہاروے سے آئرلینڈ پہنچا۔ اس کی کئی منازل تھیں۔ مسافروں کے علاوہ ان کی کاریں اور بڑے ٹریلر والے ٹرک بھی اس میں موجود تھے۔ لیام کلارک ایک ایسے ہی ٹرک کا ڈرائیور اور یورپ سے آئرلینڈ سامان پہنچانے والی کمپنی مائیرا میں ملازم تھا۔ لیام کی گھڑی میں دوپہر کے ۲ بجے تھے۔ وہ اس خیال سے خوش تھا کہ جلد ہی ڈبلن میں اپنے خاندان سے ملنے والا ہے۔ ڈھائی بجے جہاز بندرگاہ پہنچ گیا۔

وہ دو منزل نیچے اتر کر اپنے ٹرک میں آ بیٹھا تاکہ جیسے ہی جہاز کا دروازہ کھلے، وہ بندرگاہ میں داخل ہوجائے۔ کاؤنٹی ویکسفورڈ ایک اہم بندرگاہ تھی جہاں یورپ اور برطانیہ کے بحری جہاز آتے تھے۔ جیسے ہی لیام سے آگے والے دو ٹرکوں نے انجن چلائے، اس نے بھی اپنا ٹرک چالو کردیا۔ جلد ٹرک باہر آیا اور کسٹم دفتر کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس نے اتر کر سامان کے کاغذات کسٹم افسر کے حوالے کیے۔ افسر معاینہ کرنے لگا۔

ایک سے دوسرے ملک سامان لانے لے جانے کے لیے اس کے پاس تمام ضروری کاغذات موجود تھے۔ مثلاً لائسنس، بیمہ، ڈیوٹی کی رسید اور پرمٹ وغیرہ۔ کسٹم افسر نے کاغذات دیکھ کر لیام کے حوالے کیے تو اس کی نظر گاڑی کے نیچے پڑی۔ اس نے پوچھا ''یہ کیا ہوا ہے؟''

لیام نے بھی جھک کر گاڑی کے نیچے دیکھا۔ وہاں تیل گرنے سے ایک بڑا نشان نظر آیا جو پھیلتا جارہا تھا۔ تیل تیزی سے پھیل رہا تھا۔ لیام نے ٹرک کے نیچے گھس کر معاینہ کیا۔ انجن کے اندر نصب لوہے کا پائپ ٹوٹ گیا تھا۔ وہیں سے انجن کا تیل گر رہا تھا۔ لیام باہر آیا اور کسٹم افسر سے کہا ''یہ تو بڑا مسئلہ ہوگیا۔ مجھے ڈبلن اپنے صدر دفتر فون کرکے اطلاع دینی ہوگی۔ وہاں سے کاریگر پرزہ لے کر آئے گا۔ پھر مرمت ہوگی۔''

دفتر میں فون پر بات نہ ہوسکی۔ عملہ کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ لیام نے انتظار کیا۔ تقریباً ۳ بجے فون ملا۔ اس نے کمپنی کے منیجر کو سارا مسئلہ بتایا۔ منیجر نے کہا ''میں پرزہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

وقت گزرتا گیا۔ شام ۶ بجے اسے بتایا گیا کہ پرزہ مل گیا ہے لیکن کاریگر صبح روانہ ہوکر ۱۲ بجے تک اس کے پاس پہنچے گا۔ لیام کو اب رات اسی شہر میں گزارنی تھی۔ اس نے ایک چھوٹے ہوٹل میں کمرا لیا اور اپنے گھر فون کردیا کہ وہ اب کل ڈبلن پہنچے گا۔ رات کا کھانا کھا کر وہ آرام سے سوگیا۔ اگلی صبح ۱۰ بجے بندرگاہ جا پہنچا۔

تھوڑی ہی دیر میں کاریگر بھی پہنچ گیا۔ اس نے فوراً کام شروع کردیا۔ پرزہ تبدیل کرنے میں تقریباً ڈھائی گھنٹے لگے۔ اس دوران لیام نے بھوک محسوس کی اور وہ کھانا کھانے چلا گیا۔

اسی دوران سینٹ پیٹرک نامی بحری جہاز بندرگاہ کے نزدیک پہنچا۔ بندرگاہ سے کچھ دور ریت کے ٹیلے پر لیٹا ہوا ایک شخص، مرفی دوربین کی مدد سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی بریڈن سے کہا ''سینٹ پیٹرک بالکل صحیح وقت پر پہنچ گیا۔''

بریڈن نے کہا ''مرفی! کیا ہم لوگ یہ واردات کر سکیں گے؟''

مرفی ایک جرائم پیشہ شخص تھا۔ اس نے کہا ''میں نے احتیاط سے منصوبہ بندی کی ہے۔ ہم لوگ ضرور کامیاب ہوں گے۔ آنے والا جہاز اب بندرگاہ سے تھوڑے فاصلے پر ہی ہے۔

اُدھر کاریگر نے لیام کے ٹرک کا کام ختم کیا اور کہا ''اب اس میں تیل دوبارہ بھر دو۔ پھر تم روانہ ہوسکتے ہو۔''

تھوڑی دیر بعد سینٹ پیٹرک بندرگاہ پہنچ گیا۔ مرفی نے دوربین کی مدد سے دیکھا کہ باہر نکلنے والا پہلا ٹرک ٹریلر بھورے رنگ، جبکہ دوسرا سفید رنگ کا ہے۔ مرفی نے کہا ''یہ سفید ٹرک ہمارا شکار ہے۔ جب یہ باہر نکلے گا تو ہم اس کا پیچھا کریں گے۔''

جہاں لیام کا ٹرک کھڑا تھا، وہیں مائیرا کمپنی کا وہ دوسرا ٹرک بھی آ کھڑا ہوا جو ابھی سینٹ پیٹرک سے باہر آیا تھا۔ کسٹم آفیسر نے لیام کو اشارہ کیا کہ تم روانہ ہوجاؤ ورنہ یہاں ہجوم ہو جائے گا۔ لیام نے اپنی کمپنی کے ڈرائیور کو ہاتھ ہلایا اور ٹرک چالو کرکے بندرگاہ سے باہر نکل آیا۔

مرفی نے جیسے ہی اس کا ٹرک دیکھا تو بولا ''ارے یہ تو بہت جلد باہر آگیا۔ خیر ہمیں کیا؟ بریڈن! اس ٹرک میں فرانسیسی برانڈی کے ۷۵۰ کریٹ موجود ہیں۔ اس کا مطلب ہے بہترین برانڈی کی ۹۰۰۰ بوتلیں۔ اگر ہمیں ۴ پونڈ فی بوتل بھی ملیں، تو سوچو، کتنی ساری رقم ہاتھ آئے گی۔''

دونوں آدمی اٹھے اور نیچے اتر کر اپنی کار کے پاس پہنچے جو دو روز قبل چرائی گئی تھی۔ اس کی نمبر پلیٹ بھی تبدیل کر دی گئی تھی۔ دونوں لیام کے ٹرک کا تعاقب کرنے لگے۔ جب ٹرک ڈبلن روڈ پر مڑا تو مرفی نے کہا ''اب مجھے فون کردینا چاہیے۔''

اس نے سڑک کنارے لگے ایک فون بوتھ سے اپنے ۲ ساتھیوں کو فون کیا اور کہا ''ہم ٹرک کے پیچھے آرہے ہیں۔ تم دونوں مقررہ مقام پر پہنچ جاؤ اور ٹرک کا انتظار کرو۔''

مرفی اور بریڈن آئرش پولیس کی وردی میں ملبوس تھے۔ راستے میں ایک جگہ رک کر مرفی نے بہ سرعت سیاہ رنگ کی کار کی چھت پر پولیس کا نشان مقناطیس کی مدد سے لگالیا۔ دور سے دیکھنے والے کو یہی لگتا کہ ہائی وے پولیس کی کار میں دو افسر بیٹھے ہیں۔ ٹرک کا تعاقب جاری رہا۔ ایک نسبتاً کم آمدورفت والے مقام پر ''پولیس کار'' ٹرک کے برابر آگئی۔ مرفی نے ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا اور کہا ''تمھارے ٹرک کا پچھلا پہیہ نکلنے والا ہے۔ ٹرک ایک طرف روکو۔''

لیام نے ٹرک روکا اور نیچے اتر کر پیچھے کی جانب چلا۔ مرفی اس کے ساتھ تھا۔ اچانک جھاڑیوں سے دو نقاب پوش نکلے اور لیام کو ہاتھوں اور پیروں سے پکڑ جھاڑیوں میں لے گئے۔ مرفی نے اس کا منہ دبا لیا تھا۔ چند منٹ میں اس کی وردی اتار دی گئی۔ منہ، آنکھوں، ہاتھ اور پیروں میں پلاسٹک ٹیپ لگا دیا گیا۔ مرفی کے ایک ساتھی نے اس کی وردی پہنی، ٹوپی لگائی، پھر لیام کے کاغذات اپنی جیب میں رکھے اور ٹرک پر بیٹھ گیا۔ مرفی نے کہا: ''ہم ایک گھنٹے بعد فارم پر ملیں گے۔''

مرفی اور بریڈن نے پھر بندھے ڈرائیور کو پچھلی نشست میں ڈالا، کار سے پولیس کے نشانات ہٹائے، اپنے کپڑے تبدیل کیے اور روانہ ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد کار نے ٹرک کو پارکیا۔ مرفی نے ایک مرتبہ ہارن بجایا۔ ٹرک ڈرائیور نے ہاتھ ہلا کر ''ٹھیک'' کہا اور سفر جاری رکھا۔

فارم پر جانے کے لیے کار ایک کچی سڑک پر مڑی۔ ایک گھنٹہ گھنٹوں میں چلنے کے بعد وہ گھنے درختوں میں گھرے ویران فارم پر پہنچ گئی جس میں براسا کمرا بنا ہوا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ مرفی اپنی کامیابی پر خوش تھا کہ اس نے شراب کی ۹ ہزار بوتلیں بڑی آسانی سے اڑا لیں۔ اب انھیں چور بازار میں بیچنا اس کا کام نہیں تھا۔ اس نے تو یہ مال دوسرے خریدار کے حوالے کرکے اپنے پونڈ کھرے کر لینے تھے۔

مرفی اور اس کے ساتھیوں نے لیام کو اٹھایا اور کمرے میں پڑی بوریوں کے پیچھے پھینک دیا۔ اندھیرا ہونے کے بعد ۷ بجے ٹرک بھی پہنچ گیا۔ اُسے بڑے کمرے میں چھپایا گیا۔ مرفی ہاتھ میں ٹارچ لیے پتلی سڑک کے موڑ پر آگیا تاکہ شمالی آئرلینڈ سے آنے والے خریدار کو فارم کا راستہ دکھا سکے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں ۴ وینگنیں آ رکیں۔ مرفی اپنی راجنمائی میں انھیں فارم ہاؤس تک لے آیا۔ لمبا کوٹ پہنے ایک طویل القامت، تنومند آدمی گاڑی سے اترا۔ اس نے مرفی سے پوچھا کہ مال آگیا؟

مرفی نے کہا ''ہاں ٹرک میں ہے۔ وہ باڑے کے اندر چھپا کھڑا ہے۔ اس کے دروازے پر کسٹم کی مہریں بھی لگی ہیں۔ ہم میں سے کسی نے بھی ٹرک کو نہیں چھیڑا۔''

تنومند آدمی نے ٹرک کے پچھلے دروازے پر لگے تالے دیکھے، کسٹم مہروں کا معاینہ کیا، پھر اپنے آدمیوں سے کہا کہ ٹرک سے مال اُتار کر وین میں رکھیں۔ یہ احکامات دے کر وہ کمرے میں پڑی کرسی پر آ بیٹھا اور بریف کیس کھولا۔ اس میں پورے ۳۵۰۰۰ پونڈ موجود تھے۔ مرفی بڑا خوش ہوا۔ اسے یقین تھا کہ تین تین ہزار ساتھیوں کو دینے

کے بعد بھی اس کے حصے میں کافی رقم آئے گی۔ اچانک تنومند آدمی کے ایک آدمی نے آواز دی ''باس! بہتر ہوگا آپ یہاں آکر خود دیکھیں کہ یہ کیا معاملہ ہے۔''

تنومند آدمی نے جلدی سے بریف کیس بند کر کے ہاتھ میں اٹھایا اور ٹرک کے پاس پہنچا۔ اس کے ساتھی ٹرک کے پچھلے کھلے دروازوں کے قریب کھڑے تھے۔ ٹارچوں کی روشنی میں ٹرک کے اندر کا منظر بالکل واضح تھا۔ بجائے بوتلوں کے کریٹوں کے ٹرک میں کچھ اور ہی مال بھرا تھا۔ پلاسٹک کی بھری بوریاں ایک دوسرے پر ترتیب سے رکھی تھیں۔ ہر بوری پر کمپنی کا نام بھی کندہ تھا۔ یہ باغیچے کا سامان بنانے کی کمپنی تھی۔ ہر پر ''روز فرٹیلائزر'' یعنی گلاب کے پودوں کی کھاد کے واضح الفاظ ثبت تھے۔ آدمی نے غصے کے عالم میں مرفی سے پوچھا ''یہ کیا مذاق ہے؟ شراب کی بوتلیں کہاں ہیں؟''

مرفی نے قسم کھا کر کہا ''مجھے نہیں معلوم یہ کیا گھپلا ہے۔ میری اطلاع تو بالکل درست تھی۔ مجھے متعلقہ کمپنی اور بحری جہاز کا نام اور آمد کی تاریخ سب کچھ درست بتایا گیا تھا۔ آج اس بحری جہاز سے صرف یہی سفید ٹرک باہر نکلا۔''

تنومند آدمی نے مرفی سے پوچھا کہ ٹرک کا ڈرائیور کہاں ہے؟ مرفی نے بتایا کہ ادھر پیچھے پڑا ہے۔ دونوں اس کے پاس پہنچے۔ ٹرک کا ڈرائیور لیام کلارک بندھا پڑا تھا۔ آدمی نے پوچھا ''تمھارے ٹرک میں یہ کیا سامان ہے؟''

لیام نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن واضح آواز نہ نکلی۔ تنومند آدمی نے اپنے ایک کارندے کو اشارہ کیا۔ اس نے بڑھ کر لیام کے منہ سے ٹیپ ہٹا دیا۔ آدمی نے پھر پوچھا: ''ٹرک میں کیا سامان لے جا رہے تھے؟''

لیام نے کہا ''گلاب کے پودوں کی کھاد! کسٹم کے کاغذات میں بھی یہی لکھا ہوا ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں۔''

تنومند آدمی مرفی کی طرف مڑا اور غصے سے بولا ''بے وقوف! کیا تم نے یہ کاغذات نہیں دیکھے؟''

مرفی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ اپنا غصہ ڈرائیور پر نکالتے ہوئے بولا ''تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟''

''اس لیے کہ تمھارے کارندوں نے فوراً میرے منہ اور آنکھوں پر ٹیپ لگا دیا۔''

مرفی نے لیام سے دوبارہ پوچھا ''کیا واقعی بوریوں کے نیچے شراب کی بوتلیں نہیں؟''

لیام نے کہا ''شراب کی بوتلیں! بیلجیئم میں تو برانڈی بنائی نہیں جاتی''۔

یہ سن کر مرفی بولا ''کیا تم فرانس سے نہیں آرہے؟''

لیام نے کہا ''ہرگز نہیں، میں تو بیلجیئم سے کھاد کی بوریاں آئرلینڈ لے کر آیا ہوں۔''

تنومند آدمی نے اچانک مرفی کو گردن سے پکڑ کر اٹھایا، زمین پر دے مارا اور بولا ''تم نے میرا وقت ضائع کر دیا۔ آیندہ اگر ایسی حرکت ہوئی تو تمھیں زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔''

تنومند آدمی پھر ساتھیوں کے ساتھ واپس شمالی آئرلینڈ روانہ ہوگیا۔ مرفی کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کمرے میں آیا۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے؟ مرفی کے ساتھی بولے ''ہمارے پاؤنڈ تو مارے گئے۔''

مرفی نے کہا ''زیادہ بڑا نقصان تو میرا ہوا ہے جس نے سارے منصوبے پر رقم خرچ کی تھی۔ میں تمھیں ایک ایک ہزار پونڈ دے دوں گا لیکن ابھی نہیں، کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔''

مرفی نے پھر برینڈن سے کہا: ''تم دونوں آدمیوں کے ساتھ مل کر اس کمرے اور ٹرک سے تمام انگلیوں کے نشانات صاف کر دو۔ یہاں کسی قسم کا ثبوت نہیں چھوڑنا۔ باہر مٹی میں ٹائروں کے تمام نشان بھی برابر کر دو تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ ڈرائیور کو کار میں بٹھا کر یہاں سے چند میل دور سڑک کنارے چھوڑ دینا۔ ہاتھ، پیر اور منہ ٹیپ سے بندھے رہیں۔ صبح تک کوئی نہ کوئی اس کی مدد کر دے گا۔ اس کے بعد سیدھے اپنے گھر جانا اور کچھ عرصے کے لیے غائب ہو جاؤ۔ میں ٹرک لے جا رہا ہوں۔ کسی ویران مقام پر چھوڑ دوں گا۔ پھر وہاں سے کسی طرح اپنے گھر ڈبلن پہنچوں گا۔''

ٹرک کے تالے توڑے جا چکے تھے۔ ان لوگوں نے دروازہ بند کر کے کنڈی میں لکڑی کے ٹکڑے لگا دیے تا کہ وہ بند رہے۔ مرفی ٹرک میں بیٹھا اور نکل گیا۔ بقیہ افراد بھی اپنا کام کر کے کار میں اپنی منزل پر روانہ ہو گئے۔

اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ گھپ اندھیرے میں مرفی پتلی سڑک پر جا رہا تھا جس کے اردگرد درخت استادہ تھے۔ مرفی کی بدقسمتی کہ ٹریکٹر ٹرالی سوار ایک کسان اچانک اس کے سامنے آ گیا۔ ٹریکٹر کی دونوں بتیاں خراب تھیں۔ پیچھے ٹرالے پر ۱۰ ٹن وزنی بھوسے کی گانٹھیں لدی ہوئی تھیں۔ مرفی کا ٹرک سڑک کے عین درمیان چل رہا تھا۔ جب اچانک اس نے سامنے ٹریکٹر دیکھا تو فوراً روک دیا۔

بڑے ٹرکوں کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر اچانک انہیں روکا جائے تو پیچھے والا حصہ گھوم کر پہلو میں آ جاتا ہے۔ سڑک پتلی تھی لہٰذا ٹرک دونوں طرف کی دیواروں سے ٹکراتا آگے بڑھتا گیا۔ یہ دیواریں کھیت محفوظ کرنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ ٹریکٹر کے ڈرائیور نے موقع پاتے ہی گاڑی ایک کھیت کی طرف موڑ دی لیکن اس کی ٹرالی سڑک پر ہی رک گئی۔ چنانچہ ٹرک زوردار انداز میں ٹرالی سے جا ٹکرایا۔ جھٹکے سے ٹریکٹر ڈرائیور مٹی میں جا گرا۔ بھوسے کی گانٹھیں ہوا میں اڑ کر سڑک کے چاروں طرف پھیل گئیں۔ ٹرک کا پچھلا دروازہ بھی جھٹکے سے کھل گیا اور کھاد کی کئی بوریاں سڑک پر جا پڑیں۔

مرفی حواس باختہ ہو گیا۔ اس کے ذہن میں بس یہی خیال تھا کہ جتنی جلد ہو سکے، یہاں سے دور چلا جائے۔ یہ سوچ کر وہ ٹرک سے اترا۔ اُدھر کسان بھی اٹھا اور ٹرک کی جانب لپکا۔

مرفی کی بدقسمتی کہ عین اس وقت سامنے سے ایک پولیس کار آتی نظر آئی۔ وہ ٹرالی کے پاس رک گئی۔ اس میں ایک سارجنٹ مع سپاہی سوار تھا۔ وہ دن بھر کا کام مکمل کر کے واپس پولیس اسٹیشن جا رہے تھے۔ حادثہ دیکھ کر دونوں نیچے اتر آئے۔ سارجنٹ نے پھر مرفی سے کاغذات لیے، ان کا مطالعہ کیا اور پھر پوچھا ''تمھارا نام لیام کلارک ہے؟''

مرفی نے اثبات میں سر ہلایا۔ تبھی سپاہی نے کہا کہ ٹریکٹر کی دونوں بتیاں خراب ہیں۔ سارجنٹ نے مرفی کو کاغذات واپس کیے، کسان کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا ''تمھارا لائسنس اور انشورنس کے کاغذات کہاں ہیں؟''

اس نے بتایا کہ گھر پر ہیں۔ سارجنٹ نے کہا ''ٹرالی سڑک سے ہٹاؤ اور بھوسے کی گانٹھیں ایک طرف رکھو تا کہ سڑک کا راستہ کھل جائے۔ ہم ابھی ساتھ چل کر تمھارے گھر کاغذات کی پڑتال کرتے ہیں۔''

مرفی نے سوچا کہ پولیس والے چلے جائیں، تو وہ فوراً یہاں سے نکل جائے۔ اسی وقت سپاہی ٹہلتا ہوا ٹرک کے پچھلی جانب گیا تا کہ اس کی بتیوں کا بھی معاینہ کر لے۔ سارجنٹ نے مرفی سے پوچھا ''تمھارے ٹرک میں کیا سامان ہے؟'' اس نے بتایا کہ گلاب کی کھاد لدی ہے۔ سپاہی ٹرک کے پچھلی جانب سے واپس آیا اور کہا کہ ٹرک کے دروازے کی کنڈی ٹوٹ چکی۔ دروازہ کھلنے کی وجہ سے کچھ بوریاں سڑک پر گری ہوئی ہیں۔ پھر سارجنٹ سے کہا ''جناب! بہتر ہوگا آپ ادھر چل کر خود دیکھ لیں۔''

مرفی اور پولیس والے ٹرک کے پچھلی جانب پہنچے۔ سڑک پر تقریباً ایک درجن بوریاں گری پڑی تھیں۔ کچھ پھٹ بھی گئی تھیں۔ ان سے بھورے رنگ کی کھاد باہر گری پڑی تھی۔ سپاہی نے ٹارچ نکالی ..... بوریوں پر روشنی ڈالی۔ پھٹی بوریوں کے درمیان مشین گن اور راکٹ لانچروں کی نالیں چمک رہی تھیں۔ سارجنٹ نے فوراً اپنا پستول نکال کر مرفی کی طرف کر دیا۔

مرفی کے پیٹ میں بل اٹھنے لگے۔ وہ بے حال ہو کر سوچنے لگا کہ نہ صرف وہ شراب کی ۹ ہزار بوتلیں حاصل کرنے میں ناکام رہا، بلکہ اب کسی اور کی بلا بھی اس کے سر پر آ پڑی تھی۔ دراصل لیام کلارک شمالی آئرلینڈ میں مصروف کار ایک انتہا پسند تنظیم کے لیے غیر قانونی ہتھیار لا رہا تھا۔

مرفی نے دونوں ہاتھ سارجنٹ کے آگے بڑھا دیے۔ وہ ایک گڑھے میں جا گرا تھا جہاں سے اُسے جیل کی سلاخیں صاف نظر آنے لگی تھیں۔

ادب عربی

عہد بنو اُمیہ کا ایک
محیر العقول واقعہ

سزا

ایک متمول تاجر پر اپنے ہی گھوڑے
کو بے دردی سے پیٹنے کا جرم
ثابت ہونے کو تھا

ڈاکٹر نعمان مظہر

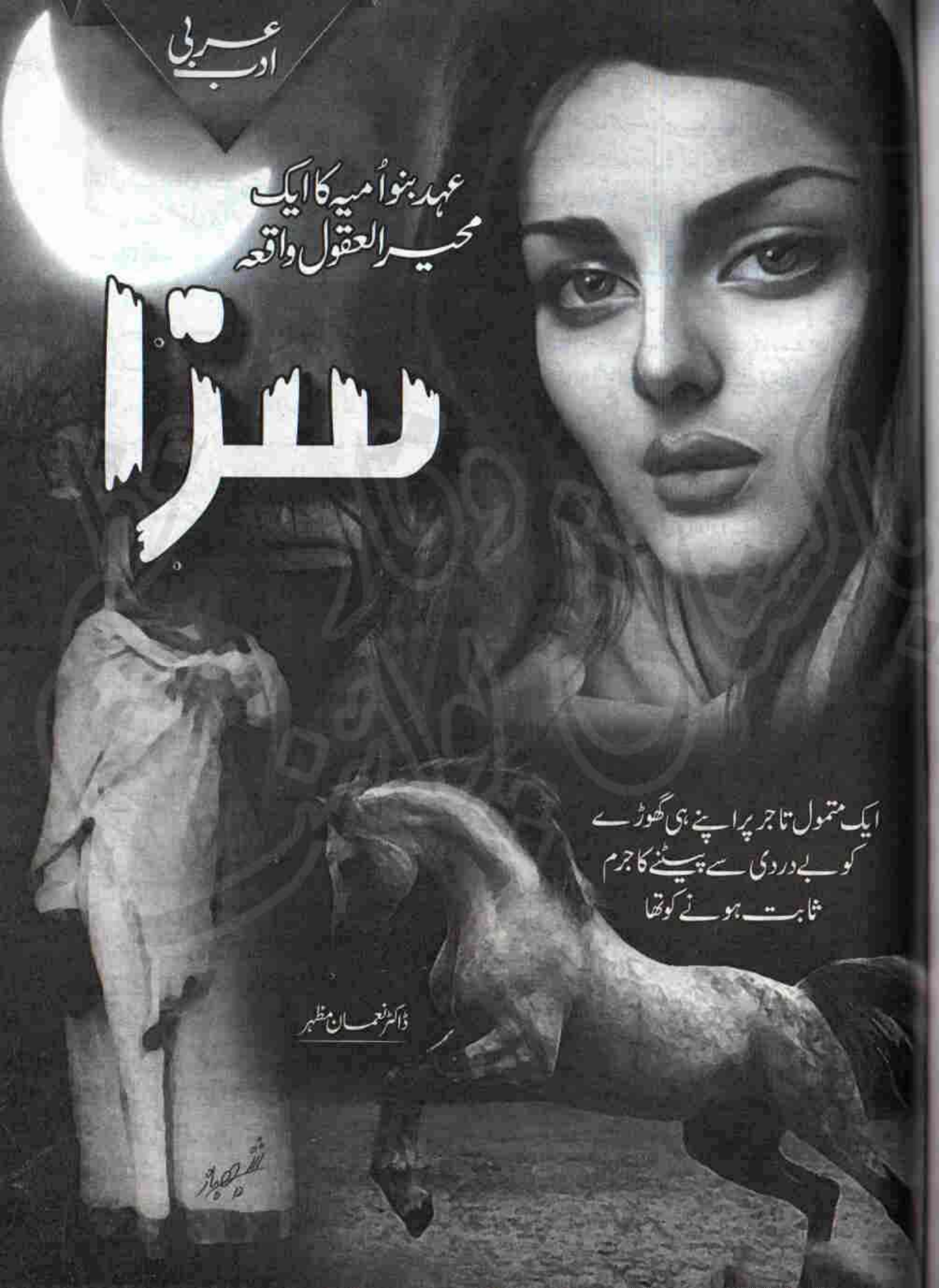

ایک

بارخلیفۂ وقت ہارون رشید کے دربار میں بغداد شہر کے ایک متمول تاجر سعدی نعمان کو پیش کیا گیا۔ سعدی پرانے گھوڑے کو انتہائی بے دردی سے پیٹنے کا الزام تھا۔ اس دور میں معمولی سے معمولی جرائم پر بھی شاہ و گدا میں امتیاز روا نہیں رکھا جاتا تھا۔

ہارون: سعدی جیسا کہ میرے علم میں آیا، تم نے کل شام اپنے گھوڑے کو نہایت بے دردی سے مارا ..... بے شک میں نے اپنی زندگی میں بے شمار گھوڑوں کو پٹتے دیکھا ..... اور خود بھی چند گھوڑوں کو ان کی سرکشی پر سزا دی مگر ایک بے زبان کو اس قدر بے دردی سے پیٹنا ..... اگر مجھے علم نہ ہوتا کہ تم فطری طور پر ایک رحم دل شخص ہو تو میں تمھیں تمھارے ظلم کا بدلہ چکھا دیتا۔

سعدی سلطان کے قدموں میں گرتے ہوئے ''خلیفۂ عالی! مجھے معاف فرما دیں۔ میں مجبور تھا۔ اگر آپ مجھ سے حقیقت سنیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ ضعیف سے درگزر فرمائیں گے۔

خلیفہ: اگرچہ دربار کا وقت ختم ہو چکا مگر ہم تمھاری کہانی سننا چاہتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ آؤ۔

خلیفہ محل کے اندر چلا جاتا ہے۔ سپاہی سعدی کو پکڑے خلیفہ کی تقلید میں چلتے ہیں۔ سعدی کی حالت اس قابل نہیں کہ وہ کچھ بول سکے۔ محل میں ایک پُرسکون جگہ سبھی بیٹھ گئے۔

خلیفہ: ہاں! اب مجھے بتاؤ تم پر کیا بیتی؟

خوف کے مارے سعدی کے منہ سے بے ربط جملے ادا ہونے لگے۔

خلیفہ: میرے دوست پریشان مت ہو، مجھے تم ہر لحاظ سے رحم دل پاؤ گے۔ میں تمھاری خطا معاف کرتا ہوں۔ اب اطمینان سے مجھے اپنی سرگزشت سناؤ۔

سعدی: خلیفۂ عالی، میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ اپنی آپ بیتی سچ سچ سنا سکوں۔ میں پیدائش اور بچپن کے متعلق بتا کر آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کروں گا۔ بس اتنا ضرور ہے کہ جب میرے والد ہمیں مرے تو میرے لیے اتنا مال چھوڑ گئے کہ میں ایک خوش حال زندگی کا آغاز کر لیتا۔

میں نے تجارت شروع کر دی۔ میری زندگی خوشحال گزر رہی تھی، صرف کمی تھی تو ایک اطاعت گزار بیوی کی! کسی دور کے رشتہ دار کے توسط سے میری شادی ایک تاجر کی بیٹی آمنہ سے ہو گئی۔

جیسا کہ آپ کے علم میں ہے، ہمارے معاشرے میں شادی دو انجان لوگوں کو ملا کر اکٹھے زندگی گزارنے کا نام ہے۔ یہ زندگی پُرسکون ہو سکتی ہے اگر عورت اور مرد متوازن شخصیت کے حامل ہوں۔

شادی کے بعد میں نے جب میری پہلی نظر بیوی پر پڑی تو قدرت کی صناعی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر افسوس آنے والے ہر دن نے میرے صبر کا امتحان لیا اور مجھے نحیف و ناتواں کر ڈالا۔

شادی کے دوسرے دن میں نے پُرتکلف دعوت کا انتظام کیا۔ اس میں شہر کے رؤسا اور ان کی بیویوں کو مدعو کیا۔ مگر کھانا شروع ہونے پر میری بیوی چلی گئی۔ میں نے نوکروں کو فوراً اسے بلوانے بھیجا۔ بڑی پس و پیش کے بعد وہ لوٹی تو میں نے اسے کھانے میں شرکت کرنے کا حکم دیا۔

مگر یہ دیکھ کر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ آمنہ ایک سلائی کی مدد سے چاولوں کا دانہ دانہ چن کر کھانے لگی۔ تمام لوگ حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ میں نے غصے سے کہا ''آمنہ! یہ کیا حرکت ہے، لوگ کیا سوچیں گے؟ کیا تم گھر میں بھی یونہی کھانا کھاتی تھی۔'' میرے ڈانٹنے پر وہ کھانا چھوڑ کر چلی گئی۔

آنے والے دنوں میں بھی اس کی یہی عادت رہی۔ جتنی خوراک وہ کھاتی تھی، اس سے زیادہ تو ایک چڑیا کی خوراک ہوتی ہے۔ میں نے اس کے لیے طرح طرح کے مزیدار کھانے پکوائے مگر اسے زیادہ کھانے پر رضامند نہ کر سکا۔

میں حیران تھا کہ وہ اتنا کم کھانے کے باوجود زندہ کیسے ہے؟ چنانچہ شب و روز اسی کوشش میں رہتا کہ کسی طرح اس راز سے پردہ اٹھے۔

ایک رات جب میں اور آمنہ سو رہے تھے، اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ تب میں نے آمنہ کو عقبی دروازے سے باہر نکلتے دیکھا جو اس نے نہایت ہوشیاری سے رات کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ میں بھی بغیر آواز پیدا کیے، اس کے تعاقب میں چل دیا۔

آمنہ قریبی قبرستان کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گئی۔ میں خوف کے مارے کانپتا ہوا ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ میں نے آمنہ کو ایک چڑیل کے ہمراہ آتا دیکھا۔

خلیفۂ عالی! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ چڑیلیں بیابانوں میں رہتی ہیں اور انسانوں کا گوشت کھانے سے گریز نہیں کرتیں۔ اسے عفریت کے ساتھ دیکھ کر خوف کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے مگر میں بے سدھ پڑا رہا۔

ان دونوں نے میرے سامنے ایک نئی قبر کھودی۔ پھر ایک تازہ لاش نکال کر کھانے لگیں جو غالباً اسی دن دفنائی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ قبر پر مٹی ڈالنے لگیں۔

موقع پا کر میں سرپٹ دوڑا اور گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔ مگر اب میری نیند اڑ چکی تھی اور پوری رات میں اس معاملے کا حل سوچتا رہا۔ آخر میں نے خود آمنہ سے بات کرنے کی ٹھانی۔

اگلے روز کھانے کے دوران میں نے آمنہ سے استفسار کیا ''آمنہ! جب سے تم آئی ہو، میں نے دیکھا ہے تم بہت کم کھانا کھاتی ہو۔ میں نے دنیا جہان کے لذیذ کھانے تمھارے سامنے لا کر رکھے مگر تم نے ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمھارے لیے تازہ انسانی گوشت فراہم نہیں کر سکتا۔''

یہ سنتے ہی جیسا کہ میرا خیال تھا، آمنہ طیش میں آ گئی۔ غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا اور آنکھیں یوں باہر کو ابل آئیں کہ ابھی گر جائیں گی۔

مسکراہٹ

☆مسکراہٹ کے لیے کوئی قیمت ادا نہیں کی جاتی لیکن اس کے بہت سے فائدے ہیں۔

☆اس کو پانے والا مالا مال ہو جاتا ہے مگر دینے والا مفلس نہیں ہوتا۔

☆مسکراہٹ خریدی نہیں جا سکتی اور نہ ہی اس کی بھیک مانگی جا سکتی ہے۔

☆مسکراہٹ نہ تو چوری کی جا سکتی ہے اور نہ ہی اُدھار میں ملتی ہے۔

☆اگر آپ ہر دل عزیز بننا چاہتے ہیں اور خواہش ہے کہ ہر کوئی آپ سے خوش رہے تو ہمیشہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجا کر رکھیے۔

(ثمینہ فیروز، ملتان)

''تمھاری یہ جرأت کہ تم نے میری یہ حرکت دیکھی۔ احمق انسان، میں تمھیں اس کا مزہ چکھا دوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے قریب پڑا پانی کا برتن اٹھایا اور اس میں ہاتھ ڈال کر کچھ پڑھنے لگی جو میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

''میں تمھیں انسان نہیں رہنے دوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ پانی میرے چہرے پر چھڑک دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ میرا بدن تبدیل ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں ایک کتے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ آمنہ نے ایک مضبوط لکڑی اٹھا کر مجھے اس شدت سے پیٹنا شروع کر دیا کہ مارے درد کے میرے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔

آخر اس نے مجھے ایک خوفناک سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے مرکزی دروازہ کھول دیا۔ مگر میں اس کی تدبیر سمجھ گیا اور اس قدر تیزی سے باہر بھاگا کہ آمنہ نے جب نہایت زور سے دروازہ بند کیا تو صرف میری دُم ہی بیچ میں آئی۔ اگر میں ذرا سی بھی سستی دکھاتا تو میرا بچنا محال تھا۔

گو اب میں آزاد تھا مگر میری دم سے درد کی ناقابل برداشت ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ درد کی شدت سے میں نے بھونکنا شروع کردیا جس پر بغداد کے گلی کوچوں سے کتے بھونکتے ہوئے میرے گرد جمع ہوگئے اور مجھ پر جھپٹنا شروع کردیا۔ میں وہاں سے بھاگا۔ قریب ہی ایک رحم دل شخص کی دکان تھی جو گوشت کا کاروبار کرتا تھا۔

اس نے نہ صرف مجھے ان کتوں سے نجات دلوائی بلکہ مجھے اپنی دکان کے اندر لے آیا۔ میں نے بھاگ کر ایک کونے میں پناہ لے لی اور اس کے چکرا نے پر بھی باہر نہ آیا۔ وہ رات میں نے محفوظ گزاری۔ اگلی صبح جب وہ شخص کتوں کو چھیچھڑے ڈال رہا تھا تو میں باہر نکلا۔ اس رحم دل نے یہ جانتے ہوئے کہ میں کل سے بھوکا ہوں، میری طرف گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا پھینکا۔ اسے کھانے کے بعد میں مزید کی طلب میں بڑھا تو اس نے ڈنڈے سے مجھے بھگا دیا۔

چلتا چلتا میں ایک حلوائی کی دکان پر پہنچا جو فطرتاً ایک اچھا انسان تھا۔ اس نے مجھے کھانے کے لیے روٹی کا ٹکڑا پھینکا۔ اگرچہ مجھے بھوک نہ تھی پھر بھی میں نے اسے خلافِ آداب سمجھتے ہوئے روٹی کا ٹکڑا کھا لیا اور پیار سے اپنا جسم اس کی ٹانگوں سے رگڑنے لگا۔

وہ شخص مجھے اپنے گھر لے آیا۔ اب میری زندگی کے دن پرسکون تھے۔ وہ شخص میرے کھانے اور آرام کا پورا خیال رکھتا اور بدلے میں میں بھی اس کی فرمانبرداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا۔

ایک دن ایک عورت اس کی دکان پر آئی اور روٹی کے بدلے اسے چند سکے پیش کیے جن میں سے ایک سکہ نہایت خستہ حالت میں تھا۔ دکان دار نے وہ سکہ لینے سے انکار کردیا۔ مگر عورت اپنی بات پر اڑی رہی کہ یہ سکہ درست ہے۔ آخر غصے میں آ کر وہ بولا ”محترمہ! اتنا تو میرا کتا بھی بتا دے گا یہ سکہ خراب ہے“ اور مجھے اشارہ کیا۔

میں چھلانگ لگا کر چوہدا ے پر چڑھ آیا۔ کچھ دیر سکوں کو سونگھا اور خراب سکہ اٹھا کر چنگیز میں دبا لیا۔ دکاندار اور عورت کا مارے حیرت کے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ دکاندار نے تو محض مذاق میں یہ کہا تھا مگر یہ دیکھ کر وہ نہایت حیران ہوا۔

اس دن سے یہ بات سارے شہر میں پھیل گئی کہ اس دکاندار کے پاس ایک ایسا کتا ہے جو برے سکوں کی تمیز کرسکتا ہے۔ اس دن سے آدمی کی دکانداری کو چار چاند لگ گئے اور میری خاطر مدارت میں بھی اضافہ ہوگیا۔ مگر کچھ لوگ اس سے جلنے لگے چنانچہ میرا مالک ہمیشہ مجھ پر نظر رکھتا۔

ایک دن ایک عورت اس کی دکان پر آئی۔ تب میں ایک کونے میں بیٹھا ہڈی سے کھیل رہا تھا۔

وہ بولی ”میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس ایسا کتا ہے جو اچھے اور خستہ حال سکوں کی تمیز کرسکتا ہے“۔ مالک نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ عورت نے چند سکے نکال کر رکھے۔ مالک نے مجھے اشارہ کیا اور معمول کے مطابق میں نے براسکہ نکال کر علیحدہ کردیا۔

عورت یہ دیکھ کر نہایت حیران ہوئی اور مالک سے اصرار کرنے لگی کہ یہ کتا اسے دے دو اور بدلے میں منہ مانگی رقم لے لو مگر مالک نے انکار کردیا۔ قصہ مختصر اس نے کچھ خریداری کی اور چلنے لگی۔

کچھ دور جا کر وہ مڑی اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ میں کشمکش میں تھا کہ اس کے ساتھ جاؤں۔ کچھ دور جا کر وہ پھر مڑی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے چپکے سے اپنی جگہ چھوڑی۔ مالک رقم گننے میں مصروف تھا لہٰذا اس کے علم میں میری یہ حرکت نہ آسکی۔

میں اس عورت کے پیچھے چلتا رہا۔ چلتے چلتے آخرکار وہ ایک مکان کے مرکزی دروازے پر رکی۔ میری کمر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ دروازہ اس کی بیٹی نے کھولا۔ وہ مجھے اندر لے آئی۔ اس عورت کی ۲ بیٹیاں تھیں۔ وہ اپنی چھوٹی بیٹی سمیعہ سے کہنے لگی:

”بیٹا! میں نے جب سے اس کتے کے بارے میں سنا تھا، مجھے یقین ہو چلا کہ ہوسکتا ہے یہ کوئی انسان ہو۔ آج جب اس نے میرا اشارہ سمجھ کر میرے ساتھ چلنے کا ارادہ

کیا تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ اب تمھارا یہ فرض ہے کہ تم اس مصیبت زدہ کو اس کی مصیبت سے نجات دلوا دو۔“

سمیعہ پانی سے بھرا گلاس لے آئی اور اس میں ہاتھ ڈال کر کچھ پڑھنے لگی، بالکل اسی طرح جیسا کہ میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ پڑھنے کے بعد وہ بولی:

”اس منتر کی بدولت، اگر یہ کتا واقعی انسان ہے تو اس کو انسان بن جانا چاہیے۔“

یہ کہہ کر اس نے مجھ پر پھونک ماری۔ میں واقعی دوبارہ اپنی اصلی حالت پر واپس آیا اور اس بوڑھی عورت کے قدموں میں گر گیا۔ مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ میں ان کا شکریہ کیسے ادا کروں۔

سمیعہ بولی ”تمھاری بیوی آمنہ اور میں ایک ہی مکتب میں جادو کا علم حاصل کرتی رہی ہیں۔ مگر ہم کبھی اچھی دوست نہ بن سکیں کیونکہ آمنہ شروع سے ہی بدمزاج واقع ہوئی تھی۔

سمیعہ نے ایک اور گلاس میں کچھ پڑھ کر پھونکا اور مجھے دیتے ہوئے بولی ”یہ پانی تم اپنی بیوی کے منہ پر چھڑک دینا تاکہ اس کو اپنے کیے کی سزا ملے۔“

میں وہ پانی لے کر گھر آگیا۔ آمنہ مجھے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی اور دروازے کی طرف بھاگی مگر میں نے اسے موقع دیے بغیر پانی اس کے منہ پر چھڑک دیا۔ آناً فاناً وہ گھوڑے میں تبدیل ہوگئی۔

اب مجھے بتایئے خلیفۂ عالی کہ میں اس ظالم، سرکش اور نافرمان بیوی کے ساتھ کیسا سلوک کروں؟ یہی بات ہے جس نے مجھے اس تشدد پر مجبور کیا ہے۔

ہارون رشید: میرے دوست، میں مانتا ہوں کہ واقعی تمھارے ساتھ بہت برا ہوا۔ میں تمھیں ہرگز یہ حکم نہیں دوں گا کہ تم بوڑھی عورت کی بیٹی ڈھونڈ کر اپنی بیوی کو دوبارہ اپنی اصلی حالت میں لے آؤ کیونکہ وہ دوبارہ جادو کے زور سے خلقِ خدا کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گی۔ مگر میں تم سے اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کے ساتھ ظلم کا رویہ ہرگز اختیار نہ کرو۔ یاد رکھو! جو شخص اختیار کے باوجود ظلم کا رویہ اختیار نہیں کرتا تو خدا اس شخص سے محبت کرتا ہے۔

سعدی: یا خلیفۃ المسلمین! میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے حکم پر دل و جان سے عمل کروں گا۔

اس دن کے بعد دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سعدی نعمان دن رات اپنے گھوڑے کی خاطر تواضع میں مصروف رہتا اور اس کے آرام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت روا نہ رکھتا۔ اُس نے اپنی آدم خور بیوی کی سزا میں کمی کردی تھی۔

(عرب کلاسیکی داستان الف لیلہٗ سے ماخوذ)

تو نے بھی.....

ایک کوا روٹی کا ایک ٹکڑا لیے درخت کی ٹہنی پر بیٹھا تھا۔ ایک لومڑی کا گزر ادھر سے ہوا۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ سوچا کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ یہ چونچ کھول دے اور روٹی کا ٹکڑا میں جھپٹ لوں۔ پس اس نے مسکین صورت بنا کر کہا ”اے کوے میاں سلام۔ تیرے حسن کی کیا تعریف کروں۔ کچھ کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے۔ واہ واہ چونچ بھی کالی، پر بھی کالے۔ آج کل تو دنیا کا مستقبل کالوں ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ افریقا میں بھی بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے لیکن خیر یہ سیاست کی باتیں ہیں۔ آمدم برسرِ مطلب! میں نے تیرے گانے کی تعریف سنی ہے۔ تو اتنا خوبصورت ہے۔ گانا بھی اچھا گاتا ہوگا۔ تجھے گانے سننے کا شوق یہاں کھینچ لایا ہے۔ ہاں تو ایک آدھ ٹھمری ہو جائے۔ کوا بھولا نہ سایا لیکن سیانے پن سے کام لیا۔ روٹی کا ٹکڑا منہ سے نکال کر چنچے میں تھاما اور لگا کائیں کائیں کرنے۔ بی لومڑی کا کام نہ بنا تو یہ کہتی ہوئی چل دی ”بہت تیری کی ہے سزا بھانڈ معلوم ہوتا ہے تو نے بھی حکایات لقمان پڑھ رکھی ہے۔“

(حکایات ابن انشا سے اقتباس)

روسی ادب

دُکھ پہنچانے والوں کو معاف کرنا
کبھی بھی آسان نہیں ہوتا

رہائی

ایک حوصلہ مند قیدی کی رہائی کا عجب واقعہ
وہ جیل سے رہا ہونے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا

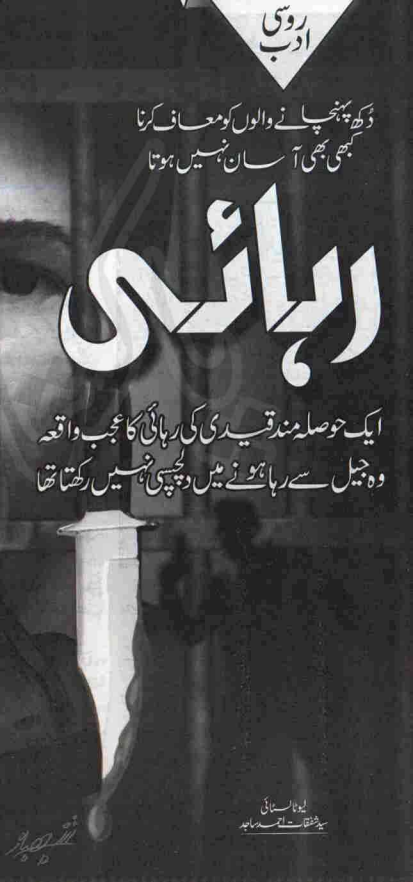

لیو ٹالسٹائی
سید شفقات احمد ساجد

روس کے والڈیمیر نامی گاؤں میں ایکسینوف نامی تاجر رہتا تھا۔ وہ گھنگرالے بالوں، کھلتی سفید رنگت والا خوبصورت نوجوان تھا۔ دو دکانیں اور ایک گھر اس کی ملکیت تھا۔ ہنس مکھ اور گانے کا بہت شائق تھا، مگر مے میں بھیگتے ہی اُسے شراب کی لت پڑ گئی۔ جب کبھی زیادہ پی لیتا تو تھوڑا بہک سا جاتا۔ عجیب اتفاق کہ شادی کے بعد اُس نے شراب پینا یک دم ترک کر دیا۔ البتہ کبھی کبھار کسی تقریب پر پی لینے کو بُرا خیال نہ کرتا۔

موسمِ گرما کی ایک صبح میلہ نذنی جانے کے ارادے سے جب وہ اپنے اہلِ خانہ کو خدا حافظ کہنے لگا تو اُس کی بیوی بولی ”ایکسینوف! آج سفر پر روانہ نہ ہوں۔ میں نے تمھارے متعلق ایک بُرا خواب دیکھا ہے۔“

ایکسینوف مسکرا کر بولا ”تمھیں شاید یہ ڈر ہے کہ میں کہیں میلے میں پینے پلانے میں محو ہو جاؤں گا۔“

بیوی نے کہا ”یہ تو میں نہیں جانتی کہ مجھے کس بات کا ڈر ہے، البتہ میں نے ایک بُرا خواب دیکھا ہے کہ آپ نے شہر سے واپس آ کر ٹوپی اتاری تو آپ کے بال سفید ہو چکے تھے۔“

ایکسینوف ہنس کر بولا ”یہ تو خوش بختی کی نشانی ہے۔ دیکھو اگر میں اپنی تجارتی اشیا فروخت نہیں کروں گا تو میلے سے تحفے کیسے لاؤں گا؟“ پھر اُس نے اہلِ خانہ کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔

ابھی تقریباً نصف سفر طے کیا ہوگا کہ اُس کی ملاقات ایک پرانے واقف کار تاجر سے ہو گئی۔ دونوں ایک ہی سرائے میں رکے۔ مل بیٹھ کر چائے پی اور اپنے اپنے کمروں میں آرام کی غرض سے چلے گئے۔ ایکسینوف کو دیر تک سونے کی عادت نہ تھی۔ ویسے بھی وہ خنک سویرے ہی سفر شروع کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ گجروم اپنے ملازم کو بیدار کیا اور گھوڑے تیار کرنے کا کہہ کر سرائے کے مالک کی طرف چلا گیا۔ وہ سرائے کے عقب ہی میں رہتا تھا۔ وہاں بل ادا کیا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔

۲۵ میل کا سفر طے کرنے کے بعد وہ گھوڑوں کو چارہ کھلانے ایک سرائے پر رکا۔ کچھ دیر سرائے کی راہداری ہی میں سستانے کے بعد وہ پورچ میں بیٹھا، چائے کے لیے سماوار گرم کرنے کا کہا اور اپنی گٹار نکال کر بجانے لگا۔

اچانک گھنٹیاں بجاتی ۳ گھوڑوں والی ایک بگھی آ کر رکی جس میں سے ایک افسر اور ۲ سپاہی اترے۔ افسر نے ایکسینوف کے پاس آتے ہی دریافت کیا کہ وہ کون ہے؟ اور کہاں سے آیا ہے؟ ایکسینوف نے اُس کے سوالات کے جوابات دیے اور کہا کہ ”آپ میرے ساتھ چائے پئیں گے؟“

مگر افسر نے جرح کے انداز میں اس سے پوچھا ”گزشتہ شب آپ نے کہاں بسر کی تھی؟ کیا آپ تنہا تھے یا آپ کا قیام ساتھی تاجر کے ساتھ تھا؟ کیا آپ اس صبح ساتھی تاجر سے ملے؟ آپ سرائے سے سورج نکلنے سے پہلے ہی کیوں روانہ ہوئے؟“

ایکسینوف حیران ہوا کہ اُس سے یہ سوالات کیوں پوچھے جا رہے ہیں۔ اس نے تمام سوالات کے مبسوط جوابات دیے۔ مگر یہ ضرور پوچھا ”آپ مجھ پر یہ جرح کیوں کر رہے ہیں؟ جیسے کہ میں کوئی چور یا لٹیرا ہوں؟“

افسر نے اپنے دونوں سپاہیوں کو بلایا اور کہنے لگا ”میں اس ضلع کا پولیس افسر ہوں۔ میں نے یہ سوالات اس لیے کیے کہ وہ تاجر جس کے ساتھ آپ نے سرائے میں رات گزاری تھی، اپنے بستر میں مردہ پایا گیا ہے۔ اس کا گلا کٹا ہوا تھا۔ اب مجھے آپ کے سامان کی تلاشی لینی ہے۔“

وہ پھر تینوں کمرے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے ایکسینوف کا بندھا سامان کھولا اور تلاشی لی۔ اچانک افسر نے بیگ سے ایک چاقو نکال کر بلند کیا اور چیخ کر کہا ”یہ کس کا ہے؟“

ایکسینوف یہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا کہ ایک خون آلود چاقو اس کے بیگ سے برآمد ہوا ہے۔

”اس چاقو پر تو خون ہے؟“ افسر نے گرج کر کہا۔

ایکسیوف نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر بڑی مشکل سے صرف یہ کہہ پایا ''مجھے نہیں معلوم..... یہ میرا نہیں.....''

پولیس افسر بولا ''صبح تاجر اپنے کٹے ہوئے گلے کے ساتھ بستر میں پایا گیا۔ اب صرف تم ہی ہو سکتے ہو جس نے یہ کام کیا۔ سرائے کو اندر سے تالا لگا ہوا تھا اور کوئی دوسرا بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ خون آلود چاقو آپ کے بیگ سے برآمد ہوا ہے۔ آپ کا چہرہ اور تخاطب آپ کا ساتھ نہیں دے رہے۔ مجھے صرف یہ بتایئے کہ آپ نے اس تاجر کو کس طرح قتل کیا اور کتنی رقم چرائی۔''

ایکسیوف نے قسم اٹھاتے ہوئے کہا کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے تاجر کے ساتھ مل کر صرف چائے پی تھی۔ پھر اُسے دیکھا تک نہیں۔ اُس نے مزید کہا کہ اُس کے پاس صرف آٹھ سو روبل ہیں جو اُسی کے ہیں اور چاقو ہرگز اس کا نہیں۔ لیکن اُس کی آواز شکستہ اور چہرہ زرد تھا۔ وہ خوف سے اس طرح کانپ رہا تھا جیسے وہ واقعی مجرم ہو۔

پولیس افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ایکسیوف کو باندھ کر کھٹکی میں ڈال دو۔ جب انھوں نے پاؤں باندھ کر اسے کھٹکی میں پھینکا تو ایکسیوف نے بے بسی کے عالم میں کہا ''یا اللہ رحم'' اور رو پڑا۔ اس کے پاس جو رقم اور سامان تھا، وہ لے کر اسے نزدیکی جیل بھیج دیا گیا۔ گاؤں والد میسر سے اُس کے کردار کے متعلق تحقیق و تفتیش کی گئی تو لوگوں نے کہا کہ کسی زمانے میں وہ شراب کا رسیا تھا اور یوں کچھ توضیح اوقات کر لیتا تھا مگر تھا بھلا مانس!

بعدازاں مقدمہ کا آغاز ہوا اور فردِ جرم مرتب ہوئی۔ اس کے مطابق ایکسیوف پر الزام عائد ہوا کہ اُس نے ریزان نامی تاجر کے ۲۰ ہزار روبل لوٹے اور اُسے قتل کر دیا۔

اُس کی بیوی پر سراسیمگی طاری تھی، اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا نتیجہ اخذ کرے۔ اُن کے بچے ابھی بہت چھوٹے تھے۔ سب سے چھوٹا تو ابھی شیر خوار تھا۔ اُس نے بچوں کو ساتھ لیا اور ایکسیوف کے پاس جیل پہنچ گئی۔ پہلے تو اُسے ملنے کی اجازت نہیں ملی۔ لیکن بہت منت سماجت کے بعد ایک جیل افسر کا دل پسیجا تو اُسے ایکسیوف تک لے جایا گیا۔ جب اُس نے خاوند کو جیل کے لباس میں ملبوس، زنجیروں میں دیگر مجرموں اور چوروں کے ساتھ جکڑا دیکھا تو بے ہوش ہوگئی۔ کافی دیر بعد ہوش آیا تو بچوں کو قریب کھینچ کر ایکسیوف کے قریب سلاخوں کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

گھر کے حالات اختصار سے بیان کر کے اُس نے ایکسیوف سے دریافت کیا کہ سب کچھ کیسے ہوا؟ ایکسیوف نے تمام ماجرا کہہ سنایا تو وہ کہنے لگی کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ پھر خود ہی تجویز کیا کہ ہمیں زاروروں کو درخواست دینی چاہیے کہ وہ ایک بے گناہ شخص کو برباد ہونے سے بچائے۔ بیوی نے ایکسیوف کو بتایا کہ اُس نے پہلے بھی زاروروں کو ایسی ایک درخواست گزاری تھی مگر وہ منظور نہ ہوئی۔ ایکسیوف نے کوئی جواب نہ دیا اور سر نہواڑے نیچے دیکھتا رہا۔ پھر بیوی کہنے لگی ''تمھیں میرا خواب یاد ہے نا؟ تمھیں اُس دن سفر پر روانہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' پھر اُس نے بڑی چاہت سے ایکسیوف کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''ایکسی! اپنی بیوی کو تو بتاؤ کہ تم نے ایسا نہیں کیا۔''

''تو کیا تم بھی مجھ پر شک کر رہی ہو؟'' ایکسیوف منہ ہاتھوں سے ڈھانپ کر رونے لگا۔

اسی اثنا میں ایک سپاہی آگے بڑھا اور کہا ''ملاقات کا وقت ختم ہو چکا۔'' چنانچہ ایکسیوف نے آخری بار اپنے اہل خانہ کو خدا حافظ کہا۔ جب وہ جا چکے تو وہ بات چیت پر غور کرنے لگا۔ جب اسے یاد آیا کہ بیوی نے بھی اُس پر شک کا اظہار کیا تھا، تو وہ خود کلامی کرتے ہوئے بولا ''گنتا ہے، صرف اللہ تعالیٰ ہی حقیقت سے آگاہ ہیں۔ لہٰذا صرف انہی کے حضور درخواست اور رحم کے لیے دعا کی جا سکتی ہے۔'' چنانچہ ایکسیوف نے مزید درخواستیں گزارنے کا خیال ترک کر دیا اور ہر طرف سے ناامید ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرنے کا معمول بنا لیا۔

ایکسیوف کو پہلے کوڑے لگے۔ جب کوڑوں کے زخم مندمل ہو گئے تو اُسے دوسرے قیدیوں کے ساتھ سائبیریا

بھجوا دیا گیا۔ اگلے ۲۶ سال تک ایکسیوف بطور قیدی سائبیریا میں مقیم رہا۔ اس دوران اس کے بال برف کی طرح سفید ہو گئے۔ ڈاڑھی لمبی، پتلی اور بھوری ہو گئی۔ اس کی تمام اپج اور شادمانی کا جذبہ نابود ہو گئے۔ وہ آہستہ چلتا، کم بولتا اور ہنسنا تو بالکل بھول ہی گیا۔ وہ ہمہ وقت اللہ کے حضور دعا کرتا رہتا۔

جیل میں ایکسیوف نے جوتے بنانے کا کام سیکھ لیا۔ چنانچہ اس نے کچھ رقم پس انداز کر کے ''حیات صوفیہ'' نامی کتاب خریدی جسے وہ جیل میں جب بھی کچھ روشنی میسر آتی، پڑھ لیتا۔ اتوار کو وہ چرچ میں سبق پڑھتا اور کورس کے گانے میں شمولیت کرتا کہ اس کی آواز اب تک نہایت سریلی تھی۔

جیل انتظامیہ اس کی نرم روی کے باعث اُسے بہت پسند کرتی تھی۔ ساتھی قیدی بھی احترام اور عزت کی نظر سے دیکھتے۔ وہ ہمیشہ اُسے دادو یا صوفی کہہ کر پکارتے۔ جب بھی انھیں جیل انتظامیہ سے کوئی مطالبہ کرنا ہوتا، وہ ایکسیوف کو اپنا نمائندہ منتخب کرتے۔ کسی جھگڑے یا تنازع کی صورت میں بھی اُسے ثالث بنایا جاتا۔ اُسے گھر سے کبھی خیر و عافیت کی خبر موصول نہ ہوئی۔ اب تو اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُس کے بیوی بچے زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

ایک روز جیل میں قیدیوں کا نیا گروہ آیا۔ شام کو پرانے قیدی نئے قیدیوں کے گرد جمع ہو گئے اور اُن سے دریافت کرنے لگے کہ وہ کس گاؤں کے رہائشی ہیں اور کس جرم میں آئے۔ ایکسیوف بھی وہاں بیٹھا خاموشی سے ان کی گفت و شنید سنتا رہا۔ نووارد قیدیوں میں سے ایک لمبی بھوری ڈاڑھی اور گنجے ہوئے جسم والا دراز قد ساٹھ سالہ قیدی بھی شامل تھا۔ وہ اپنی داستان سناتے ہوئے بولا ''دوستو! میں نے سرف گاڑی میں جُتا گھوڑا کھولا، تو چوری کے جرم میں دھر لیا گیا۔ میں نے بتایا بھی کہ میں نے محض جلدی گھر پہنچنے کے لیے ایسا کیا تھا اور پھر کوچوان میرا ذاتی دوست تھا لہٰذا کوئی ارتکاب جرم نہیں ہوا۔ مگر انھوں نے کہا کہ تم نے گھوڑا چرایا ہے اور مجھے جیل بھجوا دیا۔''

''آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟'' کسی نے دریافت کیا۔

''والڈیمیر کا۔ میرا خاندان وہیں کا رہائشی ہے۔ میرا نام ماکر سیموئنچ ہے اور مجھے سیموئنچ بھی کہتے ہیں۔''

ایکسیوف اپنے گاؤں کا نام سن کر چونک گیا۔ اس نے سر اٹھاتے ہوئے پوچھا ''سیموئنچ! یہ بتایئے کہ کیا آپ ایکسیوف تاجر کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟ اور کیا اس کے بچے زندہ ہیں؟''

''یقیناً جانتا ہوں۔'' سیموئنچ نے جواب دیا اور کہا ''وہ دولت مند ہیں، مگر اُن کا والد سائبیریا میں ہے، شاید میری طرح کسی جرم میں۔ دادو! آپ بھی تو بتایئے کہ آپ یہاں کیسے آئے؟''

ایکسیوف نے اپنی بپتا سنانا پسند نہ کی اور سرد آہ بھرتے ہوئے صرف اتنا کہا ''اپنے گناہوں کی پاداش میں ۲۶ سال سے اس جیل میں ہوں۔''

''کون سے گناہ؟'' سیموئنچ نے دریافت کیا۔

ایکسیوف نے کہا ''شاید میں اسی لائق تھا۔''

وہ مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے نووارد قیدیوں کو بتایا کہ کس طرح کسی نے ایک تاجر کو قتل کر کے چاقو اُس کے سامان میں چھپا دیا تھا۔ یوں ایکسیوف کو ناحق سزا دی گئی۔

جب ماکر سیموئنچ نے یہ تفصیل سنی تو ایکسیوف کی

نئے گھر کی فرمائش

ایک لڑکی کی شادی ہوئی تو اُس کے شوہر نے پوچھا ''تم نئے گھر کی فرمائش تو نہیں کرو گی؟''

''نہیں جی! میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں، آپ اپنی امی کو نیا گھر لے دیجیے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

(عائشہ ضیاء، لاہور)

طرف دیکھ کر زور سے اپنا ہاتھ ران پر مارتے ہوئے کہا ''یہ تو عجیب ہے، بہت ہی عجیب بات ہے۔ مگر داد و آپ کتنے بوڑھے ہوگئے۔'' ساتھیوں نے اس سے دریافت کیا کہ وہ اس قدر حیران و ششدر کیوں ہوا؟ اور کیا وہ ایکسینوف سے پہلے بھی کہیں مل چکا ہے؟ سیمیونچ نے اُن کے سوال کا جواب دیے بغیر کہا ''جوانو! میرے لیے حیران کُن ہے کہ ہم یہاں ملے ہیں۔''

یہ سُن کر ایکسینوف متجسس ہوا کہ شاید اس شخص کو معلوم ہو، تاجر کوکس نے قتل کیا تھا۔ اس نے کہا ''سیمیونچ! شاید آپ نے سرائے میں تاجر کے قتل بارے سُن رکھا ہے؟''

سیمیونچ نے جواب دیا ''بھلا میں کیسے سُن سکتا تھا؟ دنیا افواہوں سے بھری پڑی ہے۔ کافی عرصہ پہلے مجھے اڑتی سی خبر ملی تھی مگر یہ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے۔ لہٰذا میں نے جو سنا تھا، بھول چکا۔''

''شاید آپ نے سنا ہو کہ تاجر کوکس نے قتل کیا تھا؟'' ایکسینوف نے دریافت کیا۔

ماکر سیمیونچ نے ہنس کر جواب دیا ''بھئی چاقو تمھارے بیگ سے برآمد ہوا تھا لہٰذا تم ہی قاتل ہوئے۔ اگر کسی اور نے چاقو وہاں چھپایا تھا تو بھی اُسے مجرم نہیں کہا جا سکتا تاوقتیکہ وہ پکڑا جاتا، اور پھر تمھارے بیگ میں کوئی چاقو کیسے رکھ سکتا تھا، جبکہ وہ تمھارے سر کے نیچے تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو تم یقیناً جاگ جاتے۔''

جب ایکسینوف نے یہ بات سنی تو اُسے یقین ہوگیا کہ وہی تاجر کا اصل قاتل ہے۔ چنانچہ وہ اٹھ کر چلا گیا۔ وہ تمام شب سو نہ سکا۔ وہ بہت افسردہ اور پریشان تھا۔ گزرے وقت کا ایک کے بعد دوسرا منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے آتا گیا۔ اُسے وہ وقت یاد آیا جب وہ گھر سے سفر کے لیے روانہ ہو رہا تھا اور وہ سب بھی جو بیوی نے کہا تھا۔ پھر اُسے بچے یاد آئے۔ جب وہ روانہ ہوا تو بہت چھوٹے تھے۔ ایک نے جبہ سا پہنا ہوا تھا۔ سب سے چھوٹا ماں کی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا۔

پھر اُسے اپنی جوانی کا لاابالی پن یاد آیا۔ پھر اُسے یاد آیا کہ وہ سرائے کے پورچ میں بیٹھا بڑے مزے سے گٹار بجا رہا تھا جب اُسے گرفتار کیا گیا۔ پھر اُس کے ذہن میں وہ منظر گھوم گیا جب اُسے کوڑے لگائے جا رہے تھے۔ بہت سے قیدی جمع ہو کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پھر اُسے قید میں ۲۶ سال گزارنے کے دوران بہت سی صعوبتوں اور قبل از وقت بوڑھا ہوجانے کا بھی خیال آیا۔ وہ یہ یادیں سوچ کر اس قدر متحمل ہوا کہ پہلے تو خودکشی کرنے کی ٹھان لی۔ پھر سوچا کہ یہ سب اسی بدمعاش شخص کی وجہ سے ہوا ہے۔ اُسے اس قدر شدید رنج ہوا کہ اُس کے ذہن میں ہر قیمت پر بدلہ لینے کی خواہش پیدا ہوئی خواہ جان ہی چلی جائے۔

وہ تمام رات اللہ کے حضور دعائیں کرتا رہا مگر اُسے طمانیت نصیب نہ ہوئی۔ اگلے دن وہ سیمیونچ کے قریب نہ پھٹکا، اسی طرح ہفتے گزر گئے۔ راتوں کو ایکسینوف کو نیند نہ آتی۔ وہ اسی اُدھیڑبُن میں رہتا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔

ایک دن ایکسینوف جیل کی راہداری میں چہل قدمی کر رہا تھا تو اس نے دیکھا، قیدیوں کی بیٹھنے والی چوبی نشست کے نیچے سے مٹی اُبھر کر برآمد ہوئی۔ وہ دیکھنے کے لیے رکا ہی تھا کہ اچانک سیمیونچ رینگتا ہوا چوبی نشست کے نیچے سے باہر نکل آیا اور اپنا خوفناک چہرہ لیے ایکسینوف کی طرف دیکھنے لگا۔ ایکسینوف نے توجہ دیے بغیر آگے نکلنے کی کوشش کی تو سیمیونچ نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ کہنے لگا کہ اُس نے دیوار کے نیچے سے سوراخ نکال لیا ہے۔ مٹی کو ٹھکانے لگانے کے لیے وہ اسے اپنے لمبے بوٹوں میں بھر لیتا ہے۔ جب قیدی کام کے لیے جاتے تو وہ مٹی سڑک پر ڈال دیتا۔

''بوڑھے میاں! آپ کو خاموش رہنا ہے۔ اس طرح آپ بھی یہاں سے نکل جائیں گے۔ اگر آپ نے کسی کو اس کی بھنک بھی ڈال دی تو یہ لوگ مجھے کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیں گے۔ مگر اس سے قبل میں آپ کو ہلاک کر دوں گا۔''

ایکسینوف اپنے دشمن کو دیکھ کر غصہ سے لرزنے لگا۔

اُس نے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا ''میں فرار ہونے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا لہٰذا آپ کو مجھے ہلاک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی آپ تو مجھے بہت پہلے ہلاک کر چکے۔ جہاں تک جوابی سلوک کا تعلق ہے، میں ایسا کروں گا یا نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر منحصر ہے۔''

دوسرے روز جب قیدی کام پر جا رہے تھے تو حفاظتی دستے کے سپاہیوں نے دیکھا کہ کسی نے اپنے مٹی بھرے بوٹ سڑک پر خالی کر رکھے ہیں۔ فوراً جیل کی تلاشی لی گئی تو سرنگ کی نشاندہی ہوگئی۔ گورنر نے موقع پر آکر قیدیوں سے سوالات کیے تاکہ اس بات کا سراغ لگایا جائے، کس نے سرنگ کھودی ہے۔ سب قیدیوں نے انکار کیا اور جو جانتے تھے، انھوں نے بھی سیمیونچ کا راز افشا نہ کیا۔ وہ جانتے تھے کہ حقیقت کھلنے پر سیمیونچ کو کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا جاتا۔

بالآخر گورنر ایکسینوف کی طرف متوجہ ہوا جب وہ منصف مزاج سمجھتا تھا اور کہا ''آپ ایک سچے انسان ہیں۔ اللہ کو حاضر ناظر جان کر بتائیے کہ سرنگ کس نے کھودی؟''

سیمیونچ لاتعلق سا گورنر کی جانب دیکھتا رہا۔ ایکسینوف کی طرف سے بھی اُس نے بے توجہی ہی برتی۔ ایکسینوف کے ہونٹ اور ہاتھ کپکپائے اور کافی دیر تک وہ ایک لفظ بھی نہ بول پایا۔ ایکسینوف نے پھر سوچا ''وہ ایسے شخص کی پردہ پوشی کیوں کرے جس نے اُس کی زندگی برباد کر دی تھی؟''

مجھے سیمیونچ سے جو کرب و اذیت پہنچی، اُس کی سزا اُسے ملنی چاہیے۔ لیکن میں نے بتا دیا تو وہ یقیناً کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیں گے۔ پھر ہوسکتا ہے میرا اُسے مجرم سمجھنے کا فیصلہ درست نہ ہو۔ یہ بھی غور طلب بات ہے کہ اسے سزا ملنے سے میرا کیا فائدہ ہوگا؟''

''اچھا تو بزرگ آدمی!'' گورنر نے اُسے پکارتے ہوئے کہا ''مجھے بتائیے کہ دیوار کے نیچے سے سرنگ کس نے نکالی ہے؟''

ایکسینوف نے ماکر سیمیونچ کی جانب سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ''جناب! میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ

تنہائی

یہی تنہائی جب رینگتی رینگتی عمر کے آخری حصے میں پہنچتی ہے تو آدمی انسانوں کی بولی سمجھنے سے قاصر ہونے لگتا ہے، پھر وہ پھولوں، جانوروں، دیواروں اور موسموں سے ڈائیلاگ شروع کر دیتا ہے۔ ایک بھرے گھر میں جہاں اس کی بے پناہ عزت ہوتی ہے جہاں اسے بے پناہ مان دیا جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو ایک پرانی کرسی، ایک ادھ کھلے دریچے اور بند کتاب سے قریب تر پاتا ہے۔ اس کی اُداسی میں اُس وقت مزید اضافہ ہوجاتا ہے جب اُس کے بچے اس کے لیے فادرز ڈے یا مدرز ڈے کا اہتمام کرتے ہیں۔

اس کی تنہائی اُس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ان کے گھر کو کسی اہم کام کے سلسلے میں ان سے مشورہ لیتے یا ان کے فیصلوں پر سر جھکا دیتے ہیں۔ اس عمر میں کوئی طویل بیماری ان کی تنہائی کم کرنے میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اصل میں تکبر اور زعم کا ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے تنہائی، مفارقت! اگر کوئی بھی معمولی آدمی تخلیقی قوتوں سے تخلیق کے کرشموں سے آشنائی کا خواہش مند ہو تو اسے ایک طویل عرصے کے لیے اپنے آپ کو تنہائی کے حوالے کرنا پڑے گا۔ جب تنہائی اس کا خون چوسے گی، اس کی صحت تباہ کرے گی، اس کے عزم و اعتماد کو دیمک کی طرح چاٹے اور اس کے ایمان اور خوشی کو گھن بن کر کھا جائے گی تو پھر آہستہ آہستہ اسے تخلیق کا عرفان ہونے لگے گا۔ تخلیقی عمل کا شعور پیدا ہونے لگے گا۔

(اشفاق احمد کی ''سفر در سفر'' سے اقتباس)

کی یہ مرضی نہیں کہ میں کچھ بتاؤں۔ آپ میرے ساتھ جو سلوک بھی چاہیں کر سکتے ہیں، حاضر ہوں۔"

گورنر نے پوچھنے کی کوشش کی اور اُسے بہت سمجھایا بجھایا مگر ایکسینوف نے مزید کچھ نہ کہا۔ چنانچہ تفتیش کا معاملہ رک گیا۔ اُس رات ایکسینوف کو بستر پر لیٹے ابھی اونگھ ہی آئی تھی کہ کوئی خاموشی سے اُس کے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے اندھیرے میں غور سے دیکھا تو پہچان گیا..... وہ سمیونچ تھا۔

"تم مجھ سے مزید کیا چاہتے ہو؟" ایکسینوف نے پوچھا۔ سمیونچ خاموش رہا۔ ایکسینوف اٹھ کر بیٹھ گیا اور کہا "کیا چاہتے ہو؟ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں پہریدار کو بلا لوں گا۔"

سمیونچ اس کے اوپر جھکا اور آہستہ سے بولا "ایکسینوف! مجھے معاف کر دو۔"

"کس بات پر؟" ایکسینوف نے کہا۔

"میں نے ہی تاجر کو قتل کیا تھا اور آلۂ قتل تمھارے سامان میں چھپا دیا۔ میں تمھیں بھی قتل کرنا دینا چاہتا تھا مگر مجھے باہر کچھ شور سنائی دیا، چنانچہ چاقو سامان میں چھپایا اور کھڑکی کے راستے باہر نکل گیا۔" سمیونچ نے انکشاف کیا۔

ایکسینوف کو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ سمیونچ زمین پر جھکا اور کہنے لگا "ایکسینوف! مجھے معاف کر دو۔ اللہ کے لیے مجھے معاف کر دو۔ میں اقرار کر لوں گا کہ تاجر کو میں نے قتل کیا تھا۔ چنانچہ آپ رہا ہو کر اپنے گھر چلے جائیں گے۔"

"تمھارے لیے یہ کہنا بہت آسان ہے۔ مگر میں نے تمھاری وجہ سے ۲۶ سال بڑی اذیت سے گزارے ہیں۔ اب میں کہاں جاؤں؟ میری بیوی فوت ہو چکی اور میرے بچے..... وہ مجھے بھول چکے۔ اب کوئی بھی ایسی جگہ نہیں جہاں میں چلا جاؤں۔"

سمیونچ اپنی جگہ سے نہ ہلا اور ایکسینوف کی بات سن کر زور زور سے اپنا سر زمین پر پٹخنے لگا۔ "ایکسینوف مجھے معاف کر دو۔" اس نے بلند آواز سے روتے ہوئے کہا۔

ایکسینوف بولا "جب انھوں نے مجھے کوڑے مارے تو اُن کا درد اتنا شدید نہیں تھا جتنا مجھے تم سے مل کر ہوا۔"

سمیونچ اُس کی بات کاٹتے ہوئے بولا "اور پھر بھی آپ نے مجھ پر ترس کھایا اور گورنر کو میرے جرم کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ اللہ کے واسطے مجھے معاف کر دو۔ میں بدترین انسان ہوں، بہت بُرا..... بہت بُرا۔" وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگا۔

جب ایکسینوف نے اُسے روتے دیکھا تو وہ بھی رونے لگا۔ "اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے گا۔" اس نے کہا۔ "ہو سکتا ہے اعمال کے اعتبار سے میں آپ سے ۱۰۰ گنا زیادہ گیا گزرا ہوں۔" یہ کہہ کر ایکسینوف کے جی کو کچھ ڈھارس ہو گئی۔ اُس کے من سے گھر کی خواہش جاتی رہی۔ اب اس میں جیل چھوڑنے کی کوئی خواہش نہ رہی تھی۔ بس یہی تمنا پیدا ہو گئی کہ اب اُس کا آخری وقت آ جائے تو بہتر ہے۔

ایکسینوف نے اقرارِ جرم کے ارادے سے اتفاق نہیں کیا تھا لیکن سمیونچ نے حکام کے سامنے اپنا یہ جرم تسلیم کر لیا کہ تاجر کا قتل اسی نے کیا تھا۔ جب داروغہ ایکسینوف کی رہائی کا حکم لے کر آیا تو وہ اپنے قید خانے میں ساکت بیٹھا تھا۔ جب داروغہ نے اسے ہلایا تو وہ لڑھک کر نیچے جا گرا..... وہ بڑی خاموشی سے تمام مصائب سے چھٹکارا پا گیا تھا۔

اس کہانی کے مترجم سید شفقات احمد ساجد نے پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۹ء سے ایم اے کیا۔ ۱۹۷۱ء میں قانون کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۷۴ء میں سول ججز کے مقابلے کا امتحان پاس کیا۔ بھلوال میں پہلی تعیناتی ہوئی۔ ۲۰۰۷ء میں ایڈیشنل سیشن جج احتساب عدالت کے طور پر سبکدوش ہوئے۔

تازہ کہانی

اللہ کی مرضی

جاوید بسام

ایک سعید روح کا قصۂ جاں فزا
وہ نہیں جانتے تھے کہ آزمایش
کی شکلیں کتنی ہوتی ہیں اور کبھی کبھی
اِسے لال پر بھی لگے ہوتے ہیں

چچا

باقر چھت پر پہنچے تو ان کی نظر کوے پر پڑی۔ وہ منڈیر پر بیٹھا کچھ کھا رہا تھا۔ انھوں نے اپنے سامان پر نظر دوڑائی تو گزر بسر نظر آئی۔ سوکھنے کے لیے رکھی گئی بڑیاں (دال کی بنی ٹکیاں) کئی جگہ سے بے ترتیب ہوگئی تھیں۔ ''اس کوے نے تو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔'' وہ بڑبڑائے اور ان ٹکیوں کو ہٹا دیا جن پر پنجوں کے نشان نظر آرہے تھے۔ کوے نے اپنا کھانا ختم کرلیا تھا۔ اب دوبارہ تاک میں لگ گیا۔ وہ غصے سے اٹھے اور اسے ہش ہش کر کے اڑایا۔ وہ اڑ کر کوٹھری کی چھت پر جا بیٹھا۔ چچا آگے بڑھے تو وہ کبوتروں کی چھتری پر چلا گیا۔ وہ واپس اپنے سامان کے پاس آ بیٹھے۔ سوچ رہے تھے کہ پھر اس کی نگرانی میں یہاں بیٹھنا پڑے گا۔

باقر چچا بڑیاں بنا کر بیچتے تھے۔ عرصے سے ان کا یہی کام تھا۔ شہر کے پرانے علاقے میں دو منزلہ عمارت میں رہتے تھے۔ چھت بھی ان کے پاس تھی۔ نیچے بازار میں ہی ان کی دکان بھی تھی۔ بڑیاں بنانے کے لیے وہ مختلف دالوں کو پیستے، ان میں نمک مرچ اور دوسرے مسالے ملاتے، پھر چھوٹی چھوٹی ٹکیاں بنا کر دھوپ میں سکھا لیتے۔ ان کی بنائی چٹ پٹی بڑیوں کی دور دور تک مانگ تھی، سستے زمانے میں تو وہ بخوبی گزر بسر کرلیا کرتے۔ لیکن جب سے مہنگائی کو پر لگے تھے، انھیں بھی مشکل ہونے لگی تھی۔

وہ اٹھ کر دیوار تک آئے اور نیچے جھانکا، بازار میں ہجوم تھا۔ کام کا وقت تھا، لیکن کوے کی وجہ سے بیٹھنا پڑ رہا تھا۔ ان کا دھیان دکان میں لگا تھا۔ اگرچہ وہ برابر والے دکاندار کو کہہ آئے تھے، لیکن کوئی کب تک دوسرے کا خیال رکھے؟ کوا اسی طرح چھتری پر بیٹھا تھا جیسے انتظار کر رہا ہو، اس کی نظریں نیچے بڑیوں پر لگی تھیں۔ وہ انھیں کئی دن سے تنگ کر رہا تھا۔ جب بھی موقع ملتا، وہ بھی نظر بچا کر اور کبھی نظروں کے سامنے دھڑلے سے بڑی کے لیے اڑتا۔ بقیہ پنجوں سے خراب الگ کرتا۔ وہ سخت پریشان تھے۔ کوے کے پروں پر کہیں سے لال رنگ لگ گیا تھا۔ اسی لیے وہ اسے پہچاننے لگے تھے۔ ورنہ کوے تو اور بھی اڑتے پھرتے تھے، لیکن وہ کچھ زیادہ ہی چنورا واقع ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے بڑیوں کی سینیاں اٹھا کر کوٹھری میں رکھیں اور دروازہ اچھی طرح بند کر کے دکان پر چلے گئے۔ کوا ابھی تک اپنی جگہ ٹہل رہا تھا۔

دوسرے دن جب وہ چھت پر پہنچے تو کوا سامنے عمارت کی منڈیر پر بیٹھا تھا۔ انھیں دیکھ کر فوراً چھتری پر چلا آیا۔ چچا نے سوچا، یہ کل کی طرح پھر پریشان کرے گا لہٰذا اس کی خوراک کا بندوبست پہلے ہی کر دوں۔ وہ نیچے گئے اور روٹی کے ٹکڑے پر سالن لگا کر لے آئے۔ کوے نے للچائی نظروں سے ٹکڑا دیکھا اور اڑ کر چھت پر آگیا۔ ٹکڑا چونچ میں دبایا اور منڈیر پر اڑ گیا۔ لیکن تھوڑا سا کھا کر ہی اس نے ٹکڑا گرا دیا۔ اس کی نظریں بڑیوں کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں۔ ''لو..... ٹکڑے کو روٹی ہی پسند نہیں۔'' باقر چچا نے خود کلامی کی۔ خیر انھوں نے اپنا کام شروع کیا۔

پیسائی کے بعد جب وہ ٹکیاں بنا رہے تھے تو کوا بے چینی سے منڈیر پر ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد چچا پیچھے سے کچھ اٹھانے گھومے تو وہ پھرتی سے ایک ٹکیہ لے اڑا۔ باقر چچا زور سے چیخے تو وہ سامنے والی عمارت کی چھت پر جا بیٹھا اور مزے سے بڑی کھانے لگا۔ اس دن بھی انھیں ایک گھنٹے تک وہاں چوکیداری کرنی پڑی۔ وہ سوچ رہے تھے، اس کا کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔

فارغ ہو کر وہ دکان پر آئے تو بجلی کا بل آیا پڑا تھا۔ اٹھا کر دیکھا تو ہندسے آسمان کو چھو رہے تھے ''یا اللہ اتنا بل! یہاں اتنی بجلی تو استعمال نہیں ہوتی۔'' انھوں نے سوچتے ہوئے گردن اوپر اٹھائی جہاں ۲/ بلب اور ایک پنکھا لگا تھا۔

پڑوسی دکان دار لڑکا ان کی پریشانی بھانپ کر بولا ''کیا ہوا چچا، کیوں پریشان ہو؟''

انھوں نے بل دکھایا تو بولا ''چچا بجلی کے نرخ ہر مہینے بڑھائے جا رہے ہیں، بل تو زیادہ آئے گا۔''

''آخر یہ بجلی کتنی مہنگی کریں گے؟'' وہ بولے۔

لڑکا بولا ''سنا ہے، بچیس تیس روپے کا یونٹ ہو جائے گا، پھر ہم روشنی جلا کر صرف یہ دیکھیں گے کہ ماچس کہاں ہے تاکہ اپنے اپنے دیے جلا لیں۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔

''میاں! ماچس بھی کہاں سستی ہے۔ ہمارے زمانے میں ۲/ آنے کی چار آجاتی تھیں۔''

لڑکے نے قہقہہ لگایا اور بولا ''پتا نہیں کس زمانے کی بات کر رہے ہو۔''

''تمھارا بل کتنا آیا ہے؟'' چچا نے پوچھا۔

لڑکا رازداری سے مسکرایا اور بل ان کے آگے کر دیا۔ چچا یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے آدھے بل سے بھی کم ہے۔ ''میاں! یہ کیا، اتنا کم بل؟'' وہ اس کی دکان پر نظر دوڑاتے ہوئے بولے جہاں چھ سات بلب اور ۲/ پنکھے لگے تھے۔

''ہمارا تو اتنا ہی بل آتا ہے۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''لیکن کیسے؟''

''فنکاری چچا، فنکاری۔''

''کیا مطلب؟''

''چچا بہت ہی بھولے ہو، تمھیں یاد نہیں، چھ سات مہینے پہلے میرا الیکٹریشن دوست آیا تھا۔ میں نے تم سے بھی کہا تھا، لیکن تم نہیں مانے تھے۔''

''اچھا..... اچھا'' وہ یاد کرتے ہوئے بولے۔ ''نہیں بھئی، ہم ایسا کام نہیں کرتے۔'' وہ دکان داری کی طرف متوجہ ہوگئے۔

اگلی صبح گھر کا بل بھی آگیا۔ وہ بھی زیادہ تھا۔ انھوں نے دونوں کے ہندسے جوڑے تو کئی ہزار روپے تک جا پہنچے۔ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئے۔ اس دن چھت پر کوئی کام نہ تھا۔ وہ دکان جانے کے لیے دروازے سے باہر نکلے تو اوپر سے کائیں کائیں کی آواز آئی۔ گردن اٹھا کر دیکھا تو کھڑکی کے چھجے پر وہی کوا بیٹھا تھا۔ لگتا تھا اس نے اسی کو گھر بنا لیا ہے۔ ''لو..... موئے نے یہیں ڈیرہ ڈال لیا ہے۔'' انھوں نے سوچا اور دکان کی طرف بڑھ گئے۔

دوپہر تک وہ دکان پر بیٹھے رہے لیکن کوئی گاہک نہ آیا۔ کام مندہ تھا۔ وہ سوچ میں گم پہلو بدلتے رہے۔ پڑوسی لڑکے نے پھر باتیں شروع کر دیں۔ ''چچا کیوں اداس بیٹھے ہو؟''

''بھئی آج بازار کچھ مندہ ہے۔ بل بھی بھرنے ہیں۔'' وہ بولے۔

''کیا گھر کا بل بھی آگیا؟''

''ہاں..... وہ بھی زیادہ آیا ہے۔''

''وہ تو آئے گا۔ میری بات مان لو، دوست کا نمبر میرے پاس ہے۔ وہ دوسروں سے ہزار لیتا ہے، تمھارے لیے ۵۰۰/ روپے کرا دوں گا۔''

''نہیں میاں! ہم چوری نہیں کرتے۔''

''چچا! آج کل ہر کوئی یہی کر رہا ہے، یہ کوئی چوری نہیں۔''

''اچھا۔'' وہ دھیرے سے بولے۔

''ہاں کہو تو ابھی فون کر دوں؟'' وہ موبائل فون نکالتے ہوئے بولا۔

وہ خاموش رہے۔

''بس میں بلا رہا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔'' وہ فون پر بات کرنے لگا۔ پھر فارغ ہو کر بولا ''بات ہوگئی ہے، وہ کل صبح آئے گا۔''

باقر چچا اس طرح سر جھکائے بیٹھے تھے جیسے چوری کرتے پکڑے گئے ہوں۔

ان کا ضمیر انھیں کچوکے لگا رہا تھا۔ انھوں نے زندگی میں کبھی چوری نہیں کی تھی، کبھی کسی کا پیسا نہیں کھایا تھا۔ وہ تو ادھار اور قرض کو بھی بُرا سمجھتے اور اس سے دور رہتے تھے۔ ہمیشہ اپنی چادر کے مطابق کام کرتے لیکن اب چادر دن بدن سکڑتی جا رہی تھی۔ صبح دکان کھولتے ہی الیکٹریشن چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں اوزار تھے اور منہ میں پان بھرا تھا۔ پڑوسی بولا ''چچا! اسے اپنا میٹر دکھا دو۔''

وہ بت بنے بیٹھے رہے۔

''چچا! جاؤ، اسے اپنا میٹر بتاؤ۔'' لڑکا زور سے بولا۔

''رہنے دو بیٹا، ہم سے یہ کام نہ ہوگا۔'' وہ دھیرے

سے بولے۔

''چچا! بے وقوف نہ بنو، یہ اتنی دور سے صرف تمھارا ہی کام کرنے آیا ہے۔''

''ہم نے نہیں کرانا کام وام.....'' وہ گرجے۔ ان کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ ان کے سمجھے میں کوئی ایسی بات تھی کہ لڑکا دوبارہ کچھ نہ بولا اور اپنے دوست کو چائے پلانے ہوٹل لے گیا۔

دوپہر تک وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھے رہے۔ آج بھی بازار سست تھا۔ ظہر کے وقت وہ نماز پڑھنے اٹھے۔ نماز پڑھ کر آئے تو دکان پر ایک شخص کھڑا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ایک بڑا بیوپاری تھا۔ مختلف شہروں میں اس کی کئی دکانیں تھیں۔ وہ دو تین ہفتے بعد ان کی دکان کا چکر لگاتا اور خریداری کرتا۔ وہ گرم جوشی سے ملا اور بولا ''چچا کہاں ہو۔ جب بھی آؤ تم نہیں ملتے۔ تمھاری دعا سے ایک اور دکان کھول لی ہے۔ دکھاؤ کیا کیا مال بنایا ہے۔''

باقر چچا تیزی سے بڑیوں کے پیکٹ دکھانے لگے۔ وہ انھیں لیتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ دکان تقریباً خالی ہوگئی بلکہ انھیں گھر سے پیکٹ لا کر دینے پڑے۔ اس نے فوراً بل بنوایا، روپے دیے، پھر بولا ''چچا! اب ہر پندرھواڑے میرے لیے اتنا ہی مال تیار کر کے رکھا کرو۔ ان شاء اللہ میں آن کر لے جایا کروں گا۔''

چچا نے خوشی سے اثبات میں گردن ہلائی اور خدا کا شکر ادا کیا۔

رات کو وہ بیٹھے حساب کتاب کرتے رہے۔ سب سے پہلے انھوں نے بل کے روپے الگ کیے۔ وہ پھر اگلے دن کا پروگرام بنانے لگے۔ صبح پہلے بل جمع کرانے تھے۔ پھر دالیں اور مسالے خریدنے تھے۔ انھوں نے سوچا، کل دکان دیر سے کھولوں گا۔ کوے کا بھی کچھ بندوبست کرنا پڑے گا۔ اگر لکڑی کے چوکھٹے فریم بنا کر ان پر جالی لگالی جائے تو بڑیاں ڈھکی جاسکتی ہیں۔ وہ سوچتے رہے پھر سو گئے۔ وہ جلد سو جاتے تھے۔

ابھی زیادہ رات نہیں ہوئی تھی کہ اچانک بجلی چلی گئی۔

مقصدِ حیات

انسان کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک کا سفر اس برق رفتاری سے گزرتا چلا جاتا ہے کہ انسان کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ کبھی دُنیا کی رنگینیوں میں کھو کر اور کبھی رشتوں کو نبھاتے نبھاتے انسان کی زندگی بند مٹھی میں ریت کے مانند اُس کے ہاتھوں سے پھسلتی چلی جاتی ہے اور وہ کبھی اپنا مقصدِ حیات سمجھ ہی نہیں پاتا۔

مقصدِ حیات سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر چھپی صلاحیتوں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہر کسی کو کسی نہ کسی خاص صلاحیت سے نوازا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ کس طرح اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔

(ابومیسون اللہ بخش، ملتان)

ان کی آنکھ کھلی تو گلی سے لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ کھڑکی میں آئے تو پتا چلا، تار گر گیا ہے۔ کچھ گھروں کی بجلی چلی گئی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا، اوپر سے کوئی چیز آ کر لگی ہے۔ وہ دوبارہ سو گئے۔ رات کو کسی وقت بجلی آگئی۔

صبح وہ سویرے جاگ گئے۔ چچا صبح کی سیر کے عادی تھے۔ نماز پڑھ کر نکلے تو چند قدم چل کر رہی ان کی نظر ایک مرے کوے پر پڑی۔ وہ کوے سے اتنا تنگ آئے ہوئے تھے کہ بے خیالی میں اُسے دیکھنے رک گئے۔ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کا ایک پر لال ہے۔ انھوں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو کھڑکی کا چھجا نظر آیا۔ ساتھ ہی وہ تار بھی جو رات کو ٹوٹ گیا تھا۔ چچا سوچنے لگے، بے چارے کی قضا آئی جو تار سے ٹکرا گیا۔ انھیں افسوس ہو رہا تھا۔ ''خیر اللہ کی یہی مرضی ہوگی۔'' وہ یہ سوچتے اور تسبیح پڑھتے آگے بڑھ گئے۔ کچھ دیر بعد گلی میں خاکروب آیا اور مرا ہوا کوا اپنی جھنجھ گاڑی میں ڈال کر لے گیا۔

طویل کہانی

تاریخی حقائق سے کشید کی گئی بیش قیمت داستان

خاص اُردو ڈائجسٹ کے لیے

مزارِ وفا

ان تلخ تجربوں اور اذیت بھرے لمحوں کی چشم کشا کہانی جن سے گزر کر ہی بڑے فیصلے صادر ہوتے ہیں۔ ایسی کہانیاں کم پڑھنے کو ملتی ہیں

اختر حسین شیخ

جب میں اپنے گروجی کی قبر پر فاتحہ خوانی کرنے گیا تو میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا کیونکہ وہ ہستی جسے میں اپنا گرو تسلیم کر چکا تھا، وطنِ عزیز سے وفا کا سرمایہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اب نہ وہ ہستی رہی نہ وہ بیش قیمت سرمایہ، ہر طرف جہلا کا گروہ تھا جو نفس پرستی میں مصروف و مطمئن تھا۔

میرا پوتا شایان بھی میرے ساتھ تھا جو اچانک چونکا دینے والا سوال کر کے ہم سب کو حیران کر دیا کرتا تھا۔ ہم سب اسے مستقبل کا لڑکا کہتے تھے۔ جب ہم سچی قبر کے قریب پہنچے تو میں نے اس خالی جھونپڑی کو غور سے دیکھا جو میری درس گاہ ہوا کرتی تھی۔ قبر کی حالت خراب ہو چکی تھی لہٰذا میں اس کی صفائی ستھرائی میں مصروف ہوگیا۔ صفائی ستھرائی سے فارغ ہونے کے بعد میں نے تربت کے سرہانے اپنا بنایا ہوا کتبہ گاڑ دیا جس پر صرف دو الفاظ لکھے تھے ''مزارِ وفا''۔ بعدازاں میں نے ایک چراغ روشن کیا اور اسے تربت کے کچے تعویذ پر رکھ دیا۔ چراغ دیکھ کر میرے پوتے نے سوال کیا ''دادا ابو! اس چراغ کی روشنی قبر کے اندر تو جا نہیں سکتی پھر آپ کیوں جلا رہے ہیں؟''

''بیٹا! واقعی روشنی اندر نہیں جاسکتی مگر یہ چراغ میں نے اس لیے روشن کیا کہ اس قبر کے اندر جو نورانی شمع روشن ہے لوگ اس سے باخبر ہو کر اس سے فائدہ اٹھائیں۔''

''دادا ابو! اس قبر میں کون دفن ہے؟'' شایان نے دوسرا سوال کیا۔

''بیٹا! یہ میرا گرو تھا۔ استاد وہ ہے جو اپنے شاگرد کو تعلیم عطا کرتا ہے۔ گرو تعلیم کے ساتھ ساتھ گرگی باتیں بتا کر اپنے شاگرد کی ذہنی تربیت بھی فرماتا ہے۔ اس لیے گرو کا مقام استاد سے بہت اونچا ہے۔

جھونپڑی کے اندر ایک خالی چارپائی جوں کی توں بچھی تھی۔ اس تربت کے اندر مدفون ہستی کا نام تو قرۃ العین تھا مگر میں اور مجھ جیسے دوسرے لوگ اسے

باجی عینی کہا کرتے تھے۔ اس جھونپڑی میں جو بھی آتا جانکاری کے موتی لے کر جاتا۔ اس دور میں یہ موتی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے کیونکہ منہ زور ہوس ابھی اتنی بے لگام نہیں ہوئی تھی۔ میں طویل غیر حاضری کے بعد وہاں آیا تھا کہ اپنے فرائض منصبی کی ادائی کے لیے مجھے پاکستان سے باہر جانا پڑ گیا۔ پوتے کے سوالات سے فارغ ہونے کے بعد میں چارپائی پر بیٹھ کر کتاب ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ پہلی ملاقات کی فلم میرے سامنے چلنے لگی۔

☆☆

یہ ۱۹۵۶ء کے موسم سرما کی بات ہے جب میں معاشرے کو فساد سے پاک رکھنے کا گُر جان چکا تھا۔ میرے خیال میں ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ موقع ملتے ہی شہرِ خموشاں کی حاضری ضرور دے۔ اس سے افراد کا ذہنی قطب نما راہِ راست پر رہتا ہے اور معمولی سمجھ بوجھ والا انسان بھی دوسروں کی حق تلفی سے گریز کرتا ہے۔ اپنے حق سے زیادہ کی طلب ہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ حقیقت یہی ہے، باقی سب زہب داستان کے زمرے میں آتا ہے۔

۱۹۵۶ء کے موسم سرما میں میری رہائش پیسہ اخبار لاہور میں تھی۔ ایک روز میں وردی ہی میں اپنے شوق کی تکمیل کرنے شہرِ خموشاں کی طرف چل نکلا۔ میرا وردی میں ہونا محض اتفاق ہی تھا۔ عموماً لوگ قبرستانوں میں بلاضرورت وردی میں نہیں جاتے۔ البتہ اگر کسی اپنے آدمی کی تدفین مطلوب ہو تو باوردی ہونا ضروری ہے۔ خیر میں پرانی قبور پر فاتحہ خوانی کرتا پھر رہا تھا کہ مجھے ایک جگہ ایک جھونپڑی دکھائی دی جس کے سامنے ادھیڑ عمر خاتون کھڑی تھی۔ وہ بھی ایک وردی پوش کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کرنے لگی۔ بلکہ اس نے آواز دے کر مجھے اپنے قریب بلایا اور کہا ”برخوردار! اس لباس میں کہاں مٹر گشتی کرتے پھر رہے ہو؟“

”کیوں جی! میرے لباس میں کیا خرابی ہے؟“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اور یہ لباس تو میرا کفن ہے جی۔ اب اگر احمق لوگ بے کفن یہاں آتے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور۔“

میرا جواب یقیناً اس خاتون کے لیے غیر متوقع تھا۔ ”تو گویا تم نے اپنے کفن کے لیے وردی کو چُن رکھا ہے؟“ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں جی! لگتا تو ایسا ہی ہے۔ اس سے اچھا کفن اور کون سا ہو سکتا ہے؟“ یہ سن کر اس نے مجھے جھونپڑی کے اندر آنے کو کہا لہٰذا میں سنبھل کر چارپائی پر بیٹھ گیا کیوں کہ وردی میں زمین پر بیٹھنا مناسب نہیں تھا۔ یہ بات وردی کے آداب میں شمار ہوتی ہے۔ پھر تعارف کا سلسلہ چل نکلا تو میں نے پہلے اپنا تعارف کرایا جسے سن کر وہ خاتون خوش ہوگئی۔ اس نے کہا ”تو گویا تم وطن کی فضاؤں کے محافظ ہو؟ بہت خوب۔ میں اس جگہ ایک عرصے سے رہائش پذیر ہوں۔ یہاں منافقت اور جعل سازیوں کا حال زرا دوسرا ہے۔“

یہ ہماری پہلی ملاقات تھی اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو صدقِ دل سے پسند کرلیا۔ اسے میرا انداز بود و باش اچھا لگا اور مجھے اس کی گفتگو پسند آئی۔ یوں ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ میری موجودگی ہی میں دو تین حضرات آئے اور خیر خبر لے کر چلے گئے۔ ہر آنے والا اسے باجی عینی کہہ رہا تھا۔ ہر فرد کا انداز احترام دیدنی تھا۔

ایک روز میں نے باجی عینی کی زندگی کے متعلق سوالات کیے تو اس نے کمال فراخ دلی سے مجھے بہت کچھ بتاتے ہوئے کہا ”برخوردار! تم مجھے اچھے لگے ہو۔ لہٰذا میں تمہیں اپنی طویل داستان ضرور سناؤں گی۔“ باجی عینی نے پھر داستان گو کے انداز میں اپنی کہانی کا آغاز کیا تو میں بس مسحور ہو کر رہ گیا۔ یہ باجی عینی نہیں بلکہ پاکستان کی داستانِ خراش تھی۔ اہم بات یہ کہ باجی کا اندازِ فکر ہو بہو میری سوچ کے عین مطابق تھا۔

”میں کانپور کے متمول گھرانے میں پیدا ہوئی۔ ہماری وسیع و عریض حویلی کان پور کی اس جامع مسجد کے قریب تھی جس کی شہادت سے برصغیر کے طول و عرض میں آتشِ فساد کے شعلے بھڑک اٹھے۔“ میرے سوال کرنے سے پہلے ہی باجی نے اس شہادت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ”عالمی جنگ سے پہلے کانپور کا ہوائی اڈہ ”بمبر ونی“ ایشیا کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ قرار دیا جاتا تھا۔ اسی کی تعمیر نے میرے والد کو متمول بنا دیا تھا۔ جی ہاں! یہ ہوائی اڈہ میرے والد صاحب نے تعمیر کرایا تھا۔ حکمرانوں کو اس ہوائی اڈے تک پہنچنے کے لیے سیدھی سڑک درکار تھی مگر ایک جگہ راستے میں جامع مسجد پڑتی تھی۔ لہٰذا بلدیہ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسجد شہید کر کے سڑک کی بجی دور کی جائے۔ اس فیصلے نے برصغیر کے مسلمانوں کو مشتعل کر دیا اور وہ جلوس نکالنے لگے تب حکمرانوں نے اس ہجوم کو گولیوں سے بھون کے رکھ دیا۔ یوں فساد کی آگ نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تاریخ میں اسے کانپور کا ہولناک فساد لکھا گیا ہے۔

ہمارا خاندان مال و دولت کے علاوہ امتِ مسلمہ سے وفاداری اور غیر مسلموں سے ہمدردی کی وجہ سے سارے شہر میں مشہور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے بیگانے ہمارے خاندان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ میری تربیت سچائی پر استوار سیاسی ماحول میں ہوئی۔ جب میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو پیر پور رپورٹ کا بہت چرچا تھا۔ اسی رپورٹ کو پڑھ کر قائداعظمؒ نے للکار کر کہا تھا کہ اب یا کبھی نہیں (Now or Never)۔

۱۹۳۴ء میں قائداعظمؒ لندن میں قیام پذیر تھے۔ انھوں نے خوساختہ جلاوطنی اپنا رکھی تھی مگر لیاقت علی خان کی کاوشیں رنگ لائیں اور انھوں نے قائد کو ہند میں آ کر مسلمانوں کی راہنمائی پر راضی کرلیا۔ میرے خیال میں پاکستان اسی روز معرضِ وجود میں آگیا تھا جس دن قائداعظمؒ نے سرزمینِ ہند پر قدم رکھا۔ نامساعد حالات نے مسلمانوں کو متحد ہونے پر گویا مجبور کر دیا۔ اکثر اوقات نامساعد حالات کامیابی کی ضمانت بن جاتے ہیں؟

انڈین ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کی رو سے ہند میں بلدیاتی انتخابات ۱۹۳۸ء میں ہونا قرار پائے۔ زمانہ گواہ ہے کہ قائداعظمؒ ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے داعی تھے۔ کانگریسی نیتا بھی انہیں سفیرِ امن اور دیگر بہت سے القابات سے نوازتے رہتے تھے۔ ان انتخابات نے کانگریس کا اصل چہرہ بے نقاب کر ڈالا اور قائداعظمؒ بھی بدلے ہوئے حالات کے مطابق عمل پیرا ہونے پر مجبور ہوگئے۔“ یہ کہہ کر باجی عینی تھوڑی دیر کے لیے رک گئی، پھر دم لے کر پُراسرار انداز میں لب کشا ہوئی:

”ان انتخابات میں مسلم لیگ ۴۸۲/نشستوں میں سے صرف ۱۰۲/ پر کامیاب ہوئی جبکہ کانگریس ۱۷۷/ پر اور ۷۰۲/ نشستیں لے گئی۔ پنجاب میں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی بھی کافی نشستوں پر کامیاب ہوئی۔ حد یہ کہ کانگریس نے ۵۸/ عدد مسلم نشستوں میں سے بھی ۲۶/ پر کامیابی حاصل کر لی۔ اس طرح کانگریسی نیتاؤں نے ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی کا اعلان کر دیا۔ یہ صورتِ حال بڑی تشویش ناک تھی۔

اس وقت مسلمانوں کی تعداد ۸/ کروڑ کے قریب تھی مگر وہ گروہوں میں تقسیم تھے۔ اب قائداعظمؒ نے ان گروہوں کو ایک قوم بنانا تھا۔ یہ بات بظاہر کوئی مشکل نہ تھی کہ اس بے سمت ہجوم کو صرف ایک سمت سے روشناس کرانے کی ضرورت تھی۔ مگر عملاً یہ کام جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ زمینی حقیقت تو یہ بھی تھی کہ دیوبندی علما کرام کا ایک حصہ قائداعظمؒ کو بے ریش اور مذہب سے بیگانہ سرپھرا نوجوان کہتا پھرتا تھا۔ بہرحال اس فتح کے نتیجے میں کانگریس نے گیارہ صوبوں میں سے ۸/ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

ہندو طویل عرصے سے محکوم چلے آ رہے تھے۔ اب بھی وہ محکوم ہی تھے مگر اب ان کے حاکم بدل گئے۔ جبکہ مسلمانوں نے طویل مدت تک ہند پر حکمرانی کی تھی اور انگریزوں نے کاروبارِ حکومت انہی سے ہتھیایا تھا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ فرنگی سرکار مسلمانوں سے خائف تھی اور غیر مسلموں کو بلاجواز سہولتیں فراہم کرنے لگی۔ سیانے کہتے ہیں کہ جب تک لکڑی لوہے کے کلہاڑے کا ساتھ نہ دے، کلہاڑا تیزی سے لکڑیاں کاٹ ہی نہیں سکتا۔ اسی کے مصداق کانگریس کے ایک معروف مسلمان راہنما

مولانا عبدالکلام نے نیا تعلیمی نظام متعارف کرایا جسے واردھا سکیم کہتے ہیں۔ اس کا واحد مقصد مسلمانوں کو ہندوتہذیب میں مدغم کرکے ہندوستان میں ایک قوم تیار کرنا تھا۔ اِدھر ہندوؤں نے ۶ رصوبوں میں رام راج قائم کرنے کا آغاز کردیا۔

تعلیمی اداروں میں رُسوائے زمانہ ترانہ بندے ماترم لازمی قرار دیا گیا۔ اس سے مسلمانوں کی توہین ہونے لگی۔ ہندی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا۔ مساجد میں اذان پر پابندی لگا دی گئی کہ اس سے غیرمسلموں کی سمع خراشی ہوتی تھی۔ ہندو مسلم اندازِ فکر میں اتنا بُعد تھا کہ ہندو، کلمۂ طیبہ کے الفاظ کو ان ہونے شبد مُراد قرار دیتے اور کوئی انہیں اپنی زبان سے ادا نہ کرتا۔

اس کے علاوہ گائے ذبح کرنے پر سخت پابندی لگا دی گئی۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائیں دی جانے لگیں۔ دکھ دینے والی اور بھی بہت سی باتیں تھیں۔ مثلاً مساجد میں باجماعت نماز کے اوقات میں خنزیر کی تھوتھنی نمازیوں کے سامنے پھینکی جانے لگی۔ یہ تھوتھنیاں عام لوگوں میں بھی پھینک دی جاتی۔ اشتعال انگیزی کا ایک اور حربہ ہندوؤں کے ہاتھ آگیا۔ ایک کرسی پر باریش مسلمان کی تصویر رکھ اس کرسی کو بیل گاڑی وغیرہ پر سجا کر جلوس نکالا جاتا۔ ایک پروہت جی تصویر کی داڑھی پر چھڑی وغیرہ سے ضربیں لگا کر کہتے ''اوئے ملیچھ پاکستان مانگتا ہے۔'' یہ بڑی اشتعال انگیز حرکت تھی مگر وہاں تو قانون کے رکھوالے خود یہ حرکت کروا رہے ہوتے۔ ان واہیات حرکات کی گونج قائداعظمؒ تک پہنچی تو انھوں نے راجہ مہدی علی خاں آف پیر پور کو اس واقعے کی تحقیق کا حکم دیا۔ جو رپورٹ راجہ صاحب نے پیش کی اسے پیر پور رپورٹ کہتے ہیں۔ تحقیق سے ثابت ہوگیا کہ تمام شکایات حقیقت پر مبنی ہیں۔ نتیجے میں قائداعظمؒ نے وہ تاریخی الفاظ ادا فرمائے تھے۔''

باجی عینی تاریخ کے اوراق دہرا رہی تھی اور میرے ذہن میں دوقومی نظریہ پختہ ہوتا جارہا تھا۔ ان حالات میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا الگ الگ ہوجانا ہی مسائل کا حل تھا۔ بعد میں کانگریسی نیتاؤں نے ان اقدامات کو درست قرار دینے کے حق میں طرح طرح کے دلائل پیش کیے، تاویلوں کے انبار لگا دیے مگر تاویلیں، دلیلیں سچائی میں سرِمو تبدیلی نہ لاسکیں۔

''پھر یوں ہوا کہ برطانوی وزیرِاعظم چیمبرلین نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔ ہندوستان نے جنگی ایندھن فراہم کرنا تھا ورنہ برطانیہ خود تو چند جزیروں پر مشتمل چھوٹا سا ملک تھا۔ جنگ میں جرمن قوم کا مقابلہ ان کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ مہاتما گاندھی نے اس موقع سے استفادہ کرتے ہوئے انگریزوں کو ہندوستان سے فوراً نکل جانے کو کہا جسے انہوں نے درخورِاعتنا ہی نہ سمجھا۔ اِدھر ہندی نیتا سرکار کو دھمکیاں دینے لگے اور آخر ان کے وزراء صاحبان صوبائی وزارتوں سے مستعفی ہوگئے۔ اس طرح کانگریس کا ۲۷ سالہ دورِاستبداد اختتام پذیر ہوا اور قائداعظمؒ نے مسلمانوں کو یومِ نجات منانے کی ہدایت فرمائی۔''

یہ کہہ کر باجی ایک بار پھر خاموش ہوگئی۔ میں جانتا تھا کہ اس ذہنی ورزش سے وہ نڈھال سی ہیں۔ ذہن سے پرانی باتیں نکالنا اور وہ بھی سنین و تواریخ کے ساتھ، معمولی بات نہ تھی۔ میں نے ان کو ستانے کے لیے وقت دیتے ہوئے کہا ''اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے اور اپنے لیے چائے کا انتظام کرلوں؟''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں، بس ایک گلاس پانی پلا دو۔'' باجی نے کہا۔ میں نے باہر رکھے مٹکے سے پانی کا گلاس لاکر پیش کردیا۔ باجی پانی پی کر تازہ دم ہوگئیں، تو پھر داستان سنانے لگیں:

'واردھا سکیم کا مقصد مسلمان بچوں کے ذہنوں کو خاص سانچے میں ڈھالنا تھا۔ مگر درس گاہوں میں مہاتما گاندھی کی تصویر کے آگے ڈنڈوت کرانا تو حماقت اور معاندانہ رویے کی انتہا تھی۔ میں سناتن دھرم ہائی سکول میں دسویں جماعت کی طالبہ تھی۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر مہیش داس جی کا خیال تھا کہ میں بورڈ میں پوزیشن لاکر سکول کا نام روشن کروں گی۔ لہٰذا وہ میرے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ جس روز مہاتما جی کی تصویر لاکر ایک چبوترے پر سجائی گئی، اس روز ہمیں بھاشن بھی دیا گیا کہ گاندھی جی سارے ہندوستان کے باپو ہیں۔ لہٰذا ان کی تصویر کا احترام کرنا طالب علموں کا فرض ہے۔ اِدھر میں بچپن ہی سے مزاحمت شکن تھی۔ بھلا میں کسی کی تصویر کو ڈنڈوت کیسے پیش کرسکتی تھی؟

وقارالزماں میرا ہم جماعت اور ہم خیال تھا۔ ہم دونوں نے اس واہیات رسم میں شرکت سے انکار کردیا۔ جس روز اس رسم کا آغاز ہونا تھا میں سکول سے غیرحاضر رہی۔ سالانہ امتحان سر پر تھا۔ لہٰذا ہیڈ ماسٹر صاحب نے غیرحاضری کا سبب پوچھا۔ میں نے صاف بتا دیا کہ میں کسی بت یا اس کی تصویر کے آگے جھکنا پسند نہیں کرتی۔ ہیڈ ماسٹر یہ سن کر پریشان سے ہوگئے۔ میں نے اپنے گھر والوں کو بھی اعتماد میں لے رکھا تھا۔ میرے والد بھی مجھے اس بات پر مجبور نہیں کرسکتے تھے۔ میں نے وقار سے مل کر ایک منصوبہ بنایا جو یقیناً نامناسب بلکہ جوابی حملے کے مترادف تھا۔

چھٹی کے بعد ہم دونوں چُھپ کر واپس سکول پہنچے اور اس تصویر کا حلیہ بگاڑ آئے۔ ہم نے اپنی دواتیں گاندھی جی کے چہرے پر انڈیل دیں۔ دوسرے روز سکول میں کہرام مچ گیا۔ معمولی پوچھ گچھ کے بعد ہماری کارروائی طشت ازبام ہوگئی اور سکول انتظامیہ نے ہم دونوں کو سکول بدر کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔ مگر ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس فیصلے کی شدید مخالفت کی۔ کئی روز تک لے دے ہوتی رہی۔ آخر ہیڈ ماسٹر صاحب جیت گئے۔ اس طرح ہم دونوں نے میٹرک کا امتحان اسی درس گاہ سے پاس کیا۔ ضلع بھر میں دوسری پوزیشن آئی۔ مہیش جی بہت خوش تھے۔

کان پور کے اخبارات نے نمک مرچ لگا کر یہ کہانی شائع کی تو میں اور وقار سارے ضلع میں مشہور ہوگئے۔ حد یہ کہ مسلم لیگی راہنماؤں نے ہمیں رول ماڈل کے طور پر پیش کیا۔ لیکن نتیجہ یہ بھی نکلا کہ غیرمسلم عوام ہماری جان کے دشمن ہوگئے۔ آغاز دھمکیوں سے ہوا، آخر میرے والد نے فیصلہ کیا کہ مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لینا چاہیے۔ میری اور وقار کی شہرت پہلے ہی لاہور پہنچ چکی تھی۔ وقار کے نمبر بھی بہت اچھے تھے۔ اس طرح ہم دونوں لاہور آگئے۔ اس آمد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے ننیال کا تعلق لاہور سے تھا اور وہاں میں ہر طرح سے محفوظ و مطمئن تھی۔ اس دوران وقار میرے بہت قریب آگیا اور سچ تو یہ ہے کہ اس نے کان پور میں میری خوب حفاظت کی تھی۔ دو چار بار تو حریفوں کے دانت کھٹے کردیے تھے۔

اس قربت نے جب محبت وغیرہ کا روپ دھارا تو میں نے صاف الفاظ میں وقار کو ایک بات سمجھائی کہ عشق و عاشقی کے لیے ساری عمر پڑی ہے اور یہ کہ میں اپنا رشتہ تحریکِ پاکستان سے جوڑ چکی۔ لہٰذا اگر میری قربت چاہتے ہو تو اس شے سے محبت کرو جس سے میں پریم کرتی ہوں۔ اگر تم نے سچائی ثابت کردی تو میں تمھیں اپنانے میں فخر محسوس کروں گی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے یہ بات وقار کی سمجھ میں آگئی اور اس نے بھی تحریکِ پاکستان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ اس طرح ہماری منزل ایک ہوگئی۔

۱۹۴۴ء میں جب قائداعظمؒ نے ہندوستان واپس آکر مسلمانوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو ہم دونوں ان کے شیدائی بن چکے تھے۔ اسی دوران ایک بے خبر خاکسار نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس حملے کے بعد وقار تو گویا بھتجے سے اکھڑ گیا۔ بارہا اس نے خاکساروں سے بھڑ جانے کا فیصلہ کیا مگر میں نے اسے قابو میں رکھا کہ وہ وقت آپس میں ٹکراؤ کا ہرگز نہیں بلکہ متحد ہوجانے کا تھا۔

تاریخی اجلاس سے صرف ۳ روز پیشتر اہلِ لاہور کو کڑی آزمایش سے گزرنا پڑا۔ ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء والے دن خاکسار تحریک کے ایک جیش اور فرنگی پولیس کے مابین ٹکراؤ ہوگیا۔ پولیس کی کمان لاہور کے ایس ایس پی بیٹی (BETI) کر رہے تھے۔ اس دور میں پولیس کا معمولی سپاہی بھی دہشت کی علامت تھا۔ یہ کمانڈر تو ایس ایس پی

تھے یعنی ''فیل بے زنجیر۔'' نکراؤ کی وجہ صاف ظاہر تھی، وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایس۔ایس۔پی صاحب نے بیش کو راستے سے ہٹ جانے کا حکم دیا مگر جواباً اسے چپ راست (Left, Right) کی ناپسندیدہ گونج سنائی دی۔

اس زمانے میں نواب شاہنواز خاں ممدوٹ پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے۔ قائداعظمؒ بھی جان چکے تھے کہ پنجاب اور اس کے باشندے تحریک پاکستان میں فیصلہ کن کردار ادا کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ قائداعظمؒ نے صرف ۴ برس کے قلیل عرصے میں مسلمانوں کی تشکیل نو فرما کر انہیں ایک طاقتور قوم میں ڈھال دیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں انتخابات سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا اور حالات کو اپنے حق میں کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ آخر ۱۹۴۰ء کا سورج طلوع ہوا، مسلم لیگ کا ۲۷ رواں اجلاس منعقد کرنے کی خاطر مشاورت ہونے لگی۔ نواب ممدوٹ نے قائداعظمؒ کو یہ جلسہ لاہور میں منعقد کرنے پر راضی کرلیا۔ اس تاریخی اجلاس کی جزئیات تک طے ہوگئیں۔ ہمارا جوش وخروش دیدنی تھا۔''

''باجی ایک بات تو بتائیں، کیا آپ نے قائداعظمؒ کو قریب سے دیکھا تھا؟'' میں نے پہلا سوال کیا اور غور سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''جانم! قریب سے کیا؟ میں وہ لمحات کیسے بھول سکتی ہوں جب انھوں نے میرے سر پر دست شفقت رکھ کر مجھے ثابت قدم رہنے کی تلقین فرمائی تھی۔ وہ واقعی تاریخ ساز شخصیت تھے۔ ان جیسا دوسرا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں، البتہ ان کی نقالی کرنے والے منظر عام پر آتے رہیں گے۔ مگر یہ تمام لوگ مسخرے ہوں گے۔ کون ہے جو قائداعظمؒ جیسا حوصلہ، ہمت اور خلوص بے کنار کا مالک ہو۔ جانم محمد علی جناحؒ امتِ مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی اور خاص الخاص تحفہ تھے۔ خدا ان کے درجات بلند فرمائے۔ انھوں نے کمزور و ناتص خام مال سے ایک طاقتور قوم تیار کرکے اقوامِ عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ مگر افسوس کہ بعد ازاں ان کی کرسی پر پرلے درجے کے نااہل براجمان ہوگئے۔ خدا ان سب کو ہدایت سے نوازے یا اگر ہدایت ان کے نصیب میں نہیں تو ان کا پائیدار بندوبست فرمائے۔''

باجی خاموش ہوگئیں تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا ''آمین۔'' اور بیان جاری رکھنے کی خاطر کہا ''پھر کیا ہوا۔''

''یہ تلخ حقیقت ہے کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ سرسکندر حیات نے اس جلسے کو حیلے سے التوا کا شکار کرنے کی سرتوڑ کوشش فرمائی کیونکہ ان کی یونینسٹ پارٹی تقسیم ہند کے خلاف تھی۔''

''لاحول ولا قوۃ۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا تو باجی مسکرانے لگی۔

''سرسکندر حیات نے پہلا قدم یہ کیا کہ لاہور میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی لیکن منہ زور طوفان کو ریت کی دیوار سے کیسے روکا جاسکتا ہے۔''

''اس حرکت کی وجہ بھی تو رہی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی تو حیرت انگیز بات ہے کہ وزیر اعلیٰ کو اس کا جواز بھی مل گیا۔'' باجی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''ہوا یوں کہ ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء والے دن خاکساروں اور پنجاب پولیس کے اہل کاروں کا ٹکراؤ ہوگیا۔ ایک سمت لاہور پولیس کا ایس ایس پی مسٹر بیٹی اپنے سپاہیوں کے لفٹ رائیٹ کراتے ہوئے آ رہا تھا اور سامنے سے خاکساروں کا جیش چپ راست، چپ راست کرتا دکھائی دیا۔ بیٹی نے جیش کو راستے سے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ اس کا خیال تھا کہ چپ راست کرتے یہ پیلچہ بردار پولیس دیکھ کر بھاگ جائیں گے۔

مگر ہوا یہ کہ خاکساروں نے یہ حکم ماننے سے انکار کردیا بلکہ پولیس اہلکاروں کو راستے سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا؟ اس طرح دونوں فریقین کا ٹکراؤ ہوگیا۔ بیٹی صاحب گھوڑے پر سوار تھے۔ انھوں نے گھوڑے سے اتر کر رعب جمانے کا ارادہ کیا۔ ادھر جیش سالار بھی منہ زور قسم کا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور پوری قوت سے بیلچہ گھما مارا۔ پولیس کمانڈر کا سر پُرغرور کٹ کر زمین پر آرہا۔ سپاہی یہ ان ہوئی دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ کمانڈر کے نائب نے چیخ کر گولی چلانے کا حکم دیا۔ بیلچے لاکھ کارآمد تھے لیکن آتشیں اسلحہ بھی کم نہ تھا۔ اس طرح خاکساروں پر گولیاں کھا کھا کر گرتے گئے۔ ایک دو نہیں پورے ۵۰ جوان فرشِ خاک پر تڑپنے لگے۔ لاتعداد افراد زخمی ہوئے جنھیں میو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

اس طرح لاہور کا سارا ماحول تناؤ کا شکار ہوگیا۔ یہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنے والی بات ہوگئی اور وزیرِ اعلیٰ پنجاب نے تاحکمِ ثانی دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی۔ ۲۱ مارچ ۱۹۴۰ء والے دن قائداعظمؒ لاہور نو لکھا ریلوے اسٹیشن پر تشریف لائے تاکہ تاریخی اجلاس میں تشریف فرما سکیں۔ وقار اور میں استقبال کرنے والوں میں شامل تھے۔ میرا دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا گویا سینے سے باہر آجانے کو بے چین ہو۔ میں نے قائداعظمؒ کے رخِ روشن کی ایک جھلک دیکھی۔ ان کے ساتھ مولانا اے کے فضل حق بھی تھے۔ مگر میں تو اس آفتاب عالم تاب کی نظارگی میں محو تھی۔

ایک پل کے لیے قائداعظمؒ کا چہرہ اوجھل ہوگیا۔ ہوا یہ تھا کہ کوئی اور طالب دیوانہ ہمارے درمیان آگیا۔ یاد نہیں کہ پھر کیا ہوا بس اتنی خبر ہے کہ میں نے اس طالب دیدار کو پوری قوت سے دھکا دیا اور وہ بے چارہ پلیٹ فارم پر گر گیا۔ اللہ میری اس لغزش کو معاف فرمائے۔ قائداعظمؒ نے آواز میں اس لغزش کو معاف فرمائے۔ قائداعظمؒ نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ اب میں ان کو مخاطب کرنا چاہتی تھی مگر مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ پھر میری آنکھیں بھیگ گئیں اور قائداعظمؒ کا چہرہ دھندلا پڑ گیا۔ یہ مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے فوراً آنکھیں صاف کیں اور رندھی ہوئی آواز میں جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ وقار نے بعد میں بتایا کہ میں نے قائداعظمؒ کو ''پاپا جانی'' کہا تھا۔ اس کی وجہ مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ میں نے ان کو پاپا کیوں کہا۔''

''ہائیں پاپا جانی؟'' میں اظہارِ حیرت کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''جی ہاں پاپا جانی، اس وقت قائداعظمؒ ہم سب کے پاپا جانی ہی تو تھے۔ پھر مجھے طلب سے زیادہ مل گیا۔ قائد نے آگے بڑھ کر میرے سر تاتواں پر دستِ شفقت رکھا اور فرمایا: ''بیٹی ہمت سے کام لو، دوسروں کو دھکے نہ دو۔'' یہ کہہ کر باجی اپنے سامنے دیکھنے لگی، میں نے صاف دیکھا کہ ان کی نگاہ کا ہدف کوئی شے نہ تھی یعنی وہ اس وقت ماضی بعید کے کسی منظر میں گم تھی۔

''اچھا یہ بتایئے کہ قائداعظمؒ نے جب آپ کے سر پر دستِ شفقت رکھا تو کیا ان کے ہاتھ میں کسی قسم کی لرزش تھی؟'' میں نے بے تکا سوال کیا۔

''میرا خیال ہے کہ ہاتھ میں ہلکی سی لرزش ضرور تھی۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ وہ بڑے مضبوط حوصلے کے مالک تھے۔ انہیں اپنے آپ پر ان کو مکمل قابو تھا۔'' باجی یقینی نے کہا۔

''نہیں باجی یقینی! بات کم ہمتی کی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس وقت انھوں نے آپ کو اپنی بیٹی کے طور پر قبول کرلیا تھا۔ کیا آپ نہیں جانتی کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے کمرے میں تنہا جایا کرتے تھے۔ ایک بار ان کے خادم نے ان آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے تھے مگر وہ زمین پر نہ گر سکے۔ یہی قائداعظمؒ کی قوتِ برداشت کی دلیل ہے۔ اشکوں کی واپسی ہر بندے کے بس کی بات نہیں ہوتی۔''

''۲۱ مارچ کی رات کو تاریخی اجلاس کی تیاری ہوئی۔'' باجی نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔

''۲۲ مارچ والے دن ہی قائداعظمؒ نے اپنے مدبر ہونے کا ثبوت بھی پیش کردیا۔ ایک خاکسار کی احمقانہ حرکت سے مسلم لیگ اور خاکسار تنظیم میں رنجش کا امکان بہرحال موجود تھا۔ جو شیلے مسلم لیگی اس قاتلانہ حملے کو فراموش نہیں کرپائے تھے مگر قائداعظمؒ نے اپنے تدبر کے ایک ہی وار سے سارے اندیشوں کی دھند صاف فرمادی۔ وہ ریلوے اسٹیشن سے سیدھے میو ہسپتال گئے جہاں خاکساروں کے کئی افراد زخمی پڑے تھے۔

اس عیادت نے تمام نام نہاد دانش وروں کو حیران کردیا اور دوسری جانب خاکساروں کے دل بھی جیت

لیے۔ سر سکندر حیات وزیر اعلیٰ دیکھتے ہی رہ گئے۔ پہلے تو میں نے بھی قائداعظم کے اس قدم کو پسند نہیں کیا۔ مگر جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس وقت وہی مناسب ترین قدم تھا۔ مسلم لیگی اور خاکسار دونوں جماعتوں کے افراد کے دل صاف ہوگئے۔

۱۲ مارچ کی رات نواب ممدوٹ کی جائے رہائش پر ابتدائی جلسہ ہوا جس میں قرارداد کا مسودہ تیار کیا گیا۔ اس کا متن انگریزی زبان میں تھا۔ دن کے وقت یعنی اجلاس سے پہلے لاہور کی دو شخصیات کو بنیادی کمیٹی میں شامل کیا گیا یعنی ڈاکٹر محمد عالم اور میاں فیروز الدین۔ اس اجلاس میں بڑے بڑے دانش وروں کی مشاورت سے قرارداد کا مسودہ تیار ہوا۔ وہ دانش ور تاریخ رقم کر گئے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) ملک برکت علی، (۲) سر سکندر حیات خان، (۳) لیاقت علی خان، (۴) چوہدری خلیق الزماں، (۵) مولانا ظفر علی خان۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس مسودے کو اُردو زبان میں ڈھالا۔ آخر ۲۲ مارچ کا سورج طلوع ہوا۔ اس روز ہم نے صبح کی نماز شاہی مسجد لاہور میں ادا کی اور منٹو پارک پہنچ گئے۔ رفتہ رفتہ پنڈال بھرنے لگا۔ لوگ تھے کہ گلی کوچوں سے ابلے پڑ رہے تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق کم از کم ایک لاکھ افراد نے مسلم لیگ کے ۲۷ ویں اجلاس میں شرکت کی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ شرکاء کی کثیر تعداد انگریزی زبان سے نابلد تھی۔ سب جانتے تھے کہ قائداعظمؒ اپنی تقریر انگریزی میں کیا کرتے تھے مگر لوگ محو ہو کر سنتے۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو جمعرات کا دن تھا۔ کرسیٔ صدرت پر آٹھ کروڑ مسلمانوں کے دلوں کے ترجمان محمد علی جناحؒ تشریف فرما تھے۔"

"مگر باجی وہ جلسہ تو دوپہر اڑھائی بجے شروع ہوا تھا آپ صبح صبح وہاں کیوں پہنچ گئے؟"

"ارے پگلے لوگ تو واہیات سی فلم دیکھنے کی خاطر ٹکٹ گھر کے سامنے بستر بچھا لیتے ہیں اور یہاں تو ہماری قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ پھر چند گھنٹوں کی دیر سویر چہ معنی دارد۔" باجی نے مجھے پیار سے سمجھایا۔

عجیب بات یہ تھی کہ ہم دونوں کی آنکھیں بھیگ چلی تھیں۔ جن واقعات کا تصور انسان کو اشک بار کردے، ان کی جلوگی انسان کا کیا حشر کرتی ہوگی۔ مگر یہ بات صرف اہل عشاق ہی جانتے ہیں، یہ اہلِ ہوس کے بس کی بات ہی نہیں۔ مثنوی سفر العشق میں میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں کہ

العشقُ نارٌ طریق ماسوا اللہ۔ جی ہاں! عشق ہی وہ آگ ہے جو ماسوا اللہ سب کو جلا دیتی ہے اور یہ عشق کسی مقصد سے بھی ہو سکتا ہے۔ جب ہم اس جذبے سے کسی مقصد کو حاصل کرنا چاہیں تو ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔

باجی عینی نے داستان جاری رکھتے ہوئے کہا:

"میں اور وقار اسٹیج کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ ہمارا مرشد ہمارے سامنے تھا۔ لہذا جی بھر کے ہم دیدار کر سکتے تھے۔"

جمعہ ۲۳ مارچ اڑھائی بجے کے قریب جلسے کی کارروائی کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ پنڈال میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی مگر تلاوت کے شروع ہوتے ہی ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ مجھے تو اپنے سانسوں کی آواز تک سنائی دے رہی تھی۔ تلاوت کے بعد ایک بارعب شخصیت مائیک پر آئی اور اس نے میاں بشیر کی معروف نظم ترنم سے پڑھی:

"ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناحؒ"

میرے تو رونگٹے کھڑے ہوگئے، وقار نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا اور اس کے بازو کی لرزش میرے اندر سرایت کر رہی تھی۔ میں نے اس کے بازو پر تھپکی دے کر اسے قابو میں کیا ورنہ وہ تو نعرے بازی کو بالکل تیار تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے وقار کو پسند کرلیا۔ جب منزل ایک تھی تو ہم مسافر اجنبی کیسے رہ سکتے تھے۔ وقار نے مجھ سے سرگوشی کی "یہ انور قریشی صاحب ہیں۔" یہ جلسے کا مبارک دن تھا۔

"یعنی ۲۳ مارچ بروز جمعہ دن کے اڑھائی بجے۔"

میں نے زیرِ لب دھرایا تاکہ باجی کا ایک ایک لفظ میرے ذہن پر نقش ہو جائے۔ پھر میں نے پوچھا "اس وقت اسٹیج پر کون کون بیٹھا تھا؟" باجی نے جواب دیا۔ "سیدھے ہاتھ قائداعظمؒ کے بالکل قریب شیر بنگال مولانا اے کے فضل الحق بیٹھے تھے جو اس وقت صوبہ بنگال کے وزیر اعلیٰ بھی تھے۔ یاد رہے کہ قرارداد لاہور یا پاکستان کی تائید بھی انھوں نے فرمائی تھی۔"

"کیا ان تائید کرنے والوں میں کوئی اور بھی شامل تھا؟" میں نے پوچھا۔

"شیر بنگال کے بعد چوہدری خلیق الزماں نے تائید فرمائی، وہ یوپی سے تھے۔ ان دونوں حضرات کا اتباع مولانا ظفر علی خاں نے کیا۔ مولانا انگریزی گوکھر کی لونڈی سمجھتے تھے مگر اس سے ایسا سلوک نہ کرتے۔ انگریزی ایسی بولتے کہ محمد علی جوہرؒ کی یاد تازہ ہو جاتی۔ ان کے بعد سردار اورنگ زیب خاں، حاجی عبداللہ ہارون، قاضی عیسیٰ نے پرجوش طریقے سے قرارداد لاہور کی تائید فرمائی۔ میں ان تمام محسنین سے اچھی طرح واقف تھی۔ ان کے بعد اجلاس کی دوسری جانب سے بھی تائید ہونے لگی۔ ڈاکٹر محمد عاصم (ماہر تعلیم و تربیت) اور نواب اسمٰعیل خاں بھی تائید کرنے والوں میں شریک ہوئے۔ پھر حاضرین نے عجیب و غریب منظر دیکھا۔ ایک برقع پوش خاتون اٹھ کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگی۔"

"برقع پوش؟" میں نے اظہار حیرت کیا تو باجی نے مسکرا کر کہا۔

"جی ہاں! برقع پوش ہستی مولانا محمد علی جوہر کی بیوی تھیں۔ میں نے جلسے کے بعد ان سے بالمشافہ گفتگو کی تھی۔ اس لیے میں پورے وثوق سے اس بات کی تصدیق کر سکتی ہوں۔ آج بھی اگر تم وہ تصویر دیکھو تو وہ تمھیں نظر آجائیں۔ ان کے بعد ایک تندرست و توانا جوانمرد آدمی نے محترمہ کی تقلید فرمائی۔ یہ تھے آئی آئی چندریگر جو مردانہ وجاہت کا نمونہ تھے۔ قرارداد لاہور کے کل ۴۰۰ الفاظ تھے اور چار عدد پیرے۔ انگریزی زبان سے نابلد حضرات کی مشکل مولانا ظفر علی نے آسان فرما دی۔ انھوں نے اس قرارداد کا اتنا خوبصورت ترجمہ فرمایا کہ اس لفظ آگیا۔ قرارداد کا خلاصہ بھی سن لو۔" باجی نے کہا۔

"اس جلسے کی متفقہ رائے ہے کہ برصغیر کے مسلمان ہر لحاظ سے ایک الگ قوم ہیں جس کے معاشرتی، تہذیبی اور دیگر ہر لحاظ سے الگ اصول ہیں۔ آیندہ کوئی دستور ہند کے مسلمانوں کو قابلِ قبول نہیں ہوگا جس کی تیاری مسلمانوں کی مشاورت کے بغیر کی گئی ہوگی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے الگ الگ ہیرو ہیں اور علٰحدہ تاریخی کارہائے نمایاں۔ یہ دو قومیں نہ آپس میں شادی بیاہ رچاتی ہیں اور نہ ان کی رسومات ایک جیسی ہیں۔ یہ تو کھانا پینا تک بھی اکٹھے نہیں کرتے۔ ایسی صورت میں ان دو اقوام کو ایک جوئے میں کیسے جوتا جا سکتا ہے؟ قائداعظم کے اصل الفاظ تھے "You can not yoke them together"۔

قائداعظم نے دو ٹوک الفاظ میں مسلمانوں کے لیے الگ خطے کا مطالبہ کیا جہاں کے مسلمان اسلامی تعلیمات کے عین مطابق زندگی گزار سکیں اور یہ بھی فرمایا کہ ہندو مسلم اتحاد ایک خواب ہے جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ اسی جلسے کے بعد آپ نے اپنے ذاتی معاون سے کہا "آج اگر اقبال زندہ ہوتے تو وہ یہ دیکھ کر کتنے خوش ہوتے کہ ان کی خواہش کے عین مطابق قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوگئی ہے۔" یہ کہہ کر میری باجی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی اور میں نے بھی محسوس کیا کہ باتیں بہت ہوگئی ہیں لہٰذا فی الحال یہ کارروائی ختم ہونی چاہیے۔

میں نے کہا "باجی اب آپ اجازت دیں، میں ان شاء اللہ پھر آؤں گا اور باقی باتیں پھر ہوں گی۔ خیال یہی تھا کہ دو ایک روز بعد ملاقات ہو جائے مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا اور میں ایک ماہ پھر ان سے نہ مل سکا۔ یہ ۱۹۵۹ء کا ذکر خیر ہے۔

ہوا یوں کہ پاک فضائیہ کی جانب سے مجھے امریکہ جانے کے لیے نامزد کرلیا گیا تاکہ میں اپنی پیشہ ورانہ مہارت کی تکمیل کر سکوں۔ بلاکسی (مسس پی ریاست کی

ایک فوجی درس گاہ) میری منزل تھی اور مجھے الیکٹرانک میں بلند مرتبت تعلیم حاصل کرنی تھی لہٰذا میں اس کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔ میری پیشہ ورانہ مصروفیات کو باجی مکروہات زمانہ نہ کہتی بلکہ اظہار مسرت فرماتی تھیں۔ بہرحال ۱۹۵۹ء دسمبر کے آخری ایام میں ایک بار پھر ہماری طویل ملاقات ہوئی۔ جب میں اپنی اونچی درسگاہ پہنچا تو باجی عین مجھے دیکھ کر کھل اٹھی اور جب میں نے ان کو بتایا کہ میں حصول تعلیم کے لیے امریکا جارہا ہوں تو ان کی مسرت دیدنی تھی۔

''اچھا ہوا کہ تم آج آگئے۔ ہم وہ داستان بھی پوری کرلیں گے۔ دیارِ غیر میں جانے سے پیشتر یہ بہت ضروری ہے اور میں امید کرتی ہوں کہ تم امریکا کی مصنوعی چمک دمک سے مرعوب نہیں ہوگے۔'' اس روز جھونپڑی میں ایک عدد نفیس کرسی بھی موجود تھی۔ باجی نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ تمھاری وردی کے احترام کا اہتمام ہے۔ اب تم آرام سے اس پر بیٹھ سکتے ہو۔'' میں نے ان کے ارشاد کی تکمیل کی تو انھوں نے داستانِ دل نواز کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا:

''مارچ ۱۹۴۰ء کی چند تاریخیں ہر فرد کو یاد ہونی چاہیے:

(۱) ۱۹/مارچ..... جب فرنگی پولیس اور خاکساروں کا ٹکراؤ ہوا۔

(۲) ۲۱/مارچ ..... جب حضرت قائداعظمؒ یعنی میرے محترم پاپا جانی شیر بنگال کے ساتھ لاہور ریلوے اسٹیشن پر تشریف لائے۔

(۳) ۲۲/مارچ ۱۹۴۰ء..... جب قراردادِ لاہور پیش ہوئی۔

(۴) ۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء..... جب یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ ان تاریخوں سے تعلق رکھنے والے سارے واقعات تمھارے ذہن میں محفوظ ہوں گے۔''

''جی باجی! وہ واقعات میرے ذہن پر نقش ہو چکے۔'' میں نے پورے ادب سے کہا۔

''تو پھر ہم ۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء کا ذکر تیز بحث لاتے ہیں۔'' باجی نے کہا ''علامہ اقبال کی حسب منشا قرارداد منظور ہوگئی اور بقول قائداعظمؒ دنیا کی کوئی طاقت مسلمانانِ ہند کو حصولِ پاکستان سے محروم نہیں کرسکتی تھی۔ یہ تھا ایک سچے مدبر اور راہنما کا عزمِ مصمم۔ خیر! ۲۴/مارچ ۱۹۴۰ء کا سورج طلوع ہوا تو کانگریس نواز ہندو اخبارات نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ ان میں ویر بھارت، ملاپ اور پرتاپ سرفہرست ہیں۔ مگر انگریزی اخبار ٹربیون (Tribune) نے ان کی سنگت کا حق ادا کردیا جس سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ کانگریس اور فرنگی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ مسلم دشمنی میں کوئی کسی سے کم نہیں تھا۔ پنجاب کے یونینسٹوں نے اس قرارداد کو مبہم (Obscrued Resolution) کہا۔

کانگریسی مسلم راہنماؤں نے اپنے اپنے ظرف و شرف کے مطابق ہرزہ سرائی کی۔ مولانا عبدالکلام آزاد نے تو اسے نظریہ اسلام کے سراسر خلاف قرار دیا۔ ان کے اصل الفاظ تھے ''Against the Islamic Idealogy'' اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مولانا موصوف کس اسلام کی بات کررہے تھے۔ یہ سن کر وقار تو گویا ہتھے ہی سے اکھڑ گیا اور کہنے لگا ''یعنی ڈیئر دیکھ لینا، میں اس گمراہِ مطلق کا پیٹ چاک کرکے رہوں گا۔''

''تم ایسی کوئی حماقت نہیں کروگے۔'' میں نے پہلی بار اسے محبت بھری نگاہوں سے نوازتے ہوئے کہا تو وہ آپے میں آگیا۔ مہاتما کرم چند موہن داس گاندھی نے کہا: ''میری آتما دو قومی نظریے کی مخالفت کے گرد گھومتی ہے۔ مسلمان ہوں یا ہندو، سب ایک ہی خدا کی مخلوق ہیں پھر یہ الگ قومیت کا کیا مطلب۔'' ان ناقدین میں سکھوں کے راہنما ماسٹر تارا سنگھ تمام حدود و قیود عبور کرگئے۔ انھوں نے کہا ''مسلمان اگر واقعی پاکستان بنانے پر تلے بیٹھے ہیں تو ان کو سکھوں کا خونی سمندر عبور کرنا پڑے گا۔''

یہاں میں خاموش نہ رہ سکا اور لب کشا ہوا ''باجی

تارا سنگھ واقعی سکھ تھا، اس نے اپنی قوم کو غیروں سے زیادہ نقصان پہنچایا، پنجاب کی تقسیم کا شوشہ بھی اس تارا سنگھ نے چھوڑا۔ اب سکھ قوم آج تک پچھتا رہی ہے حالانکہ قائداعظمؒ نے ان کو من چاہی سہولتیں فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا مگر بات ان کی سمجھ میں نہ آسکی۔'' یہ کہہ کر میں سوالیہ نگاہوں سے باجی کو دیکھنے لگا۔

انگریزی اخبار نے ہندو اخبارات کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اسے قراردادِ پاکستان کہا اور یہ اضافہ بھی کر دیا کہ اس قرارداد پر عمل نہیں ہوسکتا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ صدر کانگریس راج گوپال اچاریہ نے اس قرارداد کی حمایت کی یعنی اسے خلافِ قانون قرار نہ دیا۔ بہرحال لے دے ہوتی رہی۔ ہر فرد کو اظہارِ رائے کی آزادی تو تھی مگر بے پر کی اڑانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

وائسرائے ہند لارڈ ویکنگ ویول نے دسمبر ۱۹۴۵ء میں عام انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کردیا۔ اس انتخابات سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کون کررہا ہے۔ اس سے پیشتر کانگریس کا دعویٰ تھا کہ وہی اور صرف وہی ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو یہ الیکشن بھی اپنی نوعیت کا نرالا تھا۔ اس سے پیشتر ۱۹۳۸ء کے عام انتخابات میں کانگریس نے کامیاب ہوکر اپنے دعوے کی سچائی ثابت کی تھی مگر اب قائداعظمؒ کی کاوشوں سے طوفان کا رخ بدل چکا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء کے تاریخی الیکشن میں مسلم لیگ نے مرکز میں تو ساری نشستیں جیت لیں اور صوبوں میں بھی ۲۹۲/نشستوں میں سے ۲۲۸/ پر کامیابی حاصل کرکے انگریزوں اور ہندوؤں کی مشتر کہ سیاست پر لکیر پھیر دی۔ یوں یہ بات ثابت ہوگئی کہ قائداعظمؒ اور صرف قائداعظمؒ ہی ہندی مسلمانوں کے حقیقی راہنما ہیں اور مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت ہے۔

''گویا قیامِ پاکستان کی بنیاد استوار ہوگئی۔'' میں نے مختصر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور غیروں کی متحدہ سیاست دھری کی دھری رہ گئی۔'' اب ہم دونوں خاموش ہوچکے تھے مگر میں بدستور باجی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ باجی فراست سے میرا مفہوم سمجھ کر مسکرانے لگی۔

''جانم! میں تمھارے اندر جھانک سکتی ہوں۔ تم کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے آجاتے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ اب تم وقار کے متعلق جاننے کے لیے بے چین ہو۔ تو چلو یہ داستان بھی تمھارے گوش گزار کیے دیتی ہوں۔ خلاصہ صرف یہ ہے کہ ہم نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد شادی کا فیصلہ کرلیا۔ اس فیصلے کو میرے خاندان والوں نے بھی پسند کیا کہ وہ وقار الزماں کے متعلق کافی حد تک جان چکے تھے۔

قراردادِ لاہور اب قراردادِ پاکستان بن چکی تھی۔ قائداعظمؒ نے اس حسنِ اتفاق پر غیر مسلم سیاست دانوں کا شکریہ بھی ادا کیا جنھوں نے مسلمانوں کو ایک نہایت خوبصورت اور موزوں اصطلاح فراہم کی تھی۔ کیا اس میں دستِ قدرت کا فرما نہیں تھا؟ یقیناً تھا.....'' باجی نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دے دیا۔

باجی پھر خاموش رہیں، پھر کہنے لگیں: ''جانم! تم امریکہ جارہے ہو اور امید ہے کہ واپس بھی آجاؤ گے۔ تمھاری فکری بنیاد کافی مضبوط ہے لہٰذا تم وہاں کی چمک دمک سے مرعوب نہیں ہوگے اور نہ وہاں کی مصنوعی زیب و زینت تمھیں وہاں روک سکے گی۔ پھر بھی میں چند باتیں تمھارے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں۔''

''ضرور، ضرور!'' میں ہمہ تن گوش ہوکر سننے لگا۔

باجی نے کہا ''عربی محاورہ ہے کہ ''اذا خلع الثراس فلیس علی الجند باس (جب سر درست رہے تو انسانی جسم سلامت رہتا ہے) انسان وہی کچھ بن جاتا ہے جو کچھ وہ سوچتا ہے۔ سوچ الفاظ کا روپ دھار کر عادت بنتی ہے اور پختہ عادات قسمت بنا جاتی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آدمی خیالات پر قابو رکھے۔ نامناسب خیالات انسان کو برباد کر دیتے ہیں۔ آغاز میں ان پر قابو رکھنا مشکل نہیں ہوتا مگر رفتہ رفتہ یہی خیالات شیطان کو دعوت دے کر خرابی پیدا

کرتے ہیں۔ جب حضرت ابلیس انسان کی کرسیٔ دل پر بیٹھ جائے ہے تو فوراً ہی اپنی ربوبیت کا اعلان کر کے انسانی صلاحیتوں کو مجروح کر کے غیر صالح بنا دیتا ہے۔ یہی مکمل تباہی کی بنیاد ہے۔ اب میں اپنی مثال دے کر تمھیں قائل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

میں اور وقار عنفوانِ شباب میں داخل ہو چکے تھے۔ بارہا میرے چاہنے والے نے پٹڑی سے اترنے کی کوشش کی مگر میں نے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اسے بھی سنبھال لیا۔ رات گئے تک ہم باتیں کرتے رہتے لیکن ہماری گفتگو کا موضوع ہمیشہ قیامِ پاکستان اور امتِ مسلمہ کی سربلندی ہوتا۔

ایک روز وقار میرے کمرے میں داخل ہوا تو اس کی حالت دگرگوں تھی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور اس کے لیے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے اسے گلاس بھر پانی پیش کیا اور صورت حال کی وضاحت مانگی۔ تب اس نے کہا: ''عینی! طوفانِ بلا آنے ہی والا ہے۔ چند روز سے کانگریس پسند اخبارات نے جو اودھم مچا رکھا تھا اسے لاہور کی غیر مسلم آبادی نے عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے ان کی منصوبہ بندی سنی ہے۔''

''وہ کیسے؟ تم وہاں کیسے جا پہنچے۔'' میں نے پوچھا۔

''تم جانتی ہو کہ میں نے اپنی ہم جماعت کامنی پر کتنا بڑا احسان کیا تھا۔''

''تمھارا شارہ اس کے بھائی رام داس کی بیماری کی طرف ہے۔''

''ہاں وہی رام داس والا قصہ جب ہیضے میں مبتلا ہوا تھا اور میں نے ایک پرانے ٹوٹکے سے اس کی جان بچائی تھی۔''

''ہاں ہاں میں خود حیران تھی کہ تمھیں بڑی بوڑھیوں والا ٹوٹکا کیسے یاد آگیا تھا۔''

''جناب میری دادی ماں نے یہی ٹوٹکا مجھ پر آزمایا تھا جب بچپن میں اس موذی مرض میں مبتلا ہوا تھا۔ اس نے پیاز کا پانی نکال کر مجھے پلایا تو میں بھلا چنگا ہوگیا۔ کامنی کے علاوہ اس کے ماتا پتا بھی میرے گرویدہ ہوگئے۔''

''اچھا خیر! بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''لاہور شاہ عالمی دروزے کے قریب والے مندر میں غیر مسلم غنڈوں نے خفیہ اجلاس میں فیصلہ کیا ہے کہ لاہور کے ناپسندیدہ عناصر کو جتنی وہ لوگ جو قرار دادِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر شریک تھے، تہ تیغ کردیا جائے۔ پہلے وہ بڑا جلوس نکالیں گے پھر اس جلوس سے چار چار افراد کی مسلح ٹولیاں وہاں سے الگ ہو کر بقول ان کے ناپسندیدہ عناصر کے گھروں پر دھاوا بول دیں گی۔ اس جلوس کا ذرا ما رچانے کا مقصد یہ ہے کہ بلوائیوں کی جائے واردات سے غیر حاضری ثابت کی جا سکے۔ جلوس میں شرکاء کی تعداد ہزاروں میں ہوگی۔ میں نے کامنی سے درخواست کی اور اپنے احسان کا بدلہ چکانے کا مطالبہ کیا تو وہ مجھے ہندو جوان کے بھیس میں اجلاس ساتھ لے جانے پر راضی ہوئی تھی۔ جانم! یہ کام ویسے تو بے حد مشکل تھا مگر تم جانتی ہو کہ میں جس کام کے پیچھے پڑ جاؤں اسے انجام تک پہنچا کر رہتا ہوں۔''

''بلوائیوں کی کل کتنی ٹولیاں تشکیل دی گئی ہیں۔'' میں نے وقار سے پوچھا۔

''تیس چالیس ٹولیوں نے تو میرے سامنے بھگوت گیتا پر ہاتھ رکھ کر سوگند کھائی کہ وہ سب جان کی بازی لگا دیں گے۔''

یہ منصوبہ سُن کر میں پریشان ہوگئی۔ اس طرح تحریکِ پاکستان کے سیکڑوں افراد ختم ہو جاتے اور اہم بات یہ کہ اس وقت ان افراد کی سخت ضرورت تھی۔ ہمارے پاس ان افراد کو مطلع کرنے کا کوئی ذریعہ بھی نہ تھا کہ ہم غیر مسلموں کے نشانے پر آئے لوگوں سے واقف ہی نہیں تھے۔ اس طرح ہم کس کس کو خبردار کرتے؟ میں نے عالمِ بے بسی میں کہا ''خدایا! رحم کر، اب کیا کیا جائے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ حضرت عمر فاروقؓ جب بے بس ہو جاتے تو فوراً نماز کی نیت لیتے تب ان کے ذہن میں

مشکل کا حل آجاتا۔

ایک بار جب ایران کے خلاف محاذ کھلا تو جنگِ قادسیہ کا سارا منصوبہ نماز کے دوران عمر فاروقؓ کے ذہن میں آیا۔ دوسرا واقعہ بھی کسریٰ کے خلاف محاذِ جنگ کا ہے۔ جب عمر فاروقؓ پریشان ہو گئے تو وہ جبلِ رمات پر تشریف لے گئے اور وہاں ۲ رکعت نماز پڑھنے لگے۔

میں نے بے صبری سے کہا ''جی باجی! بالکل ٹھیک۔ نفل نماز کے فوراً بعد جبلِ رمات بھی زلزلہ لرزنے لگا تھا اور عمر فاروقؓ نے اپنا کوڑا کھینچ کر پہاڑ کی پتھریلی زمین پر مارا اور پہاڑ کو فوراً رُک جانے کا حکم دیا۔ عقل چکرا دینے والی بات یہ ہوئی کہ وہ پہاڑ اپنی اوقات پر آکر تھم گیا۔''

''ہاں ہاں! تم ٹھیک سمجھے ہو۔'' باجی نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا ''خیر! ہم نے فوراً وضو کیا اور رب کے حضور سجدہ ریز ہو کر درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ، ہنگامی طور پر اس مصیبت کا حل ہمارے دماغوں میں ڈال دے۔''

نفل نماز سے فارغ ہو کر ہم خاموشی سے بیٹھ گئے۔ یہ انداز ۲۰ منٹ تک جوں کا توں رہا۔ پھر اچانک وقار نے بلند آواز سے کہا، بس بس سارا مسئلہ حل ہوگیا۔ پھر وہ اٹھ کر بچوں کی طرح لب کشا ہوا۔ ''پیارے اللہ میاں ہم ایسا ہی کریں گے۔''

''کچھ مجھے بھی بتاؤ کہ اللہ میاں سے یہ کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں۔''

وقار نے اچانک خاموش ہو کر میری طرف دیکھا اور پھر اچھل کر مجھے دبوچ لیا۔ اب وہ پاگلوں کی طرح مجھے اٹھائے چکر کاٹنے لگا۔ میں نے مصنوعی غصے سے کہا ''اوئے پاگل لڑکے! مجھے زمین پر رکھ ورنہ پٹائی کر بیٹھوں گی۔''

اس نے مجھے زمین پر رکھ کر کہا: ''عینی! آپ کا یہ پاگل آدمی اب سارے لاہور کے بلوائیوں کو ناکوں چنے چبوانے والا ہے۔ اللہ میاں تو واقعی عظیم ہے بلکہ عظیم ترین (Greatest) ہے۔ اب آئے گا مزہ جب سارے انتہا پسند میرا شکار ہوں گے۔ وقار کے جنون کو لگام دینے میں کافی دیر لگی مگر آخر کار وہ کام کی باتیں کرنے کے قابل ہوگیا۔ تب ہم اس کی منصوبہ بندی کو زیرِ بحث لائے۔ وہ منصوبہ بندی جس کے متعلق مجھے اس وقت تک خبر نہ تھی۔

باجی عینی خاموش ہوگئی اور تجسس سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ ان ۲/۱ افراد نے سیکڑوں بلوائیوں پر قابو کیسے پایا تھا۔

''رات بھیگ چکی تھی جب وقار نے اپنی منصوبہ بندی میرے گوش گزار کی۔ منصوبہ واقعی شاندار تھا۔ بلوائیوں کے جلوس کا آغاز ایک بڑے مندر سے ہونا تھا جو چوک شاہ عالم کے قریب واقع تھا۔ اب مندر بے آباد ہے۔'' باجی نے کہا ''منصوبے کے مطابق وقار نے خود اس جلوس میں شریک ہونا تھا۔ لاہور کے حالات کسی کڑی کمان کی تانت کی طرح تنے ہوئے تھے۔ مارچ کے وسط میں پولیس کا اعلیٰ افسر ہلاک ہو چکا تھا اور اہم بات یہ کہ فرنگیوں کی ان تھک کوششوں کے باوجود اس پولیس کمانڈر کا سر نہیں ملا تھا۔ خاکساروں نے جانے اسے کہاں غائب کردیا تھا۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ محکمہ پولیس کی حالت کیسی رہی ہوگی؟'' یہ سوال باجی نے مجھ سے کیا۔

''جی ہاں! ان کی جان شکنجے میں آگئی ہوگی۔'' میں نے مختصر جواب دیا تاکہ کہانی کا تسلسل مجروح نہ ہو۔

''میں نے وقار کو اس بات پر راضی کرلیا کہ میں بھی اس جلوس میں شرکت کروں گی۔ پہلے تو وقار نے صاف انکار کردیا مگر میں نے اسے دلیل پیش کی کہ فرض کرو تم اس جلوس میں شہید ہو جاتے ہو تو میں اس کے بغیر زندہ رہ کر کیا کروں گی؟ یہ دلیل بڑی اثر انگیز تھی لہٰذا اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

ہم نے اپنے منصوبے کی جزئیات مکمل کرلیں۔ اس کی ایک ایک بات پُرغور تھی۔ ہمارا مقصد جو شلے بلوائیوں کی نفرت کا رُخ بدلنا تھا۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو جاتے تو باقی کام خود بخود ہو جاتا۔ بلوائیوں کو اپنی پڑ جاتی اور وہ تحریکِ پاکستان کے خدام کو بھول ہی جاتے۔ ہم دونوں نے ہندوانہ لباس زیب تن کیا۔ میں نے باقاعدہ بندیا بھی لگائی۔ ساڑھی بڑے اہتمام سے باندھی اور

وقتِ مقرر سے پہلے ہی جائے واردات پر پہنچ گئے۔ ہماری جان کاری کے مطابق جلوس کا آغاز ۱۱ اور ۱۲ بجے کے درمیان ہونا تھا۔

بلوائیوں کی انتظامیہ نے سکے بند کام کر رکھا تھا کیونکہ ۹ بجے کے قریب ہی لوگ آنا شروع ہو گئے۔ بانساں والے بازار کے قریب مسجد شب بھر تک انسان ہی انسان تھے۔ یہ الگ بات کہ ان کے ارادے شیطانی تھے۔ اس ہجوم کی اطلاع پولیس کو بھی ہو گئی۔ وہ تو اس زمانے میں گویا پہلے ہی تیار بیٹھی تھی۔ ہمیں یہ خبر مل چکی تھی کہ پولیس کے اہلکار بھک سے اڑ جانے والا مواد بن چکے تھے۔ ان کو حکم تھا کہ ہر بلوے کو آہنی ہاتھوں سے ملیامیٹ کر دیا جائے اور اطاعت نہ کرنے والوں سے نمٹا جائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جلوس شروع ہونے سے پیشتر ہی پیدل اور گھڑسوار پولیس کی بھاری نفری بھی وہاں آموجود ہوئی۔

منصوبہ بندی کے مطابق قافلہ نولیوں سے سنہری بازار پہنچتے ہی اپنی اپنی منزل کی طرف جانا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ ان کی کوئی ٹولی اس جلوس سے الگ نہ ہو اور تحریکِ پاکستان کے خُدام محفوظ رہیں۔ جلوس ذرا تاخیر سے شروع ہوا۔ بلوائیوں کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ وہ تقسیم ہند کے خلاف نعرے بازی کر رہے تھے۔ ''دھرتی ماتا کے ٹکڑے نامنظور نامنظور'' کبھی کبھی وہ فرنگی حکمرانوں سے درخواست کرتے کہ قراردادِ پاکستان پر توجہ نہ دی جائے۔ باقی گاندھی جی اور دیگر بنیاؤں کے حق میں نعرے لگائے جا رہے تھے۔

جلوس کی دونوں جانب پولیس کے اہلکار مستعد ہو کر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ میں نے وقارے سرگرشی کی ''جانم! ذرا دیکھو ان بلوائیوں کا کیا حشر ہونے جا رہا ہے۔'' وقار تو گویا جلوس کی قیادت کر رہا تھا۔ اس کا جوش وخروش مصنوعی نہیں سچا لگ رہا تھا۔ وہ اچھل اچھل کر تقسیم ہند کے خلاف نعرے لگا رہا تھا۔ شرکائے جلوس اس کے نعروں کا جواب دے رہے تھے۔ مگر کوئی اس کی اصلیت سے واقف نہ تھا۔ ہم دونوں گویا آتش فشاں کے دہانے پر تھے مگر حالات ہمارے حق میں جا رہے تھے۔

ذرا ما اس وقت شروع ہونا تھا جب صرافاں بازار سے تھوڑے فاصلہ پہلے ایک دکان کی مرمت ہو رہی تھی اور وہاں اینٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ رفتہ رفتہ وہ جگہ قریب آ رہی تھی۔ ہجوم کی ایک نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے۔ اسے بھیڑ چال کہتے ہیں۔ ایک بھیڑ اگر کنویں میں گر جائے تو ساری بھیڑیں اس کا تباع کرتی ہیں۔ جیکارے لگواتے لگواتے وقار بھی جلوس سے آگے نکل جاتا مگر پھر اپنا فاصلہ کم کر کے لوٹ آتا۔ اس روز اس نے ایسے ایسے نعرے (نعرے جس میں جے بولی جائے) لگوائے کہ میں اش اش کر اٹھی۔ میں جانتی تھی کہ وقار ہجوم کے مزاج کے مطابق کھیل رہا تھا۔ جیسے تیز گیند باز کو اچھا بلے باز مہارت سے کھیلتے ہوئے آنے والی گیند کا صرف رُخ بدل کر چوکا یا چھکا جڑ دیتا ہے۔ بعض نعرے تو مجھے مخمصے میں ڈال رہے تھے مگر ہم نے اس صورت حال پر بھی غور کیا ہوا تھا کہ جب وقار اپنے دونوں ہاتھ بلند کرے تو جواباً ہمیں زندہ باد کہنا ہے ورنہ مردہ باد مگر وقار اس صورت حال کو خود بھی قابو کر رہا تھا۔ اگر جلوس کی طرف سے جیکارے میں جان نہ ہوتی تو وہ خود مردہ یا زندہ باد کہہ کر ہی نعرہ دہرا دیتا۔ بعض نعروں کی اسے راہنمائی کرنی پڑتی مثلاً ''قائم ہوگا رام راج، رام راج۔ مہاتما گاندھی زندہ باد، جناح پونجا مردہ باد، بنگالی ملاں مردہ باد۔ اس سے مراد مولانا اے فضل حق تھے۔

جب ہماری منزل قریب آگئی تو منصوبہ بندی کے عین مطابق وقار نے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخ کر کہا ''فرنگی پٹھو! ہائے ہائے، بھارت ماتا قائم رہے جی قائم رہے۔ تقسیم ہند نامنظور نامنظور۔ پھر اس نے اصل نعرہ لگایا: ساماراج! ہم سب نے جواب دیا مردہ باد۔ ہماری دیکھا دیکھی چند ہندو جوشیلے نوجوان بھی ہم دونوں کے قریب آچکے تھے۔ یہ مردہ باد ان کی زبانوں سے بھی نکلا مگر وقار کے مطلب کو کوئی نہ سمجھ سکا کہ وہ جلوس کو کدھر لے جا رہا تھا۔ جب اس نے دوسری بار کہا ''فرنگی راج تو

اس کے جواب میں ہجوم نے پُرجوش طریقے سے مردہ باد کہا۔ ادھر وہ مرمت ہونے والی دکان قریب آچکی تھی۔ وقار نے آخری حربے کے طور پر وہاں سے اینٹ کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور پوری قوت سے ایک پولیس والے کی طرف اچھال دیا۔ دوسری اینٹ میں نے پھینکی جو ٹوٹ کر ایک سپاہی کے آہنی ٹوپ پر لگی یہ چند ایک اینٹیں اور بھی برسنے لگیں۔

بس ہم نے بھس کو چنگاری دکھائی تھی۔ پولیس کمانڈر نے چیخ کر حکم دیا۔ ''گولی چلاؤ'' پولیس والے تو گویا پہلے ہی تیار بیٹھے تھے، انھوں نے جلوس پر گولیاں چلانا شروع کر دیں لوگ گولیاں کھا کھا کر گرنے لگے۔ جلوس کے عقب میں بھگدڑ مچ گئی اور لوگ اپنی جانیں بچا کر بھاگ نکلے مگر جلوس کا اگلا حصہ یعنی فرنٹ بدستور ڈٹا رہا۔ مجھے اینٹ مارتے ہوئے کسی سپاہی نے دیکھ لیا تھا۔ اس نامراد نے مجھے ہدف بنایا مگر پیشتر اس کے کہ گولی مجھے سفرِ آخرت کی طرف روانہ کرتی، برا چاہنے والا میرے آگے آگیا۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ مجھ سے فاصلے پر تھا۔ گولی اس کے سینے میں لگی، گولی جو میرے لیے دائمی نیند کی تھی۔'' یہ کہہ کر میری باتی خاموش ہوگئی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ میں نے عملاً ان کو بہنے دیا ورنہ اس کا کلیجہ پھٹ جاتا۔ یہ آنسو اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں۔ استاد قمر نے کہا تھا:

سوزِ دل بے آنسوؤں کے اک قیامت ہے قمر
اس سے پوچھو جس کا گھر جلتا ہو اور پانی نہ ہو

''پھر کیا ہوا'' میں نے لرزیدہ لہجے میں پوچھا۔

''وقار کو میں نے فوراً تھام لیا۔ جانے مجھ میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی کہ میں نے وقار کو کلاوے میں بھر کر کاندھے پر اٹھا لیا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا اور میں اس کے پاک خون سے رنگین ہو رہی تھی۔''

''کیا آپ نے وقار کو کاندھے پر رکھ لیا تھا!'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''بالکل روئی کے ایک گٹھڑے کی طرح وہ مجھے ہلکا پھلکا لگا۔ اب میں ہر صورت میو ہسپتال جانا چاہتی تھی۔ درمیان میں صرف بانساں والا بازار تھا۔ اس کے بعد میری منزل آجاتی اور میرا وقار شاید محفوظ ہو جاتا۔ وقار کا خون مجھے رنگین کر رہا تھا۔ جب میں چوک میں پہنچی تو مجھے اپنی منزل دور لگنے لگی اور میرے قدم خود بخود مسجد شب بھر کی طرف اٹھنے لگے۔ کوئی زبردست طاقت مجھے اس راستے پر ڈال رہی تھی۔ ذرا اندازہ لگاؤ کہ ایک لڑکی ایسے زخمی کو اٹھائے جس کے لہو سے وہ خود گل وگلنار بن رہی ہو، چوک میں کھڑی ہے۔ وہاں مسلمان اکٹھے ہو رہے تھے کہ پولیس کی کارروائی نے اس واقعے کی تشہیر کر دی تھی۔ مگر اب وہاں جلوس والوں کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ سب بزدل راہِ فرار اختیار کر گئے تھے۔

گویا ہمارا منصوبہ سو فیصد کامیاب رہا اور اب تحریکِ پاکستان کے خدام یقیناً محفوظ تھے کہ بلوائیوں کو اپنی پڑ گئی تھی۔ مگر یہ کارروائی ہمیں بہت مہنگی پڑی کہ میرا وقار الزماں موت کی وادی میں تھا۔ جب میں مسجد کے قریب پہنچی تو اندر سے امام صاحب بچوں کو قرآن پاک پڑھا کر باہر نکل رہے تھے۔ ہندوانہ لباس میں ایک لڑکی کو خون میں لت پت دیکھ کر وہ گھبرا گئے مگر میں نے ان کو یقین دلایا کہ میں مسلمان ہوں اور یہ زخمی رتبۂ شہادت پر فائز ہونے والا بھی مسلمان ہے۔ اس وقت وقار زندہ سلامت تھا۔ اس نے خود امام صاحب کو سلام کیا۔ امام صاحب نے جواب دیا تو میری جان میں جان آئی۔ زخمی کو محراب کے قریب صف پر لٹا دیا گیا۔

تب وقار نے صاف الفاظ میں کہا، مولانا ادھر میرے قریب آجائیں اور مجھے سورہ البقرہ کا آخری رکوع سنائیں۔ میں حضور اکرم ﷺ کے غلام سعدؓ بن معاذ کے طریقے پر عمل کر کے اپنی موت کو ٹالنے لگا ہوں۔ پریشان نہ ہوں، موت میرا انتظار کر لے گی۔ میں نے حیرت سے وقار کو دیکھا پھر مولوی صاحب کو دیکھنے لگی۔ مولوی صاحب نے فرمایا ''بیٹی جنگِ احزاب میں سعدؓ بن معاذ کو مہلک زخم آیا تھا مگر انھوں نے اللہ تعالیٰ

کے حضور درخواست کر کے مہلت لے لی تھی۔ اسے وکیل (Stay Order) کہتے ہیں اور وہ درخواست قبول بھی ہوگئی تھی۔ شہدا کو یہ سہولت حاصل ہے اور موت ان کا انتظار کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

تب وقار نے بظاہر بے تکی آرزو کا اظہار کیا اور کہا عینی جانم! میرے قریب آجاؤ اور مولوی صاحب سے کہو کہ وہ ہمارا نکاح پڑھا دیں۔ کیا تمھیں میری بیوی بننا قبول ہے؟ میں روتے روتے مسکرانے لگی البتہ مولوی صاحب حیرت میں ڈوب گئے۔ مولانا! جلدی کریں وقت تنگ ہے۔ میں جنت میں بھی اسی لڑکی کو اپنی بیوی دیکھنا چاہتا ہوں۔ تب میں نے بلند آواز میں اقرار کیا ''مجھے ہزار بار لاکھ بار قبول ہے تمھاری بیوی بننا۔''

''بیٹا جی! میں تمھارا مدعا سمجھ گیا مگر ذرا رکو، میں دو گواہ لے آؤں۔'' یہ کہہ کر مولوی صاحب بھاگم بھاگ باہر نکلے اور پل بھر میں لوٹ آئے۔ ان کے ساتھ ۲ پہلوان قسم کے آدمی تھے جو قریبی اکھاڑے سے آئے تھے۔ پہلوانوں کا یہ اکھاڑہ سارے لاہور میں مشہور ہے۔ مولوی صاحب نے تیزی سے نکاح کی رسم ادا کرنی شروع کردی۔

''یہ شادی بھی انوکھی شادی تھی۔ دلہا کا سر دلہن کی گود میں تھا اور وہ دلہا موت کو روکے ہوئے اپنا نکاح پڑھوا رہا تھا۔ ہے نا انوکھی بات۔'' باجی نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی انوکھی بات نہیں، وقت کے مطابق تھی یہ کارروائی۔'' مگر افسوس کہ جب مولوی صاحب سنتِ نکاح والی حدیث تلاوت فرما رہے تھے تو وقار کی طلب کی ہوئی مہلت پوری ہوچکی تھی۔ وہ آخری ہچکی لے کر مجھے قبول کرنے سے پیشتر ہی تنہا چل بسا۔ آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ میری شادی ہوئی۔'' یہ کہہ کر باجی نے سر جھکا لیا۔

''باجی! آپ کی شادی ہوگئی تھی کیونکہ آپ نے گواہ کے سامنے وقار کو قبول کرلیا تھا اور یاد رہے وقار صاحب آپ کو پہلے ہی قبول فرما چکے تھے کہ الاعمال بالنیات اعمال کا فیصلہ نیتوں سے ہوتا ہے۔ انھوں نے خود آپ سے نکاح کی بات کی تھی۔ گویا یہ ان کا قبول کہنا تھا۔ بلکہ انھوں نے آپ کو قول و فعل سے قبول فرمایا تھا لہٰذا آپ کی شادی ہوگئی تھی۔''

''الاعمال بالنیات!'' باجی نے زیرِ لب دہرایا اور مسکرانے لگی۔ ''برخوردار تو نے میرا بوجھ ہلکا کردیا۔ جانے یہ بات میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی تھی۔ واقعی اعمال کا فیصلہ تو نیت پر ہوتا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد ہم جھونپڑی سے کچھ فاصلے پر وقار کی قبر پر فاتحہ خوانی کر رہے تھے۔ بعدازاں میں نے تربت کے سرہانے کھڑے ہوکر شعر پڑھا:

بنا کر رند خوش رسمے نخا کرد خون غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

اس طرح میں ۱۹۶۰ء میں طویل مدت کے لیے امریکا چلا گیا جہاں میری پیشہ ورانہ تعلیم کی تکمیل ہوئی۔ واپس آیا تو پاکستان کے مختلف علاقوں میں مناسب مقامات پر ریڈاروں کا سلسلہ قائم کیا۔ اس دوران میں مشرقی پاکستان گیا اور موت کے منہ سے زندہ نکل آیا۔ اس طرح عرصے تک باجی سے رابطہ نہ ہوسکا۔ اس داستان کا المناک پہلو یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۷۱ء میں جس روز پاکستان دولخت ہوا، باجی عینی ٹرانسمیٹر پر خبریں سن رہی تھی۔ سقوطِ ڈھاکا کی خبر نشر ہوئی تو ان کے دل نے بغاوت کردی اور دھڑکن ہی بھول گیا۔ اس المناک حادثے کے ۱۰ روز بعد مجھے خبر ملی اور میں وہاں پہنچا مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا سوائے خالی جھونپڑی اور ایک پختہ قبر کے۔ کاروبارِ دنیا یونہی چلتا رہا پھر میں پاک فضائیہ سے سبکدوش ہوگیا تو بھولے ہوئے سارے کام یاد آئے۔ شہرِ خموشاں کی زیارت کی تو وہاں جھونپڑی تھی نہ وہ قبر جہاں نورانی شمع دفن تھی۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ میرا لگایا ہوا سادہ سا کتبہ ایک جگہ روندا پڑا تھا۔

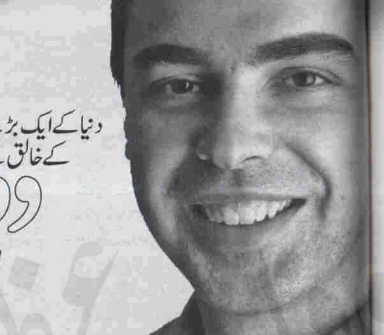

دنیا کے ایک بڑے ادارے کے خالق سے ملیے

''ہماری کمپنی ایک خاندان کے مانند ہے''

گوگل کے شریک بانی لیری پیج سے ایک فکر انگیز اور دلچسپ ملاقات

رپورٹ: ہبیرس

یہ کئی سال پہلے کی بات ہے، جب ایک گیراج میں ۲ امریکی لڑکوں، لیری پیج اور سرگئی ہرن نے آئی ٹی کمپنی، گوگل کی بنیاد رکھی۔ آج پوری دنیا میں تعلیم مکمل کرنے والے لاکھوں طلبا و طالبات کی پہلی تمنا یہی ہوتی ہے کہ کاش انھیں گوگل میں ملازمت مل جائے۔ وجہ یہ ہے کہ گوگل کے دفاتر دنیا میں کام کی بہترین جگہیں تصور کی جاتی ہیں۔

جو کاروبار ۱۹۹۸ء میں ۲ لڑکوں نے شروع کیا، وہ آج پوری دنیا میں پھیل چکا۔ گوگل میں ساڑھے اٹھارہ ہزار ملازمین کام کرتے ہیں اور کمپنی کی آمدن پاکستانی کرنسی میں کھربوں روپے سالانہ ہے۔ گوگل کا شمار دنیا کی بڑی کمپنیوں میں ہوتا ہے۔ اس کی بین الاقوامی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ گوگل کے صدر دفتر میں ملازمین کو سیکڑوں سہولیات حاصل ہیں مثلاً مفت کھانا، کھیلنے کی مخصوص جگہیں، فلم و تھیٹر، بیراکی کے تالاب،

سرائے خانے اور نجانے کیا کچھ۔ غرض کمپنی کوشش کرتی ہے کہ ملازمین کو تفریح کے کوتا کوں مواقع میسر آئیں۔ اس عمل کے پیچھے یہ فلسفہ پوشیدہ ہے کہ یوں ملازمین خوش رہتے، ذہنی سکون پاتے اور زیادہ کام کرتے ہیں۔

لیکن گوگل میں ملازمت حاصل کرنا آسان نہیں، یہ کمپنی دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں سے تعلیم یافتہ صرف وہی طلبا و طالبات منتخب کرتی ہے جن کے اعلیٰ نمبر ہوں۔ تب بھی متوقع امیدوار انٹرویو کے دس گیارہ مراحل سے گزرتے ہیں جن میں ان کی مختلف صلاحیتیں جانچی جاتی ہیں۔ اب آ کر گوگل نے جانچ کے کچھ معیار ہلکے کیے ہیں اور امیدوار چار پانچ مراحل ہی سے گزارے جاتے ہیں۔

لیری پیج اس وقت گوگل کا سی ای او ہے۔ اس نے پچھلے ماہ مشہور امریکی رسالے، فورچون کو ایک انٹرویو دیا۔ اس میں لیری نے مختلف موضوعات مثلاً گوگل کے قیام، کام، دفاتر میں خاندان نما ماحول اور مفت طعام کے متعلق دلچسپ باتیں کیں۔ اس انٹرویو کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

س: گوگل میں ملازمین کی حالت میں پچھلے ایک عشرے کے دوران کوئی تبدیلی آئی ہے؟

ج: ظاہر ہے، جب کمپنی بڑی ہو اور اس میں زیادہ ملازمین آجائیں، تو حالات بدل جاتے ہیں۔ لیکن سٹنافورڈ (یونیورسٹی) میں تعلیم پاتے ہوئے میں نے جانا کہ انسان جب یونیورسٹی کا طالب علم ہو، تو وہ کوئی بھی کام کر سکتا ہے۔ میں نے یہ بات نہیں بھلائی، چنانچہ ہم یونیورسٹیوں سے ذہین ترین طلبہ و طالبات اور روشن دماغ گوگل لے آتے ہیں۔ اس تکنیک سے ہمیں بہت فائدہ پہنچا اور گوگل نے حیران کن ترقی کی۔

دراصل دنیا بدلنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اہم منصوبوں پر کام کریں۔ تب ہی انسان اپنے اندر جوش و جذبہ محسوس کرتا ہے۔ جب وہ صبح اٹھے، تو اس میں نئی امنگیں اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ جنم لیتا ہے اور یہی بنیادی بات ہے۔ آپ کو چاہیے کہ بامقصد اور کچھ کر دینے والے منصوبوں پر عمل پیرا ہوں کہ دنیا میں ابھی کمی کمی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ گوگل ایسے ہی منصوبوں پر کام کر رہا ہے۔

س: ایک عشرہ قبل گوگل میں چند سو لوگ ملازم تھے، آج ہزاروں ملازمت کرتے ہیں۔ کیا ان کے سامنے بھی آپ کا مشن واضح ہے؟

ج: ۱۹۹۸ء میں جب گوگل کا آغاز ہوا، تو ہمارا مشن یہی تھا کہ بکھری ہوئی عالمی معلومات منظم کر دی جائیں۔ مجھے یاد ہے، اس زمانے میں کمپنی میں تقریباً ۱۰۰/افراد ملازم تھے۔ میرے دوست مجھے کہتے ''تمہارے ہاں ۱۰۰/لوگ ملازم ہیں۔ یہ بہت بڑی تعداد ہے لیکن تم مزید کارکن کیوں چاہتے ہو؟''

میں انھیں بتاتا کہ ہم کسی ایک ملک نہیں پوری دنیا کی معلومات منظم کر رہے ہیں، لہٰذا ہمیں بہت سارے ساتھی درکار ہیں۔ یہ چند سو لوگ بھی صحیح طرح انجام نہیں دے سکتے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہم نے جو منصوبہ بندی کی تھی، وہ کامیاب ہوئی۔ ہمارے کام نے پوری دنیا پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ لیکن یہ کامیابی پانے کی خاطر ہمیں زبردست محنت و مشقت کرنا پڑی۔

میں سمجھتا ہوں کہ گوگل کا کام ابھی ختم نہیں ہونے والا کیونکہ دنیا میں بے شمار مسائل ہیں۔ ہمارے جتنے وسائل ہیں، ان کی حد میں رہتے ہوئے ہم مسائل حل کرنے کی اپنی سعی کرتے رہیں گے۔

س: آپ گوگل کے ماحول کو کس طرح بیان کریں گے؟

ج: میرے دادا کاریں بنانے والے ایک کارخانے میں کام کرتے تھے۔ انھوں نے ایک ہتھیار تیار کیا تھا تاکہ وہ کارخانے میں خود کو مالکان اور غنڈہ گرد عناصر سے محفوظ رکھ سکیں۔ وہ ہتھیار آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ لوہے کا ڈنڈا ہے جس کے سرے پر فولادی گولا نصب ہے۔ گویا اس زمانے میں کمپنیوں کے ملازمین کو اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار رکھنے پڑتے تھے۔ اس لحاظ سے آج کمپنیوں کے ماحول میں انقلابی تبدیلی آچکی۔ بحیثیت لیڈر میری ذمے داری یہ ہے کہ گوگل میں ہر کسی کو ترقی و کام کے عظیم مواقع ملیں۔ ہر کارکن کو محسوس ہو کہ وہ

اپنے کام سے بامعنی اثرات مرتب کر رہا ہے اور یہ کہ اس کی کوششوں سے معاشرے میں نیکی و خیر جنم لے رہے ہیں۔ گوگل کا مشن یہی اَمر ہے۔

س: گوگل میں ملازمین کو کئی سہولیات میسر ہیں مثلاً مفت کھانا، مساج مراکز وغیرہ۔ آپ کے نزدیک ملازمین کو ملنے والی سہولیات کتنی اہم ہیں؟

ج: یہ سہولیات کسی ایک فرد کو مدنظر رکھ کر سامنے نہیں آئیں۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ کمپنی ایک خاندان میں ڈھل جائے، لوگ یہ محسوس کریں کہ وہ کمپنی میں حصے دار ہیں اور یہ کہ وہاں انھیں بالکل خاندان جیسا ماحول میسر ہے۔ دراصل ملازمین کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے، تو پیداوار بڑھتی اور ترقی ہوتی ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ دیکھا جائے، کارکن کتنے گھنٹے کام کرتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ کام کتنا کر رہا ہے اور آیا وہ معیاری ہے؟

گوگل میں ہم ایسے طریقوں کی تلاش میں رہتے ہیں جن کے ذریعے ملازمین اور مالکوں کے مابین تعلقات خوشگوار ہو سکیں تاکہ کام بہترین طور پر انجام پائے۔ اسی لیے ساتھیوں کی صحت پر بھی ہماری توجہ ہے۔ ہماری سعی ہے کہ وہ ہمیشہ تندرست رہیں اور بُری عادات مثلاً سگریٹ نوشی سے چھٹکارا پالیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر کمپنیوں کی نسبت ہمارے طبی اخراجات کم ہیں۔ پھر ہمارے لوگ زیادہ خوش اور سودمند ہیں جو زیادہ اہم اَمر ہے۔

س: کیا آپ ان اقدامات کا ذکر کر سکتے ہیں جو ملازمین کی صحت بہتر کرنے کے لیے کیے جا رہے ہیں؟

ج: دیگر بڑی کمپنیوں کے ملازمین تندرست رہنے کی خاطر عموماً بڑے جمنازیم جاتے ہیں۔ لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ ملازمین وہ جمنازیم پسند کرتے ہیں جو قریب ہو، چاہے وہ چھوٹا ہی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ دفتر سے نکل کر کار پر جمنازیم جانا اور پھر پارکنگ و دیگر بکھیڑوں سے نبرد آزما ہونے میں بہت سا وقت و توانائی ضائع ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم نے تمام بڑے دفاتر میں چھوٹے جمنازیم بنا دیے۔ مزید براں ہمارے ہر دفتر میں ایک ڈاکٹر بیٹھتا ہے۔ ہم ساتھیوں کو مزید طبی سہولیات دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ ذہنی و جسمانی طور پر صحت مند رہیں۔

س: کیا مفت کھانا گوگل میں ''متبرک'' حیثیت رکھتا ہے اور کیا یہ ملازمین کو ہمیشہ ملتا رہے گا؟

ج: مجھے ہمیشہ کا تو علم نہیں، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس سے کمپنی کو فائدہ پہنچا ہے۔ مجھے اخراجات کی کوئی پروا نہیں، بس یہ فکر ہے کہ بعض لوگ مفت کھانا کھا کر فربہ نہ ہو جائیں۔ موٹے لوگ پھر عموماً کام صحیح طرح انجام نہیں دیتے۔ بہرحال مفت کھانے کی بدولت کمپنی ایک خاندان کے مانند نظر آتی ہے اور پھر خاصی حد تک یوں صحت مند طبی عادات نے بھی جنم لیا مثلاً لوگ جان رہے ہیں کہ زندہ رہنے کے لیے کھانا کھایا جائے، کھانے کی خاطر زندہ نہ رہا جائے۔

س: آپ اور سرگئی جب غیر شادی شدہ تھے، تب بھی آپ کا نقطۂ نظر تھا کہ بیوی، بچوں کو بھی بھرپور توجہ ملنی چاہیے۔ آپ اب خود بیوی بچوں والے ہو چکے، تو گھر اور دفتر کے مابین توازن کا نقطۂ نظر تبدیل ہوا؟

ج: یہ نقطۂ نظر بالکل تبدیل نہیں ہوا۔ ہم انتہائی لچک دار ہیں، اسی لیے ملازمین کو پوری سہولت دیتے ہیں کہ وہ اپنے خاندان سے بھرپور تال میل رکھیں۔ دراصل ملازمین کو عزت دی جائے، ان کی خواہشات کا احترام کیا جائے، تو وہ کمپنی کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں۔

س: لوگ کہتے ہیں کہ گوگل کے تمام فیصلے صدر دفتر میں ہوتے ہیں۔ کیا یہ بات درست ہے؟ کیونکہ آپ کی کمپنی کے دفاتر پوری دنیا میں پھیلے ہیں۔

ج: دراصل ہماری افرادی قوت کا ۴۰/فیصد صدر دفتر میں جمع ہے، چنانچہ بیشتر فیصلے وہیں انجام پاتے ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ مستقبل میں صدر دفتر کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں رہے گی۔ ہم ایسے آلات بنا رہے ہیں جن کی مدد سے ہمارے ملازمین دنیا کے کسی بھی حصے میں بیٹھ کر مفید و موثر کام کر سکیں۔

۴۰۰ بچوں کے لیے مری آغوش پر کام جاری ہے

یتیم بچوں کے لیے محبت بھری آغوش

عمر ادریس

۸ ملین روپے سے "الخدمت" کا ملک گیر فلاحِ یتامیٰ (Orphan Family Support Program) پر ایک شاندار پراجیکٹ کا آغاز

پائلٹ پراجیکٹ میں کامیابی کے بعد اس پروگرام کو پورے پاکستان کی سطح پر چلانے کا عزم رکھتی ہے۔ خالص اللہ کی خوشی اور رضا کے لیے شروع کیا جانے والا یہ کام اِن شاء اللہ ہزاروں یتیم اور بے آسرا بچوں کو عزت، سہولت اور حفاظت دینے کا باعث بنے گا۔ اس خدمت اور خیر کے کام میں آپ بھی ہمارا حصہ بن سکتے ہیں

کوئی

والدین یہ نہیں چاہتے کہ ان کے بچے رُل جائیں لیکن موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ یہ کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ موت یہ نہیں دیکھتی کہ کسی کے بچے چھوٹے ہیں یا جوان یا کسی خاندان کے کفیل کے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جانے کے بعد کفالت کیسے ہوگی۔ یہ اللہ کا نظام اور کسی معاشرے کا امتحان ہے کہ ان بچوں سے معاشرہ کیا سلوک کرتا ہے۔ انہیں کیا درجہ دیتا ہے، ان کو قومی سرمایہ خیال کرتا ہے یا محکوم و محتاج مخلوق سمجھتا ہے۔ اسلام نے جن اعمال کو بہت واضح طور پر صالح اعمال قرار دیا ہے ان میں یتیموں اور مسکینوں کی مدد کرنا بھی شامل ہے۔ اس ضمن میں حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں میرے ساتھ ایسے ہی ہوگا جیسے ہاتھ کی ۲ر انگلیاں۔

ہمارے معاشرے میں یتیموں اور مسکینوں کی مدد روٹی اور کپڑے کی فراہمی کی حد تک ضرور کی جاتی ہے۔ لیکن ان بچوں کی مستقل اخلاقی اور مالی مدد کا تصور کم بروئے کار آتا ہے۔

الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان نے اس حوالے سے پہل کی اور ۲۰۰۲ء میں یتیم بچوں کی کفالت کا پروگرام شروع کیا۔ ضلع اٹک میں قائم کیے جانے والے یتیم بچوں کے لیے الخدمت کے پہلے پروجیکٹ کا نام ''آغوش'' رکھا گیا۔ جہاں ان بچوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ صحت اور خوراک کا خوب خیال رکھا جاتا تھا۔

۲۰۰۵ء میں آنے والے ہولناک زلزلے کے بعد ''آغوش'' پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس وقت ۲۰۰ر بچے اس کیڈٹ کالج طرز کے دارالیتامیٰ (Orphan age) میں بلا مبالغہ ایک اچھی، محفوظ اور باعزت زندگی گزار رہے ہیں۔ اسی نام سے ایک اور orphan age مری ایکسپریس وے پر بھی زیرِ تعمیر ہے۔ اس کا رقبہ ۱۰۰۰۰ر مربع میٹر ہے اور یہاں مستقبل قریب میں ۴۰۰ر یتیم بچوں کے لیے نہ صرف تعلیم بلکہ ٹیکنیکل تعلیم کا بھی اہتمام ہوگا۔ آغوش کے قیام کا اکلا منصوبہ کراچی شہر میں ہے۔

الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان ملک میں اللہ کے بندوں کی بے لوث خدمت کے ان جذبوں کو مہمیز دیتے ہوئے پورے ملک کی سطح پر نہ صرف Orphanage کے قیام کا عزم رکھتی ہے۔ بلکہ رواں سال اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے فلاحِ یتامیٰ ''Orphan Family Support Program'' کا بھی آغاز کر دیا ہے۔ اس پروگرام کے تحت نہ صرف ان بچوں کی کفالت کی جائے گی جو آغوش میں رہائش پذیر ہیں بلکہ ایسے یتیم بچے جو اپنے خاندان کے کفیل کے نہ ہونے کے باعث بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کی گھریلو کفالت کا اہتمام بھی ان کے گھروں تک پہنچ کر کیا جائے گا۔

فلاحِ یتامیٰ (Orphan Family Support Program) ابتدا میں پائلٹ پراجیکٹ کے طور پر تمام صوبہ جات بشمول آزاد کشمیر، گلگت و بلتستان اور فاٹا کی ایک ایک منتخب یونین کونسل میں شروع کیا جا رہا ہے۔ اس کی مدت ایک سال رکھی گئی ہے۔ ہر منتخب یونین کونسل سے ایسے ۳۰ر یتیم اور بے سہارا بچے منتخب کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔

اسی سلسلے کا پہلا پروگرام اٹک شہر میں یتیم بچوں کی کفالت کے لیے قائم ''آغوش'' میں کیا گیا۔ اس خوبصورت تقریب کے اصل روحِ رواں یتیم بچے تھے، جو اپنے خاندان کا کفیل کے نہ ہونے کے باعث بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم تھے۔ مگر ذہانت اور زندگی میں کچھ کر گزرنے کا عزم ان کے چہروں پر عیاں تھا۔ اس تقریب میں الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان نے ''قطر چیرٹی'' کے تعاون سے ۱۰۸ر نونہالانِ قوم میں ۱۸ر لاکھ روپے کے چیک تقسیم کیے تاکہ اللہ تعالیٰ ان پر زندگی آسان کر دیں۔

الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان پائلٹ پراجیکٹ میں کامیابی کے بعد اس پروگرام کو پورے پاکستان کی سطح پر چلانے کا عزم رکھتی ہے۔ خالص اللہ کی خوشی اور رضا کے لیے شروع کیا جانے والا یہ کام ان شاء اللہ ہزاروں یتیم اور بے آسرا بچوں کو عزت، سہولت اور حفاظت دینے کا باعث بنے گا۔ اس خدمت اور خیر کے کام میں آپ بھی ہمارا حصہ بن سکتے ہیں۔ ہمارا تو ایمان ہے کہ اگر یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے پر اللہ کے رسولؐ نے اجر کے لیے سر کے ان گنت بالوں جتنی خوشخبری سنائی ہے تو ان یتیم بچوں کی خدمت اور حفاظت کے لیے اپنی آغوش میں لینے پہ کس قدر بڑی کامیابی اور خوشی ملے گی۔ انسان تو نیت اور ارادہ کر کے ہی اللہ کی خوشنودی کا حقدار بن جاتا ہے۔

مرحوم شوہر کی خواہش

''میرے ۳ر بچے ہیں اور میرے شوہر کو فوت ہوئے تیسرا سال ہے۔ سب سے بڑا بیٹا چھٹی جماعت میں ہے اور باقی ایک بیٹا اور بیٹی چھوٹے ہیں۔ گھر کے اخراجات پورے کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ گھروں میں کام کاج بھی کیا کہ کسی طرح بچوں کی تعلیم جاری رکھ سکوں لیکن دو وقت کی روٹی پوری کرنا محال ہو گیا۔ قریب تھا کہ بڑے بیٹے کو بھی سکول سے اُٹھانا پڑتا مگر خدا کا کرنا کیسا ہوا کہ الخدمت فاؤنڈیشن نے مجھ سے رابطہ کیا اور میرے مسائل سننے کے بعد میرے بچوں کی غذائی اور تعلیمی ضروریات کے حوالے سے مدد کی۔ بچوں کی تعلیم ان بچوں کے مرحوم والد کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ میں اس خواہش کی تکمیل پر خوش ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔''

(زینب بی بی۔ والدہ ارسلان۔ حضرو، اٹک)

دل کے تاروں کو چھیڑتی..... ایک سدا بہار دلآویز کتاب
جو کئی سوال اٹھاتی ہے..... جواب کے لیے دل پہ دستک دیتی ہے

دل پہ دستک
اختر عباس
تیسرا ایڈیشن
صفحات: 240
قیمت: 200 روپے

''یہی وہ بات ہے جو انھیں اپنے ہم عصروں میں ہی نہیں جملہ اہلِ قلم میں بھی ممتاز کرتی ہے اور ممتاز رکھتی ہے۔
ان کے الفاظ کھڑکتے اور کھڑکھڑاتے نہیں، ٹھہرتے اور ٹھہراتے ہوئے دل حتمی میں کر لیتے ہیں۔''
(جلسۂ عام۔ مجیب الرحمٰن شامی)

''ہر زندہ تحریر کی طرح اپنی زندگی اور توانائی کا ثبوت خود فراہم کرتی ہے
یہی اختر عباس کا کمال ہے جو اس کتاب میں آپ کو بار بار حیران کرے گا۔''
(طلوع۔ ارشاد احمد عارف)

منشورات
منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ فون: 35434909-35425356-042 فیکس: 35434907-042
manashurat@hotmail.com

یہاں پھر کشور غلطی کر گئیں۔ لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو والا واقعہ نیلو کے ساتھ نہیں، فلمسٹار ممتاز کے ساتھ پیش آیا تھا۔ نیلو والا معاملہ گورنر کالا باغ کے دور میں ہوا تھا

کشور ناہید کی ”شناسائیاں“

یہ دلچسپ اور مدلل تحقیقی تحریر، قارئین کو بے شک بہت پسند آئے گی مگر کچھ جبینیں شکن آلود بھی ہوں گی مگر کیا کریں، وجہ وہ خود ہیں، لکھنے والے کا کیا دوش اپنے لیے آزادیٔ فکر اور آزادیٔ خیال کے نعرے لگانے بے حد آسان ہوتے ہیں۔ ہاں دوسروں کو ایسی آزادی دینے میں کئی مشکل مقام آتے ہیں

واقعات میں بعض بنیادی نوعیت کی غلطیاں اور غلط بیانیاں ہیں

محمود احمد لئیق، کراچی

کشور ناہید کی کتاب ”شناسائیاں رسوائیاں“ سنگِ میل پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی تھی۔ پچھلے دِنوں یہ ہمارے زیرِ مطالعہ رہی۔ کشور ناہید کئی حیثیتوں سے ممتاز ہیں۔

اس کتاب میں انہوں نے چند مشہور ادیبوں اور شاعروں کے خاکے، چند واقعات اور کچھ لطائف بھی شامل کیے ہیں۔ خاکے عقیدت اور محبت سے تحریر کیے گئے مگر واقعات میں بعض بنیادی نوعیت کی غلطیاں یا غلط بیانیاں ہیں۔ موصوفہ شاید تحقیق کے بغیر جلد بازی یا کتابوں کی فہرست میں اضافے کی تگ و دو میں اَناپ شناپ لکھ گزری ہیں۔ اکثر جگہ محسوس ہوا کہ حامد کی ٹوپی محمود کے سر ڈال دی۔

مثال کے طور پر صفحہ نمبر ۳۳ پر رقم طراز ہیں ”حبیب جالب اور شورش کاشمیری کا ٹولنٹن مارکیٹ میں لڑائی اور ایک دوسرے پر گھی کے ڈبے پھینکنے کا منظر بھی مجھے آج تک یاد ہے“۔ ہم یہ عرض کرنے کی جسارت کریں گے کہ یہ معرکہ حبیب جالب اور شورش کاشمیری نہیں بلکہ کوثر نیازی اور شورش کے درمیان وقوع پذیر ہوا۔

حبیب جالب نے اپنی سوانح عمری ”جالب بیتی“ میں کہیں اس کا تذکرہ نہیں کیا، البتہ یہ ضرور لکھا کہ شورش سے اس کے دفتر میں بحث مباحثہ ہوا تھا۔ اس کے برعکس

کوثر نیازی نامور شخصیات پر مبنی خاکوں کی اپنی کتاب ''جنھیں میں نے دیکھا'' میں شورش کاشمیری کے خاکے میں صفحہ ۱۲۹/ میں فرماتے ہیں ''شورش اور میں اب کے پھر متحارب کیمپوں میں تھے۔ قلمی لڑائی پھر چھڑ گئی اور اب کے اس نے انتہائی مکروہ شکل اختیار کرلی۔ لاہور کی ٹولنٹن مارکیٹ میں ہم دونوں میں ہاتھا پائی ہوگئی۔ بات کا بتنگڑ بن گیا، دونوں طرف احتجاجی جلسے ہوئے اور جلوس نکلنے لگے۔ ہم دونوں کو مارشل لاء انتظامیہ نے بلا کر وارننگ دی۔ (اتنی وضاحت کرتے چلیں کہ یہ یحییٰ خان کے مارشل لاء کا ذکر ہے)۔

وقتی طور پر تصادم رک گیا لیکن طبیعتوں میں تلخی بدستور باقی رہی تا آنکہ پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی اور کچھ عرصے بعد شورش جیل میں ڈال دیے گئے۔ شاید ہمارے ملاپ میں کافی دیر لگ جاتی کہ میری زندگی میں ایک ایسا حادثہ آیا جس نے ہم دونوں کو پھر ایک کردیا۔ دلوں کا میل ایسے دھل گیا جیسے کبھی ان میں کدورت پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔ یہ حادثہ میرے بیٹے فاروق کی جوانمرگی کا تھا جو ۹/دسمبر ۷۲ء کو ایک حادثے میں اللہ کو پیارا ہوا۔ فاروق سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں عزیزی مسعود شورش کے ساتھ پڑھتا تھا، اس حادثے پر شورش مرحوم کا دل پگھل گیا۔ وہ ان دنوں نظر بندی ہی کے عالم میں میو ہسپتال لاہور میں زیرِ علاج تھے۔ وہیں سے انہوں نے ایک تار کے ذریعے اس المیے پر مجھ سے قلبی تعزیت کا اظہار کیا۔''

شورش مرحوم بہت گرم مزاج اور شعلہ بیان فرد تھے، ان کے استاد احسان دانش کے مطابق'' وہ ایسا مسلمان ہے کہ اس کا خون ٹھنڈا ہونے میں نہیں آتا''۔ مولانا ماہر القادری اپنے رسالے ماہنامہ فاران مطبوعہ جنوری ۱۹۷۶ء میں شورش کے متعلق لکھتے ہیں'' مشہور شخصیتوں پر تنقید کرنے میں وہ خاصے جری اور بیباک تھے..... لائلپور (موجودہ فیصل آباد) میں میرے شیر نے وہ دھواں دھار اور طوفانی تقریر کی کہ پورے ماحول کو شعلۂ جوالہ بنا دیا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو پر اس قدر کس کر تنقید کر ڈالی جیسے مقرر کو اپنا مال و دولت عزیز ہے نہ آرام وراحت سے دلچسپی ہے اور نہ اپنی جان پیاری ہے۔'' آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، شورش گرفتار کر لیے گئے۔ ویسے بھی شورش لڑائی کے بے حد شائق تھے لیکن اسے انہوں نے وزیروں، صدور، وزیراعظم اور دیگر ہاتھیوں تک محدود رکھا۔ حبیب جالب اپنی تمام تر بہادری اور استقامت کے باوجود شورش کا نشانہ بننے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ ان کی کم مائیگی بلکہ مفلوک الحالی کی داستان تو خود کشور ناہید نے بھی اپنی کتاب میں تحریر کی ہے۔

دوسرا مغالطہ ان الفاظ میں دیکھیے ''بھٹو صاحب نے لاڑکانہ میں تمام ملکوں کے سفیروں کے لیے زبردست پارٹی کا اہتمام کیا۔ لاڑکانہ ریلوے اسٹیشن کو بہت بنایا، سنوارا گیا۔ شام کی محفل میں نیلو کو رقص کرنے بلانے کے لیے وہی ترکیب نمبر ۹ یعنی پولیس کے ذریعہ کہا گیا کہ حکم آیا ہے، چلنا ہے، رقص کرنا ہے۔ نیلو کو یہ بات ناپسند ہوئی۔ اس نے زہر کھانے کی کوشش کی اور لاڑکانہ نہیں گئی۔ اس کی اس جرأت رندانہ پہ سب نے داد کی اور یہ تذکرہ بہت دن تک جاری رہا۔ تبھی جالب نے مشہور زمانہ نظم کہی ''تو کہ ناواقفِ آدابِ غلامی تھی کہ..... رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے''۔

اس جگہ بھی کشور ناہید صاحبہ غلطی کر گئیں کہ نیلو کے ساتھ یہ التفات بھٹو دور نہیں بلکہ ایوب خان کے دور میں برتا گیا۔ حبیب جالب نے اپنی کتاب میں یہ قصہ یوں بیان کیا ہے'' اس زمانے میں شہنشاہِ ایران کے اعزاز میں کوئی فنکشن تھا۔ اس لئے نیلو کو تیار ہونے کو کہا گیا۔ لیکن کہنے کا انداز مہذب نہیں تھا۔ نیلو کے ریاض شاہد سے تعلقات بن رہے تھے۔ ابتدائی تعلقات تھے یا ذرا آگے چلے گئے ہوں گے تو ریاض شاہد انہیں منہ پھاڑ کے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ''نہ جاؤ''، لیکن نیلو نے محسوس کرلیا کہ ریاض شاہد نہیں چاہتے کہ اس تقریب میں شامل ہوں۔

اس پر نواب کالا باغ کی طرف سے جو لوگ اس کام کے لیے مامور تھے، انہوں نے غنڈہ گردی کی انتہا کردی۔

یہ لڑائی حبیب جالب اور شورش کاشمیری کے درمیان نہیں بلکہ کوثر نیازی اور شورش کے مابین ہوئی تھی

اس کو برا بھلا اور طمانچہ بھی مارا۔ نیلو نے جواب میں خواب آور گولیاں کھالیں۔ میں اور ریاض اسے دیکھنے یو سی ایچ گئے۔ جب دیکھ کر واپس آرہے تھے تو میں نے کہا، ریاض شاہد! نیلو بیگم نے بڑا ہی اچھا امپریسٹ رول ادا کیا ہے۔ اس نے شہنشاہِ ایران کے سامنے جو امریکی سامراج کا اس علاقے میں سب سے بڑا ایس ایچ او ہے، ناچنے سے انکار کردیا۔ اس پر ایک نظم ہوگئی ہے۔ اس نے کہا'' سناؤ''۔ میں نے یہ نظم سنائی تھی۔ ؎

تو کہ ناواقف آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
تجھ کو انکار کی جرأت جو ہوئی ہے تو کیونکر
سایۂ شاہ میں اس طرح جیا جاتا ہے

اب جالب صاحب کے الفاظ میں بھٹو صاحب کی کارکردگی پر نظر ڈالتے ہیں'' بھٹو دور میں بھی ایوب دور کا ایک واقعہ دہرایا گیا تھا اور اداکارہ ممتاز سے چلنے کو کہا گیا۔ سٹوڈیو میں ان لوگوں نے اس کے گرد گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ طارق عزیز نے کہا'' اگر کوئی حبیب جالب ہوتا تو نیلو کی طرح ممتاز پر بھی نظم لکھتا''۔ میں شورش کاشمیری کے ہاں ملک عبدالسلام کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے کسی نے یہ بات بتائی۔ میں نے کہا، ملک صاحب، ایک نظم نازل ہوئی ہے، کہیں تو سناؤں۔ انہوں نے کہا'' سناؤ''۔ تب میں نے یہ نظم کہی تھی۔ ؎

قصرِ شاہی سے یہ حکم صادر ہوا
لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو
اپنے ہونٹوں کی خوشبو لٹانے چلو
گیت گانے چلو ورنہ تھانے چلو

ایک اور غلط بیانی جو مذکورہ کتاب میں کی گئی وہ قرۃالعین حیدر کی پاکستان سے واپس بھارت روانگی کا معاملہ ہے۔ کشور ناہید لکھتی ہیں'' ۱۹۶۷ء میں عینی آپا پاکستان سے دلبرداشتہ ہوکر بھارت واپس چلی گئی تھیں''۔ روزنامہ ڈان نے ان کی روانگی ۱۹۶۰ء میں بیان کی ہے۔ اگر ہم قرۃالعین صاحبہ کی سوانح ''کارِ جہاں دراز ہے'' کا مطالعہ کریں تو صاف پتا چلتا ہے کہ ۱۹۶۰ء کے بعد والے واقعات بھارت سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاریخ اور سال کا معاملہ اتنا اہم نہیں لیکن کتابیں حوالے کا کام دیتی ہیں۔ اگر انہی میں غلط سلط باتیں یا بقول مصنفہ کے اَنَاپ شَناپ درج ہوں تو پھر..... ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ۔

اب ان کے ایسے تحریر کردہ خاکوں کا ذکر جن کے متعلق ہم نے اوپر دودھ اور میگنی کی مثال دی۔ سب سے پہلا خاکہ انہوں نے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا تحریر کیا۔ ذکر بڑی محبت اور احسان مندی سے کیا ہے، لیکن جگہ جگہ ایسی باتیں تحریر کردیں جس نے ان کی عظمت کا بہت نہ صرف پاش پاش کردیا بلکہ انتہائی گھناؤنی شکل پیش کی ہے۔

صفحہ ۸/ پر یہ اطلاع دی ہے کہ صوفی صاحب کی بیوی کا انتقال ہوچکا تھا۔ صفحہ ۹/ پر تحریر کرتی ہیں'' ان دنوں صوفی صاحب کے ساتھ ایک خاتون رہتی تھیں۔ وہ شاید کہیں پڑھاتی تھیں''۔ صفحہ ۱۰/ کا یہ حوالہ بھی دیکھتے چلیں ''ہر چند صوفی صاحب کے ساتھ اس زمانے میں ایک اور خاتون رہ رہی تھی مگر صوفی صاحب بہت بے چین رہتے تھے''۔ خاکے کے آخر میں بھی اسی طرح کی معلومات ملتی ہیں۔

صفحے ۱۱/ پر لکھتی ہیں'' صوفی صاحب آخر عمر میں واہ بھی جانے لگے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کون خاتون تھیں مگر راستے میں اسلام آباد میں حمید علوی کے یہاں قیام

کرتے''۔ ہمیں خوشی ہے کہ انھوں نے یہ قصّہ تین خواتین کے تذکرے تک محدود رکھا، ورنہ کیا تعجب تھا کہ ایک اور خاتون کا ذکر کر کے یہ تاویل پیش کی جاتی 'چار تک کی اجازت ہے۔

جوش ملیح آبادی کی شان میں 'قصیدہ' ان الفاظ میں ہے''جوش صاحب نے جب اپنے سفر کا بل دیا..... کاش یہ محفوظ ہوا ہوتا، اس میں ٹانگے کے کرائے کے علاوہ پاندان کا خرچ بھی لکھا تھا''۔ یہ کہانی ایک مرتبہ بیان کرنا کافی نہ تھا لہٰذا اسے دو جگہوں پر بیان کیا گیا ہے۔ صفحہ ۴۰؍ اور پھر صفحہ ۱۷۳؍ پر دہرائی گئی۔

مزید لکھتی ہیں''لاہور کالج میں داخلہ لیا تو چند گھروں کے فاصلے پر ہاجرہ مسرور رہتی تھی۔ کالج میں وقفے کے دوران ان سے ملنے چلی گئی۔ وہ سفید ساڑھی پہنے اور سگریٹ پیتی بڑی مسحور کن لگیں۔ انہوں نے بتایا کہ گھر سے باہر کئی لوگ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے متمنّی رہتے ہیں۔ اسی لیے وہ موٹر کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلتی۔ لیکن ہم گھر سے باہر نکلے تو وہاں سب سنسان پڑا تھا''۔

ہم مصنّفہ پر دروغ گوئی کا الزام نہیں لگاتے لیکن یہ کہانی عجیب ہے۔ ان کا بیان کردہ قصّہ کم از کم ۵۰؍سالہ پرانا ہے۔ اس دور میں ذرائع نشر واشاعت بڑے محدود تھے۔ ویسے تو آج کل بھی اتنے وسیع پروپیگنڈے اور بیکڑوں ٹی وی چینلوں کی موجودگی کے باوجود مصنّفین کی شکل سے عوام واقف نہیں۔ شاعر کسی حد تک مستثنیٰ ہیں کہ وہ ٹی وی پر اکثر اپنا کلام پڑھتے نظر آتے ہیں۔ جب کہ نثر نگاروں کو یہ سہولت حاصل نہیں۔ ویسے بھی جس طرح ججوں کے فیصلے بولتے ہیں، اسی طرح مصنّفین کی تحریریں بولتی ہیں، اور شاعروں کا کلام زندہ رہتا ہے۔ ہاجرہ مسرور ایک مصنّفہ تھیں فلمی ہیروئن نہیں کہ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے شائقین کا اژدحام ہوتا۔ کشور صاحبہ نے آخری سطر میں انہیں جھوٹا ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ کتاب میں جمیلہ ہاشمی کے میاں اور مشہور رائٹر ڈاکٹر عائشہ صدیقہ کے والد پیر صاحب کی بھی تضحیک کی گئی۔ وہ ان کی تحریر کے مطابق سردار احمد اویسی مرحوم ہیں۔ لکھتی ہیں''میں نے ایک مرتبہ کہا''میں آپ کو بھی بطور پیر کے آپ کے گاؤں میں دیکھنا چاہتی ہوں''۔ ہنسے، کہنے لگے''چلو''۔ ہم لوگ ان کے گھر خانقاہ شریف گئے۔ صبح ۸؍ سے ۱۲؍ بجے تک خانقاہ کے برآمدے میں موڑھا بچھا کر وہ بیٹھ جاتے۔ سامنے ایک چادر پھیلا دی جاتی۔ لوگ آتے، ہاتھ جوڑے، پلّو یا دھوتیوں سے مڑا تڑا نوٹ نکالتے، پھیلی چادر پر بڑی لجاجت سے رکھ دیتے اور عرض گزارتے۔ اویسی بھائی بھی دائیں اور بھی بائیں ہاتھ کی میز سے ایک پرچی اٹھا کر دیتے۔ وہ شخص دوزانو ہوئے پیچھے کی طرف ایسے جاتا کہ اس کی پیٹھ پیر صاحب کی طرف نہ ہوتی۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب اندر تشریف لاتے۔ لڑکے کو حکم ہوتا''لے آؤ''۔ تب میرے اور ان کے لیے ٹھنڈی ہوئی بیئر آ جاتی''۔ یہ پیر صاحب کی ''مدح سرائی'' کا عمدہ نمونہ ہے۔

کتاب میں شراب اور بیئر کا اس قدر تذکرہ ہے کہ لگتا ہے جو اس سے محروم ہیں، وہ دنیا جہاں کے سارے لطف و اکرام سے محروم ہو گئے۔ انھوں نے بے شمار ادیبوں اور شاعروں کا اس سے یوں تعلق طشت از بام کیا ہے کہ محسوس ہوتا ہے، یہ ایک کتاب نہیں قرطاس ابیض (وائٹ پیپر) ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ان میں سے ایک دو کے علاوہ سب اس جہان سے کوچ کر چکے۔ یہ کتاب ایک ''میڈیا ٹرائل'' نہیں تو ادبی مقدمہ ضرور ہے۔ کیا کشور ناہید پسند کریں گی کہ ان کے دنیا سے گزرنے کے بعد ان کی شراب نوشی کے قصّے کتابوں میں تحریر کیے جائیں۔ کیا موصوفہ کی آیندہ نسل ان کی شراب نوشی کی داستانیں سن کر فخریہ انداز میں سر اٹھا سکیں گی؟

فیض احمد فیض کی خانگی زندگی کا بھی ایک واقعہ بھی بیان ہوا ہے۔ وہ اگر غلط ہے تو اُسے بہتان کہا جائے گا۔ اگرچ ہے تو عبرتناک اور محبّت کی افسوسناک مثال..... تفو برتو اے چرخ دوراں..... یہ واقعہ کشور صاحبہ کے الفاظ میں یوں ہے:

فیض احمد فیض کی جس بیٹی نے باپ سے گھر میں رہنے کا کرایہ مانگا تھا، کشور نے اُس کا نام دینے سے گریز کیا ہے

''سید سبط حسن بہت افسوس کے ساتھ سناتے تھے کہ کس طرح فیض صاحب سے ان کی بیٹی نے اس گھر کا کرایہ مانگا، جس میں وہ رہتے تھے۔ وہ نوٹس اس بیٹی کے نام پر خریدی گئی تھی۔ جب سید صاحب نے ڈاٹ کرخط لکھا اور کہا کہ تم مجھے بیوپاری لگ رہی ہو تو اس نے کہا تھا''ہاں میں ہوں بیوپاری، آخر گھر میرے نام ہے، مجھے کرایہ چاہیے''۔ سید صاحب بڑے افسوس کے ساتھ کہتے ''شکر ہے کہ میرا گھر ہر چند بیٹی کے نام ہے، مگر میں نے خود بنایا ہے''۔ میں تڑپ کر کہتی، فیض صاحب نے بھی خود ہی گھر بنایا تھا۔ خود کرسی پہ بیٹھ کر پھلوں کے پودے لگواتے جاتے اور سگریٹ پیتے جاتے تھے''۔ مصنّفہ کی جرأتِ رندانہ تو دیکھیے کہ فیض صاحب کی ۴؍بیٹیوں میں جس نے یہ ایمان افروز کارنامہ انجام دیا، اس کا نام دینے سے گریز کیا ہے۔ یوں قارئین کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ جس سے چاہے، اسے منسوب کر لے۔

اس کتاب کا البتہ ایک پہلو قابل تعریف ہے کہ نصرت بھٹو کی مظلومیت کا ذکر کر کے انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ کشور صاحبہ لکھتی ہیں''۱۹۷۵ء کا ذکر ہے کہ نصرت بھٹو صاحبہ کی ایک تقریر کے دوران ان سے کہا گیا ''آپ تو تقریر پڑھ رہی ہیں، دل سے بولیں۔'' تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر ریٹائرنگ روم میں آ گئیں۔ ایک سگریٹ سلگایا اور کافی پیتے ہوئے کہنے لگیں''ظلم برداشت کرنے والی عورت بس ایسے ہی بول سکتی ہے، جیسے میں بول رہی ہوں''۔

یہ ۱۹۷۵ء کا ذکر ہے۔ اس وقت بھٹو صاحب کی حکومت تھی اور ان کی حکومت کو کوئی چیلنج درپیش نہ تھا۔ یہ جاننے کے لئے کسی غیر معمولی ذہانت کی ضرورت نہیں کہ اس ظلم کا محرک کون تھا۔ خود کشور ناہید اطلاع دیتی ہیں ''بیگم بھٹو کی تو میں وہ حالت نہیں بھول سکتی، جب کہا جا رہا تھا اور بیگم بھٹو کو یقین تھا کہ بھٹو صاحب نے ایک خاتون سے شادی کر لی۔ بیگم بھٹو نے کچھ ایسی قاتل چیز غصے اور غم کے عالم میں کھالی کہ وہ کئی دن ہسپتال میں رہی تھیں''۔

ایک اور پہلو بھی دیکھتے چلیے''اس خاتون نے چاہے وہ وزیر کی بیوی تھیں یا پھر وزیر اعظم کی بیوی، دوسری خواتین گھر میں آتے جاتے دیکھا اور خاموش رہیں۔ خدا کو شاید ان کے صبر کا امتحان لینا تھا۔ شاہنواز کی موت کی خبر ہم سب عورتوں نے نیروبی کانفرنس سے واپسی پر ہوائی اڈے پر ہی سن لی تھی۔ کتنا صبر کیا اس عورت نے! پھر ایک المناک امتحان مرتضیٰ کی ہلاکت کی شکل میں نمودار ہوا۔ اللہ میاں اُن کی زندگی ہی میں کھال کھینچے چلا جا رہا تھا۔ اذیت ان کے اندر ابھی تک کچوکے لگا رہی ہے۔

یہ کتاب ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے ۲۷؍دسمبر ۲۰۰۷ء کو ایک اور سانحہ نصرت بھٹو کی بیٹی، پنکی (بینظیر بھٹو) کی زندگی کی شمع گل کر گیا۔ پھر ۴؍برسوں بعد نصرت بھٹو کی زندگی کا چراغ بھی بجھ گیا۔

مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد جس طرح بے نظیر، نصرت بھٹو کو جبراً ساتھ لے گئیں، اُس واقعے کا تذکرہ نہیں ہے۔ بعد کے سال تو بے چاری اپنے یادداشت سے ہی محروم ہو گئیں۔ خاکہ لکھا جائے تو پھر مکمل احاطہ کرنا چاہیے۔

کشور ناہید ناراض نہ ہو تو اتنی گزارش ضرور ہے کہ مشہور ہونے والے لکھاریوں کو اپنی کتابیں شائع ہونے سے پہلے دو چار پڑھے لکھے لوگوں کو ضرور دکھا لینی چاہیے۔ ایسی غلطیوں سے بچنے کا یہ آسان اور کم خرچ طریقہ ہوتا ہے۔

جوہر قابل

ہم کسی سے کم نہیں

تحریم سنا صدیقی

ہم اِن دنوں بڑی مشکل میں ہیں۔ عالمی اداروں کی دھمکیوں سے لے کر اپنے پیاروں کی تنقید اور ناخوشی سے بھرے جملے سنتے ہیں۔ اس ملک میں کیا ہے۔ اس نے ہمیں کیا دیا؟ یہ جملہ کہتے ہوئے ایک لمحے کو نہیں سوچتے کہ نعمتیں قدر دانوں کو ملتی ہیں اور ناقدری کرنے والوں سے واپس لے لی جاتی ہیں۔

انسانوں کا ملک ہے۔ چار برائیاں ہیں تو ۱۰ اچھائیاں کیوں نظر نہیں آتیں..... یہ وطن ہمارا ہے، اسے اچھا بُرا بنانے کی ذمے داری بھی نہیں ہی لینی چاہیے۔

تحریم نے اس مضمون میں اپنے طور پر کچھ باتیں اور دلائل جمع کیے ہیں کہ ہم کسی سے کم نہیں۔ ممکن ہے کہ آپ اس سے اچھے دلائل دے سکیں، لکھ سکیں۔ ذرا سوچ کر تو دیکھیں۔

نئی فصیحُ اللّسان۔ آسیہ

آیئے! اب آپ کی ملاقات نئی فصیح اللّسان آسیہ سے کراتے ہیں۔ آسیہ عارف ایک ۶ رسالہ پاکستانی بچّی ہے۔ جس کی پیدائش تو قطر کے دارالحکومت دوحہ میں ہوئی لیکن وہ ساڑھے تین سال کی عمر میں واپس پاکستان لوٹ آئی۔ آسیہ کی شہرت کی کہانی اس وقت شروع ہوئی جب ۳ رسال کی عمر میں وہ قطر ٹی وی کے عربی چینل پر آئی اور فصیح عربی زبان میں اپنی ننّھی مُنّی باتوں سے عرب ناظرین کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا۔ پھر قطر کے بیشتر اخبارات کے علاوہ ایران، عراق، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور مصر میں بھی آسیہ پر رپورٹس شائع ہوئیں۔ بہترین اُردو اور معمولی انگریزی جاننے والی یہ بچّی فصیح عربی زبان بولنے کی وجہ سے عرب دنیا میں بڑی تیزی سے ایک نمایاں مقام حاصل کر رہی ہے۔

آسیہ پاکستان، قطر اور سعودی عرب کے کئی بڑے علما سے ملاقاتیں کر کے فصیح عربی زبان میں اپنی شاندار کارکردگی کی وجہ سے داد حاصل کر چکی ہے۔ آسیہ عارف عربی، انگریزی اور اُردو کے معروف پاکستانی مصنّف عارف صدیق کی اکلوتی صاحبزادی ہے۔ عارف صدیق دوحہ کے ایک بڑے تعلیمی ادارے میں شعبۂ عربی کے سربراہ کے طور پر ۱۳ برس تک کام کرنے کے علاوہ جارج ٹاؤن امریکن یونیورسٹی کے سکول آف فارن سروس، قطر جیسے نمایاں اداروں میں بھی تدریسی فرائض انجام دے چکے ہیں۔

آسیہ عارف نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ تھوڑی سی محنت، تھوڑی سی توجہ سے اس ذہین قوم کے بچے اقوامِ عالم میں اپنا لوہا منوا لیتے ہیں۔ یقیناً پاکستانی بچے دنیا کے بچوں سے کسی لحاظ سے بھی کم نہیں ہیں۔

دُنیا کا سب سے بڑا گلیشیئر

دُنیا کا سب سے بڑا گلیشیئر پاکستان میں ہے۔ اس کے شمالی علاقے کو بے شک دنیا کا سیکین ترین خطہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ کو پہاڑی علاقے میں گھومنے کا شوق ہے تو نیپال میں واقع مشہور زمانہ کوہ ہمالیہ کو بھول جائیں جو حُسن آپ کو پاکستان کے ایک گلیشیئر میں ملے گا وہ کہیں نہیں ہے۔ پاکستان کے انتہائی شمال مغربی علاقے میں واقع کرنگی گلیشیئر دنیا کا سب سے بڑا گلیشیئر مانا جاتا ہے۔

پاکستان میں واقع ہنزہ ویلی نے اپنے حسن کی وجہ سے وہاں لوگوں کو آنے پر مجبور کیا ہے لیکن یہ علاقہ دنیا کے لیے صرف اس وقت کھلا جب شاہراہِ قراقرم ۱۹۸۶ء میں کھلی۔ اس لیے یہاں ایک ایسی زبان بولی جاتی ہے جس کا حوالہ دنیا میں کہیں اور نہیں ملتا۔ اس زبان کا نام ہے ''بروساشکی۔''

''نانگا پربت'' دیکھنے والا نظارہ ہے۔ دور تک پھیلی ہوئی پہاڑیاں۔ نانگا پربت سادّھ فیس ''پوپل'' کے نام سے جانا جاتا ہے اور یہ دنیا کی سب سے اونچی پہاڑی ہے۔ یہ زمین سے ۴ ہزار ۱۰۰ فٹ اونچائی پر ہے۔ اگر نانگا پربت کی کل اونچائی زمین کے اوپر اور نیچے سے ملا کر ناپی جائے یعنی دریائے سندھ سے تو نانگا پربت کوئی ۷ ہزار فٹ اونچا ہے۔

گرینڈ ٹرانکو دنیا کی سب سے بڑی Cliff ہے جس کی چوٹی کی اونچائی ۱۳۴۰ میٹر ہے۔ یہ بھی پاکستان میں واقع ہے۔

دنیا کا سب سے عجیب و غریب قبیلہ بھی پاکستان میں موجود ہے۔ کیلاسا (Kalasa) نامی یہ قبیلہ پاکستان کے ایسے جنگلوں میں رہتا ہے جہاں کسی کا بھی باہر سے اندر جانا ممکن نہیں۔ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے، اس کے باوجود بھی اس قبیلے میں ایک ایسے مذہب کو مانا جاتا ہے جو اسلام کے ظہور سے پہلے کا ہے اور ان لوگوں کے طور طریقے بہت زیادہ پرانے یورپی طور طریقوں، رسم و رواج سے ملتے جلتے ہیں۔ موجودہ دور سے بچھڑے قبیلوں میں ''کیلاسا'' دنیا کا سب سے عجیب اور حیرت انگیز قبیلہ ہے۔

دُنیا کی سب سے بڑی مسجد یعنی فیصل مسجد بھی پاکستان میں ہے۔ ۱۹۷۶ء میں مکمل ہونے والی یہ مسجد اتنی بڑی ہے کہ اس میں اسلام آباد کے تمام لوگ ایک ساتھ باجماعت نماز پڑھنا چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں۔

پاکستان میں واقع شمال مغربی علاقے چترال کو رقبے میں کم ہونے کے باوجود یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہاں بیک وقت ۱۳ رزبانیں بولی جاتی ہیں۔ رقبے اور زبان کے حساب سے اگر دیکھا جائے تو یہ دنیا کا سب سے ملٹی کلچرل خطہ ہے۔

پاکستان میں دُنیا کے سب سے زیادہ مہاجر آباد ہیں۔ ۱۹۷۹ء سے شروع ہونے والے اس سلسلے کے بعد تقریباً ایک کروڑ مہاجر پاکستان آچکے جو کہ اپنی طرز کا عالمی ریکارڈ ہے۔

دنیا کی سب سے اونچی سڑک جو ۲ رملکوں کی سرحدوں کے بیچ واقع ہے، وہ پاکستان اور چین کے درمیان ہے۔ قراقرم روڈ پر واقع سب سے اونچا پوائنٹ خنجراب پاس ہے۔ اتنی اونچی پکی سڑک ۲ رملکوں کے درمیان دُنیا میں کہیں بھی نہیں پائی جاتی۔

پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جو ایک مذہب کے بہتر عملی نفاذ کے لیے وجود میں آیا تھا۔ ہم نے مذہبی قوانین کو عملی شکل دینے کے لیے ایک نیا ملک بنایا تھا۔ اس کی مثال انسانی تاریخ میں کوئی اور نہیں ملتی۔

ہم محنتی، باصلاحیت، ذہین لوگوں کی قوم ہیں۔ ایک پاکستانی ملک سے باہر آتا ہے۔ بغیر کسی کی مدد کے گھر، گاڑی، بینک بیلنس سب بنا لیتا ہے۔ ایسی ایک نہیں کئی

مثالیں ملتی ہیں۔

اگلی بار جب کبھی آپ اپنے دوستوں، رشتے داروں کے ساتھ بیٹھیں اور پھر کوئی آپ کو یہ گنوانے لگے کہ کیا نہیں ہے پاکستان میں، آپ یقیناً انھیں جواب میں یہ بتا سکتے ہیں کہ پاکستان کے پاس وہ کچھ ہے جو دنیا میں کسی اور کے پاس نہیں۔ کئی ایسی چیزیں ہیں جو ہمیں عام سے دوسروں سے خاص بناتی ہیں۔

یہ وجاہت علی عباسی کی تحریر تھی۔ اب نصرت مرزا آپ کو بتائیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر کس قدر مہربان ہے۔ آج تمام دنیا بشمول اسرائیل، امریکا و یورپ کساد بازاری کا شکار ہیں لیکن تمام مشکلات اور کمزوریوں کے باوجود پاکستان میں کساد بازاری نہیں ہے۔

اس کی ایک وجہ تو چھپی ہوئی زیرِ زمین معیشت بتائی جاتی ہے۔ دوسرے پاکستان کا قومی بچت کا ادارہ پاکستان کی معیشت کو سنبھالا دے رہا ہے جس سے دو فائدے ہو رہے ہیں۔ ایک پاکستان کے سفید پوش اور عمر رسیدہ لوگوں کو اس قومی بچت سکیم سے مالی فائدہ ہو رہا تو دوسرے وہ حکومت کو قرض دے کر معیشت کو سنبھال رہا ہے۔ ورنہ نوٹ چھاپے جاتے تو مہنگائی کا ناقابلِ برداشت طوفان اٹھ کھڑا ہوتا اور ہنگامہ آرائی اس درجے پر چلی جاتی کہ جسے سنبھالنا مشکل ہوجاتا۔ اس وقت پاکستان کی قومی سرمایہ کاری ۲/ ہزار ارب تک پہنچ گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں یورپ میں واقع یونان کا ملک کساد بازاری کے تھپیڑے برداشت نہ کرسکا۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آج جبکہ ترکی، یونان، اسپین، لکسمبرگ، اٹلی اور دیگر یورپی ممالک کساد بازاری کے عفریت کا سامنا کر رہے ہیں، ہم سرمایہ کاری کے نئے نئے منصوبوں کے بارے میں غور کر رہے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے درست ہی کہا ہے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

پاکستان کا افتخار۔ علیم ڈار

قوم کے اس پست کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے کم ہے۔ صرف ایک شخص نے تن تنہا اپنے احساسِ ذمے داری اور ایمانداری سے دنیا بھر کے لوگوں کا اعتماد جیت کر ثابت کیا ہے کہ خلوصِ نیت سے کی گئی کوششیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔ مسائل میں گھری قوم کے سامنے اپنے روشن دیے جلانے کی جتنی ضرورت اب ہے شاید کبھی نہ تھی۔

علیم ڈار نے مسلسل تیسری بار سال کے بہترین امپائر کا آئی سی سی ایوارڈ حاصل کرکے پاکستان کا پرچم بلند رکھا۔ سٹیوڈیوس، ای این گولڈ اور ۵ بار یہ اعزاز اپنے نام کرنے والے سائمن ٹوفل بھی ڈیوڈ شیفرڈ ٹرافی کے امیدواروں میں شامل تھے مگر ون ڈے اور ٹوئنٹی ۲۰ میں ۱۰۰ جنگ ٹیسٹ میں ۹۸ فیصد درست فیصلوں کا تناسب رکھنے والے پاکستانی نے کسی کو بھی اپنی مسند پہ قبضہ جمانے کا موقع نہیں دیا۔ آئی سی سی کی ۱۰/ فل ممبر ٹیموں کے کپتانوں، ۱۸ ایٹ پینل میچ ریفریز کے ووٹ حاصل کرکے ایوارڈ کی ہیٹ ٹرک کرنے میں کامیاب رہے۔

۴۳/ سالہ علیم ڈار نے ۱۳/ اگست ۲۰۱۰ء سے ۳/ اگست ۲۰۱۱ء تک کے عرصے میں ورلڈ کپ فائنل سمیت ۱۳/ ون ڈے اور ۵/ ٹیسٹ میچز میں امپائرنگ کرتے ہوئے کئی بار اپنے فیصلوں سے ٹیکنالوجی کو مات دے دی۔ ان کا کوئی فیصلہ اگر کسی ٹیم نے چیلنج کیا بھی تو امپائر کی کھائی پڑی۔ مضبوط اعصاب اور انسانی آنکھ کی مدد سے درست نتیجے تک پہنچنے کی اس صلاحیت نے دنیا بھر کے کروڑوں شائقین کو حیران کرتے ہوئے علیم ڈار کی عزت و احترام میں اضافہ کیا۔

مڈل آرڈر بیٹسمین اور لیگ سپنر کے طور پر ایک دہائی تک فرسٹ کلاس کیریئر کے بعد سابق منیجر پاکستان کرکٹ ٹیم اظہر زیدی کے مشورے سے امپائرنگ کی طرف آنے والے علیم ڈار نے ۲۰۰۲ء میں پہلا ون ڈے سپروائز کیا تو ان کی عمر ۳۴/ سال تھی۔ ۲/ برس میں ہی وہ آئی سی سی پینل میں شامل کر لیے گئے۔ ۲۰۰۳ء میں پہلی بار ورلڈ کپ میں ذمے داریوں سے انصاف کیا۔ اکتوبر میں انھیں بنگلہ دیش اور سری لنکا کے مابین سیریز میں پہلی بار ٹیسٹ امپائرنگ کا موقع ملا۔ سخت دباؤ میں کیے گئے فیصلوں نے ان کی قدر میں اضافہ کیا۔ ۶/ ماہ بعد ہی وہ آئی سی سی ایلیٹ پینل کا حصہ بن چکے تھے۔ سائمن ٹوفل اور علیم ڈار دیگر سینئر امپائرز کی نسبت کم عمر ہونے کے باوجود زیادہ پُراعتماد اور قابلِ اعتبار ثابت ہوئے۔

اکتوبر میں ون ڈے میچ کے دوران علیم ڈار نے انگلش بولر اینڈرو فلنٹوف کی گیند پر میٹ پرائر کے کیچ کو درست اور نٹڈ ولکر کو آؤٹ قرار دیا لیکن بعد ازاں احساس ہوا کہ بیٹ گیند کے بجائے پیڈ سے ٹکرایا تھا۔ انھوں نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور نٹڈ ولکر سے معذرت بھی کی، ایسا کرنے کا حوصلہ بھی بہت کم امپائر رکھتے ہیں۔

علیم گو مگر اپنے کام پر بھرپور توجہ مرکوز رکھنے والے امپائر نے ناخوشگوار لمحات کو ذہن پر سوار کرنے کے بجائے ہمیشہ پوری دیانت داری سے فرائض انجام دیے ہیں۔ جس کے صلے میں انھیں کپتانوں، کھلاڑیوں اور شائقین کی طرف سے ملنے والی عزت اور احترام ہے۔ علیم ڈار کو اپنی ذمے داریوں کا احساس بھی ہے۔ کھلاڑیوں اور تماشائیوں کے جذبات کی قدر بھی۔ ان کا کہنا ہے کہ جدید دور میں امپائرنگ آسان کام نہیں ہے۔ ٹیکنالوجی مختلف زاویوں سے لیے گئے ری پلیز کے ذریعے آپ کے ایک ایک فیصلے پر نظر رکھتی ہے۔

سپیشل اولمپکس گیمز میں پاکستان کا نام روشن کرنے والی طالبہ

پاکستان کی ہونہار طالبہ فجر ظہیر نے ایتھنز سپیشل اولمپکس گیمز میں ایک کلومیٹر سائیکل ریس میں چاندی کا تمغا حاصل کیا ہے۔ ایتھنز سپیشل اولمپکس گیمز میں ۱۸۵/ ممالک کے ۵۰۰/ خصوصی بچوں نے شرکت کی تھی۔ فجر ظہیر اس سے قبل ۲۰۱۰ء میں پنجاب سپیشل اولمپکس اور نیشنل گیمز میں بھی طلائی تمغا حاصل کرچکی ہیں۔ فجر ظہیر کا کہنا ہے کہ ان کے ادارے کی ڈائریکٹر مس طیبہ نے ان کی سائیکل ریس میں تیاری سے اولمپکس گیمز تک ہر موقع پر راہنمائی کی۔ جس سے وہ قومی اور عالمی سطح پر تمغے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں۔

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ میں فیلڈ میں غیر جذباتی انداز اختیار کرتے ہوئے اطمینان کے ساتھ صرف اور صرف اپنے کام پر نظر رکھتا ہوں۔ کسی ٹیم یا کھلاڑیوں کی جو بھی پوزیشن ہو، میری پیچ کی صورتِ حال سے زیادہ ہر گیند پر نظر ہوتی ہے جو پھینکی یا کھیلی جا رہی ہے۔ امپائر کو پیچ کا نتیجہ نہیں بلکہ اوور کی ہر گیند دیکھنا ہوتی ہے۔

۴؍کروڑ روپے سالانہ تنخواہ لینے والا پاکستانی لڑکا

آئیے! اب آپ کی ملاقات عمار افضل سے کراتے ہیں۔ عمار افضل نے آئی ٹی کے شعبے میں اپنی کامیابی کے جھنڈے ۲۰۰۹ء میں گاڑ کر ملک سے باہر اپنے ملک کی عزت وعظمت کا اہتمام کیا۔

اپریل ۲۰۰۹ء میں ایک امریکی بینک کی اے ٹی ایم مشین کے نیٹ ورک میں خرابی پیدا ہوگئی۔ اس بینک کا صدر دفتر امریکا میں، جب کہ برانچیں ۳۰؍ممالک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ خرابی کے باعث سیکڑوں برانچوں کو کروڑوں ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا۔ امریکا کے بڑے بڑے تکنیکی ماہرین سرِ لڑاتے رہے لیکن مسئلہ حل نہیں ہوا۔ بینک نے امریکا کے علاوہ برطانیہ کی آئی ٹی ٹیکنالوجی کی متعدد یونیورسٹیوں اور اداروں سے رابطہ کیا مگر مسئلہ کسی بھی ماہر اور پروفیسر کی سمجھ میں نہیں آیا۔

اس دوران مانچسٹر کی ایک یونیورسٹی کے چانسلر کو خیال سوجھا۔ اس نے اپنے اسسٹنٹ کو پاکستان کے شہر اوکاڑہ میں ایک نمبر پر کال ملانے کو کہا۔ فون پر دوسری طرف اوکاڑہ کی سبزی منڈی کے آڑھتی محمد افضل کا ۱۵؍سالہ بیٹا تھا۔ چانسلر نے لڑکے کو مسئلہ بتایا۔ لڑکے نے غور سے مسئلہ سنا، چانسلر سے سافٹ ویئر کا کوڈ طلب کیا اور چند منٹوں میں ٹھیک کر کے واپس بھجوا دیا۔ برطانوی چانسلر نے فوری طور پر امریکی بینک کو آگاہ کر دیا جس نے اس کامیابی پر لڑکے کے لیے ۲۵؍ہزار ڈالر نقد انعام کا اعلان کیا۔ سبزی فروش کے اس لڑکے محمد عمار افضل نے اپریل ۲۰۰۹ء کی ۲۲؍تاریخ کو کمپیوٹر کے مشکل ترین امتحان اوریکل نائن آئی میں سب سے زیادہ نمبر لے کر ورلڈ ریکارڈ قائم کیا اور اس کے صرف ۴؍روز بعد امریکی بینک ایل لائیڈ کی تاریخ کا سب سے بڑا مسئلہ بھی حل کر دیا۔

عمار افضل اوکاڑہ میں پیدا ہوا، اس کے والد محمد افضل سبزی منڈی اوکاڑہ میں ایک آڑھتی جبکہ دادا چودھری اشرف انجمن آڑھتیاں اوکاڑہ کے صدر ہیں۔ ۲؍مئی ۲۰۰۹ء تک عمار اوکاڑہ کا رہائشی اور مقامی سکول میں نہم جماعت میں پڑھتا تھا مگر ۴؍مئی کے بعد وہ برطانیہ کا رہائشی اور دنیا کی مہنگی ترین یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہے۔ وہ اوکاڑہ سے مانچسٹر کیسے پہنچا، اس کے لیے ہمیں ۲؍سال پیچھے جانا ہوگا۔ ۲؍سال قبل کسی نے اسے بتایا کہ تعلیمی ادارہ برین فیچ دنیا بھر میں آن لائن کمپیوٹر کورسز کرواتا ہے۔ کمپیوٹر اور ویب کیمروں کی مدد سے سبق پڑھے جا سکتے اور امتحان بھی دیا جا سکتا ہے۔ عمار نے اپنے والد سے داخلے کی

خواہش ظاہر کی۔ والد محمد افضل نے رضامندی کا اظہار کیا۔

عمار نے کمپیوٹر کے مشکل ترین کورس اوریکل (Oracle) کا انتخاب کیا۔ عمار صبح سکول جاتا، دوپہر کو گھر آ کر ۴؍گھنٹے سوتا اور شام کو گھر کے کمپیوٹر روم میں چلا جاتا۔ ٹھیک ۶؍بجے اُس کی کلاس شروع ہو جاتی۔ وہ صبح ۶؍بجے تک سبق سنتا اور ساری رات جاگنے کے باوجود صبح ۸؍بجے سکول پہنچ جاتا۔ یہ سلسلہ کوئی ۷؍ماہ جاری رہا۔ ایک روز عمار نے اپنے والد کو بتایا کہ اس کا پروفیسر زیادہ وقت طالبات کے ساتھ گپ شپ میں ضائع کر دیتا ہے، اِس وجہ سے اس کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔ عمار نے باپ کو بتایا کہ اس نے ایک بڑی دلچسپ ترکیب سوچی ہے۔

اس نے اپنے کمپیوٹر میں ایک سافٹ ویئر انسٹال کیا ہے جس کے ذریعے مرد کی آواز عورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ عمار نے اپنا نام بدل کر اسی پروفیسر سے کلاسیں لینا شروع کر دیں۔ اب پروفیسر عمار کو لڑکی سمجھ کر پڑھانے لگا۔ پروفیسر نے نوٹ کیا کہ اس کا یہ طالب علم غیر معمولی طور پر ذہین ہے۔ اسے شک گزرا تو اس نے عمار کا ایڈمیشن ریکارڈ نکلوایا۔ فارم پر عمار کی مردانہ تصویر دیکھ کر غصے میں اسے چیلنج کیا کہ تمھارے پاس ۴؍دن ہیں۔ تم بقایا ۴؍ٹیسٹوں کی تیاری خود کرو اور مجھے پاس ہو کر دکھاؤ۔ عمار نے کہا کہ آپ مجھے نوٹس دیں، میں آج ہی ٹیسٹ دوں گا اور ٹاپ کر کے دکھاؤں گا۔ پروفیسر نے چیلنج کیا کہ ٹاپ کرنا تو درکنار، اگر تم اس امتحان میں پاس بھی ہو گئے تب بھی میں اپنی نوکری سے استعفا دے دوں گا۔ عمار نے چیلنج قبول کر لیا۔ پروفیسر نے اسے نوٹس دے دیے۔ عمار نے ایک گھنٹے میں تیاری مکمل کر لی۔ امتحان شروع ہو گیا۔ ایک پرچہ ۱۵۵؍سوالات پر مشتمل تھا۔ اس کا امتحان مانچسٹر میں موجود ایک کمپیوٹر لے رہا تھا۔ عمار نے ۱۵؍میں سے چار اعشاریہ ناوے نمبر حاصل کیے تھے۔ یوں عمار ورلڈ ریکارڈ ہولڈر بن گیا۔ پروفیسر نے اپنے وعدے کے مطابق استعفا دے دیا اور عمار سے اپنے رویے کی معافی مانگی۔ عمار نے کھلے دل کا مظاہرہ کیا اور کہا کہ آپ قابلِ احترام ہیں اور میں آج جو کچھ بھی ہوں، آپ ہی کی وجہ سے ہوں۔

ایک برطانوی کمپنی نے عمار کو ۲۵؍لاکھ روپے ماہانہ ملازمت کی پیشکش کی جو عمار نے قبول کر لی جبکہ برطانوی یونیورسٹی نے اس کی سالانہ ۹۰؍ہزار ڈالر فیس معاف کر دی۔ عمار نے ۲۲؍اپریل کو اوریکل نائن آئی کا امتحان پاس کیا تھا، وہ ۲؍مئی کی پرواز سے والدین سمیت برطانیہ پہنچ گیا۔

عمار نے ثابت کر دیا کہ ہم دنیا میں کسی سے کم ذہین نہیں ہیں۔ ایک پاکستانی سپوت نے اپنی قابلیت اور صلاحیت سب سے منوایا۔ ۱۵؍سالہ پاکستانی بچہ سالانہ ۴؍کروڑ تنخواہ، مفت گھر، مفت تعلیم اور دیگر سہولیات کا مالک بن گیا ہے۔ عمار جیسے کئی بچے گلی کوچوں میں پھر رہے ہیں کاش کوئی ان کی تعلیم وتربیت کا بندوبست کرنے والا ہو۔

پھولوں سے بنے نقش ونگار

گزشتہ دنوں امریکی شہر بوسٹن میں WAFA ورلڈ ایسوسی ایشن آف فلاور رائٹرز نے بچوں کی ۴؍کیٹگریز بنا کر ان کے درمیان پھولوں سے خوبصورت اور دیدہ زیب اشیا بنانے کا مقابلہ کروایا۔ ۲۰۱۱ء کے مقابلے کا موضوع CRITTER تھا۔ اس میں ۶؍سے ۱۲؍سال تک کے بچوں کو خشک پھولوں، پتوں، جھاڑیوں اور ٹہنیوں سے آرٹ ورک بنا کر بھیجنے کا کام دیا گیا۔ پاکستان سے تیسری اور چوتھی کلاس کے ۴؍بچوں میکائل نذیر، شاہ میر دلشاد، رافع علی خاں اور مہریار نذیر نے شرکت کی۔ ان بچوں کے بنائے گئے آرٹ ورک کو مقابلے کی جیوری نے بہت پسند کیا۔ میکائل نذیر اور شاہ میر دلشاد کے ''لابسٹر'' اور ''کیکڑے'' کے نمونوں کو طلائی تمغا دیا گیا۔ رافع علی خاں کے ''چوزے'' اور مہریار نذیر کے ''نیڈی بیئرز'' کو چاندی کے تمغے کے لیے منتخب کیا گیا۔

مستقل کالم

مشورہ حاضر ہے

اُردو ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
آپ بھی ان مشوروں کا حصہ بن سکتے ہیں،
چھوٹے چھوٹے مسئلوں کے چھوٹے چھوٹے حل
اکثر زندگی آسان کر دیتے ہیں

صغیرہ بانو شیریں

شہد

مسز کرنل فاروق میانوالی سے پوچھتی ہیں، آنکھوں میں شہد لگانے سے نقصان تو نہیں ہوتا، اس بارے میں ضرور لکھیے اور سرسوں کا تیل پاؤں کے انگوٹھے پر لگایا جائے تو کیا فائدہ ہے۔ بہت دن سے آپ نے کوئی مضمون صحت کے حوالے سے نہیں لکھا۔ آپ کے مشورے بہت پسند ہیں اور سارے رسالے سنبھال کر رکھے ہیں۔ سب کو بتاتی ہوں، فائدہ ہوتا ہے۔

شہد مکمل غذا ہے جس میں شفا ہے۔ اعتماد سے استعمال کریں تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ شہد لگانے سے آنکھیں صاف رہتی ہیں۔ رات کو شہد آنکھ میں لگانے سے بصارت تیز ہوتی ہے۔ شروع میں شہد بہت لگتا ہے اور چند لوگوں کو موافق بھی نہیں آتا۔ سرسوں کا تیل بزرگ حضرات پاؤں کے انگوٹھے پر لگاتے تھے، یہ بھی ٹوٹکا ہے۔ اس کے لگانے سے نقصان نہیں۔ ناف کے اندر سرسوں کے تیل میں تھوڑی سی روئی بھگو کر رکھنے سے ہونٹ نرم رہتے ہیں۔ وقت ملا تو سرسوں پہ مفصل لکھوں گی۔ رسالہ پسند کرنے کا شکریہ۔

الرجی

۶ سال سے میری بیوی کو الرجی ہے۔ پاؤں سے دھبے لال رنگ کے شروع ہوتے ہیں جو بڑھتے بڑھتے ٹانگوں اور بازو تک آجاتے ہیں۔ چلنے پھرنے سے سوجن ہوتی ہے۔ سیدھا لیٹنے سے آرام ہوتا ہے۔ صبح تک دھبے ٹھیک ہوجاتے ہیں۔ ڈاکٹر الرجی کہتے ہیں۔ ٹیسٹ بھی کرائے۔ کیا آپ مجھے نیم کے بارے میں بتا سکتی ہیں اور اس کے کیا فائدے ہیں؟ آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

(محمد یعقوب بابی)

محترم! آپ نے خط میں جگہ کا نام نہیں دیا، ورنہ میں وہیں کسی ڈاکٹر حکیم کا پتا دے دیتی۔ الرجی کی بے شمار وجوہ ہیں۔ کچھ لوگوں کو کسی بھی چیز سے الرجی ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو حساسیت کا شکار ہوں، وہ زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اب جیسے اسلام آباد میں پولن الرجی کا بہت زور ہے۔ میری ایک عزیزہ نے اسلام آباد رہنا ہی چھوڑ دیا۔ بغیر دوا کے بالکل ٹھیک ہیں۔ پودوں، دوائیوں، جانوروں، گرد وغبار، موسم وغیرہ سے الرجی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح غذاؤں سے بھی ہوتی ہے۔ کوئی دودھ سے، کوئی انڈے، مچھلی، گندم، ٹماٹر، مونگ پھلی، چاکلیٹ، گوشت سے الرجک ہے۔

گائے کا گوشت کھانے سے ہونٹ سوج جاتے ہیں۔ سر درد، ڈپریشن، مایوسی، ایگزیمیا، آنکھوں اور منہ کا سوج جانا ہے، دمہ، سانس کی تکلیف وغیرہ شامل ہے۔ ہمارے ایک ملنے والے بھی غلطی سے گائے کا گوشت کھالیں تو گلا سوج جاتا ہے۔ دو تین دن بعد دوا سے آرام آتا ہے۔ اسی طرح بالوں کو رنگنے سے بھی الرجی ہوتی ہے۔ منہ اور آنکھیں سوج جاتی ہیں۔ یہ لوگ بالوں کو رنگ نہیں سکتے۔ مہندی (ہندی) تک سے الرجی ہو جاتی ہے۔

اب تو نیا زمانہ ہے، ٹیسٹ ہیں، دوائیاں ہیں۔ پہلے زمانے میں نیم کی افادیت تھی۔ نیم کی مسواک کی جاتی۔ دانت مضبوط رہتے۔ نم کی نمبولیاں بچوں کو زبردستی روزانہ کھلائی جاتی، کوئی دانہ نہیں نکلتا تھا۔ نیم کا گھی بنا کر چوری میں کھلوایا جاتا۔ پھوڑے پھنسیاں، جلدی امراض نہیں ہوتے تھے۔ آپ کی بیگم کا مرض پرانا ہے، آپ انھیں ہمدرد مطب میں لے جا کر دکھائیے اور دوا استعمال کرائیے۔ مصفّی خون دوا کھانے سے مسئلہ ٹھیک ہو جائے گا۔

قدرتی طریقۂ علاج

آپ کے مضامین صحت کے حوالے سے پسند آتے ہیں۔ اسی طرح حکیم سلیمانی صاحب کے نسخے بھی مفید ہیں۔ اگر وہ اپنے مضامین میں جڑی بوٹیوں کے اندر اُن کیمیکلز کا حوالہ دے دیں کہ کون سا جز زیادہ مفید ہے تو بہت اچھا ہوگا۔ قدرتی طریقۂ علاج پر بہت تحقیق ہو رہی ہے۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے ماہرین بھی اینٹی کانسٹس (قدرتی پودا) کی سفارش کرتے ہیں۔ اب جیسے اجوائن سے پیٹ کا مسئلہ خصوصاً ہوا کا خارج ہونا حل ہوتا ہے۔ اس کی خصوصیت کس بنا پر ہے۔ اسی طرح لڑکیوں کا مٹاپا عموماً ماہانہ نظام کی خرابی سے ہوتا ہے۔ اس کا باقاعدہ علاج ہونا چاہیے۔

(ذکیہ خلیل احمد۔ انگلینڈ)

انگلینڈ سے ذکیہ بہن کا خط ہے۔ رسالہ پسند کرنے کا شکریہ۔ قدرتی نباتات اور جڑی بوٹیوں کی مدد سے آج بھی مدد لی جاتی ہے۔ فطری علاج، غذائیت کے بارے میں گھریلو خواتین علم رکھتی اور گھریلو علاج سے فائدہ پاتی تھیں۔ پہلے پان کھانے کا رواج تھا۔ پاندان میں لونگ، الائچی، سونف، ملٹھی، اجوائن، کالا نمک وغیرہ ضرور ہوتا۔ چوٹ لگتی تو ہلدی دودھ سے آرام آجاتا۔ ہلدی کا لیپ کیا جاتا۔ رنگ نکھارنے کے لیے ہلدی اٹھن میں شامل کی جاتی۔ گھریلو ٹوٹکوں کا یہ علم تجربات کی روشنی میں نسل در نسل چلتا جاتا۔ آج بھی ان سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں طب کے حوالے سے کافی رسالے نکلتے ہیں۔ بہت ساری معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ہمدرد صحت، راہنمائے صحت، مرحبا صحت، شفا نیوز وغیرہ صحت کے حوالے سے جدید تحقیق کے ساتھ اپنے قارئین کو ہر بات سے آگاہ کرتے ہیں۔ ہمارے ڈائجسٹ میں بھی صحت پر جو مضامین شائع ہوئے ان میں بھی کافی معلومات تھیں۔ سونف اجوائن پر بھی لکھا گیا ہے۔

ہمارے ہاں وٹامنز کا استعمال عام ہے۔ تھایامین، ریبوفلیوین، نیاسین، پائیریڈاکسین، فولک ایسڈ وغیرہ کے متعلق معلومات ہیں۔ اسی طرح فاسفورس، لوہا، سلفر، سوڈیم، میگنیشم، پوٹاشیم، آیوڈین، زنک وغیرہ ہیں۔ اماٹو ایسڈز کا علیحدہ باب ہے۔ اس بارے میں کم لوگوں کو علم ہے۔ آپ نیٹ پر یہ ساری معلومات لے سکتی یا طبی رسائل پڑھ سکتی ہیں۔ آپ نے مٹاپے کے بارے میں لکھا ہے۔ پہلا سوال خواتین سے ان کے نظام کے بارے میں پوچھا جاتا ہے، پھر ان کو کسی اچھے مستند حکیم کے مطب کا بتایا جاتا ہے۔ بے شمار لڑکیوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ طب مشرق میں بہت اچھی ادویات ہیں جو نظام بہتر کرتی ہیں۔ آپ کا مضمون میں نے نہیں دیکھا، اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتی۔ اُمید ہے آیندہ بھی رابطہ رکھیں گی۔

بغلوں میں پسینہ

عمر ۱۸ر سال ہے۔ میری بغلوں میں سردی گرمی بہت پسینہ آتا اور بدبو ہوجاتی ہے۔ اس کے بارے میں ضرور بتائیے۔ چہرے اور گردن پر بالوں کے لیے بھی مشورہ دیں۔ یہ میری بہن کا مسئلہ ہے۔

(حریم ارشد۔ راولپنڈی)

گھریلو ٹوٹکا تو یہ ہے: نیم کے پتے سکھا کر باریک سفوف بنالیں۔ نہا کر خشک جگہ پر لگائیں۔ اینٹی سپٹک ہے، دوسری بات یہ کہ پھٹکری سفید کا ایک بڑا ڈلا منگوا کر غسل خانے میں رکھیے۔ نہانے کے بعد جسم خشک کرکے ڈلا اچھی طرح مل لیں۔ میری ایک دوست پھٹکری ضرور استعمال کرتی ہے۔ اس سے پسینہ نہیں آتا۔ اپنے ڈاکٹر سے ضرور مشورہ کریں۔ دوسرے غیر ضروری بالوں کو زیادہ نہ چھیڑیں، وہ کالے اور سخت ہوجائیں گے۔

دانت بھرے بھرے ہیں

میری عمر ۲۳ر سال ہے۔ دانت خراب ہورہے اور نکلے گر رہے ہیں۔ اس کے لیے بتائیے، درد بھی ہے، یہ کیسے ٹھیک ہوگا؟

کیلشیم کی کمی سے یہ مسئلہ ہوتا ہے۔ آپ فوراً دانتوں کے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیے۔ پھل، سبزی، دودھ اپنی غذا میں شامل کریں۔ پھٹکری، ۶ر گرام اور مازو ۲۵ر گرام باریک پیس کر رکھیے۔ نمک ذرا سا ملا کر دانتوں پر رات کو ملیے۔ آدھ گھنٹے بعد کلی کریں۔ دانت مضبوط ہوتے ہیں۔ پیلو کی مسواک دانتوں کو صاف رکھتی ہے۔ کیمیائی تجزیہ سے پتا چلا ہے کہ اس میں کلورین، مینگ ایسڈ، گندھک، نمکیات وغیرہ ہیں۔ سب سے اچھی پیلو کی مسواک ہے۔ دانتوں سے خون نکلتا ہو، مسوڑھے سوج جائیں، کھانے میں تکلیف محسوس ہو تو ہمدرد مطب کی ریوند پیٹ استعمال کرنے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ میں نے بے شمار لوگوں کو بتایا اور ان کا مسئلہ ٹھیک ہوگیا۔

دانت میں درد رہتا ہو تو امرود کے تازہ پتے دس پندرہ لے کر ڈیڑھ گلاس پانی میں خوب پکا اور چھان کر غرارے کرنے سے آرام آجاتا ہے۔ اس عمر میں لڑکیاں کچے آم کی کھٹائی اور اچار خوب کھاتی ہیں۔ گرم گرم کھانا کھا کر برف کا پانی پی لیتی ہیں۔ احتیاط کریں۔ کیلشیم ضرور کھائیے اور صبح شام دانت صاف کریں۔ پنجاب میں آج بھی دندانہ دانتوں پر ملا جاتا ہے۔ اس سے دانت صاف ہوجاتے ہیں۔ آپ دانتوں کی صفائی کا خاص خیال رکھیے اور ڈاکٹر کو ضرور دکھائیے۔

جسم کا بھدا پن

میرا بچہ ڈیڑھ سال کا ہے۔ اسے میں نے ڈبے کا دودھ نہیں دیا لیکن محسوس کیا ہے کہ دودھ پلانے سے جسم بھدا ہوجاتا ہے۔ کیا بچوں کو دودھ نہیں پلانا چاہیے، اس بارے میں بتائیے۔

(سمیرا۔ وہاڑی)

ماں کا دودھ بچے کے لیے ایک نعمت ہے۔ اب تو ڈاکٹر بھی تاکید کرتے ہیں کہ بچوں کو دودھ پلانے سے ماں اور بچہ، دونوں صحت مند رہتے ہیں، آپ اس بارے میں پریشان نہ ہوں۔ جسم کی ساخت قدرتی ہوتی ہے۔ آج کل طرح طرح کے اشتہار آتے ہیں، سب فضول ہیں۔ حمل کے دوران اور بچے کو دودھ پلانے تک فرق پڑتا ہے۔ جسم میں تبدیلیاں ہوتی ہیں، پھر آہستہ آہستہ جسم معمول پر آجاتا ہے۔ بہت ساری خواتین اسی لیے بچے کو ڈبے کا دودھ پلاتی ہیں۔ آپ اپنی ڈاکٹر سے پوچھ سکتی ہیں، وہ بھی ماں کے دودھ کو فوقیت دیتی ہیں۔

سنہرے بال، نیلی آنکھیں

آپ سب کو مشورے دیتی ہیں۔ میرا بچہ ایک سال کا ہے۔ دوسرے کی خوشخبری ہے۔ میں نے پڑھا تھا، ناریل کا پھول کھانے سے بچہ بہت خوبصورت، نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والا ہوتا ہے۔ یہ پھول کہاں ملتا ہے؟ خوبصورت بچے کے لیے آپ جتنے ٹوٹکے جانتی ہیں، ضرور لکھیے۔

(فریحہ اظہر)

بی بی! بڑی بوڑھیاں کہتی تھیں، حمل کے شروع میں دہی چاول ناشتے میں کھائیں اور اس میں ناریل کاٹ کر ملائیں تو بچہ گورا ہوتا ہے۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز پر قادر ہے۔ اپنی مرضی سے بچے کی شکل وصورت نہیں بنا کرتی۔ آپ نماز کے بعد قرآن پاک پڑھ کر دعا کریں، اس سے دل کو سکون ملے گا۔ نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں سے کیا ہوگا، صحت مند بچہ ہونا چاہیے۔ ناریل کا پھول ناریل کے اندر ہی ہوتا ہے، بازار میں نہیں ملتا۔ ضروری نہیں کہ پھول کھانے سے آنکھیں نیلی ہوں۔ اپنے دل سے یہ بات نکال دیجیے۔

لال پیاز

بازار میں اکثر سرخ پیاز ملتا اور بہت تیز ہوتا ہے۔ یہ پیاز صحت کے لیے کیسا ہے؟ اس کی تیزی اچھی نہیں لگتی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔

(عمرانہ وحید)

پیاز کی کئی قسمیں ہیں اور سب ہی صحت کے لیے مفید ہیں۔ سفید پیاز، ہلکی پیلی پیاز، سرخ پیاز، گلابی رنگ کی چھلکوں والی پیاز بازار میں ملتی ہے۔ سرخ پیاز میں کاٹتے وقت آنکھوں سے پانی آجاتا ہے۔ ہوٹل والے پیاز ٹھنڈے پانی میں بھگو کر کاٹتے ہیں۔ اب سائنس دانوں نے تحقیق کی ہے جو لوگ دل کی بیماریوں میں مبتلا ہیں، وہ سرخ پیاز استعمال کریں تو دل کی شریانیں بند ہونے کا خطرہ بہت کم ہوجائے گا۔ ہمارے جسم کے اندر مضرِ صحت کولیسٹرول پیاز کھانے سے کم ہوجاتا ہے۔ پہلے زمانے میں طرح طرح کی سلاد بنتی تھی بلکہ پیاز کا استعمال کھانے کے ساتھ ہوتا تھا۔ پیاز باریک کاٹ کر ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچ ملا کر لیموں نچوڑتے تھے۔ دال سبزی کے ساتھ یہ پیاز بہت اچھی لگتا۔

پیاز کا چھوم بناتے، باریک چوکور پیاز کے ٹکڑے، ٹماٹر، ہری مرچ، پودینہ کے ساتھ رکھے جاتے۔ پیاز کا اچار سرکہ میں ڈالا جاتا۔ برسات کے موسم میں پیاز کا استعمال زیادہ ہوتا۔ پیاز گوشت، قیمہ پیاز، خشخاش پیاز پکائی جاتی، روزانہ صرف ایک پیاز کی سلاد کھائی جائے تو آپ بہت ساری بیماریوں سے بچ سکتی ہیں۔ دیہاتوں میں کڑی دھوپ میں کام کرنے والے کسانوں کی من بھاتی غذا پیاز اور روٹی ہے۔ ثابت پیاز چھل کر نمک مرچ ڈال کر کھاتے ہیں۔ صحت ٹھیک رہتی ہے۔ آپ لال پیاز سے نہ گھبرائیے۔ خرید کر لائیں اور استعمال کریں، اس کے بہت فائدے ہیں۔

مچھلی

مچھلی گرم ہوتی ہے، اسے حمل کے دوران کھانا چاہیے یا نہیں، ضرور بتائیے۔ میری بہن حاملہ ہے۔ اسے مچھلی بہت پسند ہے لیکن ہم اسے کھانے نہیں دیتے۔

(نمارہ)

اس بارے میں آپ اپنی ڈاکٹر سے بھی پوچھ سکتی ہیں۔ مچھلی صحت مند غذا ہے۔ ہفتے میں ۲ر بار لے سکتی ہیں۔ ہر چیز کی زیادتی اچھی نہیں ہوتی۔ آپ ایک ۲ر ٹکڑے کھائیے۔ حاملہ خواتین کو چاہیے، وہ ڈاکٹر سے غذا کے بارے میں ضرور پوچھیں تاکہ ان کا وہم دور ہوجائے۔

باپ اور شوہر تو بہت اختیار دیتے ہیں
لیکن اولاد ہی اکثر بے اختیار کر دیتی ہے

خواتین کے بااختیار ہونے کے باوجود وہ خود کو بے اختیار کیوں محسوس کرتی ہیں؟

فریدہ خانم

عورت گُہر مثال ہے، اُجلا لباس ہے
تُہمت لگا کے اُس کو کبھی ذلتیں نہ دو

خواتین کا احترام ہی دراصل ان کا اختیار ہوتا ہے۔ اسلام نے ان کو یہ حق بہت پہلے دے دیا تھا۔ چشمِ اسلام نے بارہا اپنے عمل سے اس کو پختہ کیا۔ لوگوں کو ذہن نشیں کروایا۔ ان کی رضاعی بہن آئی ہوں یا حاتم طائی کی بیٹی کی آمد ہوئی۔ آنحضورؐ کی اپنی پیاری بیٹی فاطمہ کے لیے بھی روایات میں آیا ہے کہ آپؐ عزت اور احترام کے لیے کھڑے ہو کر استقبال کرتے۔ اپنی چادر بچھا کر بٹھاتے اور عورت کی عزت اور تقدس کا واضح پیغام دیتے۔ ہم نے دین سے دوری اختیار کی تو ساری تعلیمات بھی بھلا دیں۔ مغرب کی پیروی شروع کی جہاں عورت پیر کی جوتی سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ اسے تو ووٹ کا حق ملے بھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اب بھی باقاعدہ بیچی جاتی ہے۔ وہاں اس کی تجارت کی جاتی ہے۔ ہم ایک عورت کو دوبار وزیرِاعظم بنا چکے ہیں۔ امریکا جیسے ملک میں تو آج تک یہ بھی نہیں ہوا۔ اسلام میں خواتین کا کیا مقام اور اختیار ہے۔ ایک ماں کے قدموں تلے جنت رکھ دی گئی اولاد کی بخشش کے لیے ماں کی خوشی کو لازم کیا گیا۔ لیکن موجودہ دور میں خواتین کیا محسوس کرتی ہیں اور مردوں کی کیا رائے ہے، اس خصوصی سروے میں ملاحظہ کریں۔

سلیمہ ہاشمی (ڈین آف بیکن ہاؤس یونیورسٹی)

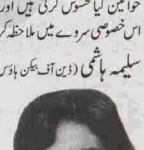

خواتین کے اپنے آپ کو بے اختیار سمجھنے کی ۳ر وجوہ ہیں۔ پہلی یہ کہ تاریخی اور روایتی طور پہ عورت کو کسی کی ملکیت سمجھا جاتا ہے اور اکثر قانون بھی اِس معاملے میں عورت کا ساتھ نہیں دیتا۔ عدالتوں میں جج صاحبان عورت کو مرد کی ملکیت سمجھتے ہیں اور اگر عورت مرضی سے شادی کرنا چاہے یا جائیداد کا تقاضا کرے تو اس کی رائے کو ترجیح نہیں دی جاتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر پارلیمنٹ اور اسمبلی میں مرد حضرات کا رویہ دیکھیں کہ وہ کس طرح عورتوں کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تیسری وجہ سماجی ہے، جب بیٹا پیدا ہوتا ہے تو گھر میں کس قدر خوشی منائی جاتی ہے لیکن بیٹی پیدا ہو تو یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کی یہی مرضی ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں جب تک یہ معاشرہ خود کو تبدیل نہیں کرتا، تب تک عورت اپنے آپ کو بااختیار نہیں کر پائے گی۔

فریدہ خانم (گلوکارہ)

آج کے دور کی خواتین بہت باہمت اور محنتی ہیں، ان پہ دہری ذمہ داریاں ہیں۔ وہ گھر بھی سنبھالتی اور ملازمت بھی کرتی ہیں۔ شروع سے ہی ہمارے معاشرے اور گھروں میں یہ ماحول رہا ہے کہ عورت کی رائے اور وجود کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی جاتی۔ انھیں بے شمار مسائل کا سامنا ہے۔ اسی لیے وہ اتنے ترقی یافتہ دور میں بھی خود کو بے اختیار پاتی ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ گھر والے اور خاص طور پر شوہر اپنی بیوی کا خیال رکھے اور حکومت کو چاہیے کہ وہ خواتین کے مسائل سنیں اور انھیں حل بھی کریں۔

آمنہ اسماعیل (ایڈمنسٹریٹر شاکربل میوزیم، لاہور)

تمام اختیارات ہونے کے باوجود ہم بے اختیار اپنے ہی ہاتھوں ہیں۔ ہمیں جو اختیار باپ دیتا ہے بیٹی ہونے کے ناتے، ہمیں جو اختیار شوہر دیتا ہے بیوی ہونے کے ناتے، اور ہمیں جو اختیار معاشرہ دیتا ہے ایک خاتون ہونے کے ناتے، وہ حقیقت ہے۔ اب جہاں ہم بے اختیار ہو جاتے ہیں وہ ہے جب ہمارے سامنے ہماری اولاد آجائے یا پھر وہ رشتے جو ہم پر لاگو ہیں۔ ہم ان تمام اختیارات کے باوجود بھی بے اختیار محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ کچھ رشتوں سے چھٹکارا آسان نہیں، ذمہ داری کا احساس ہمیں پیدا ہوتے ہی ہو جاتا ہے۔

میری اپنی مثال ہے کہ میرے پاس وہ تمام اختیارات ہیں جو ایک بیوی، ایک بیٹی اور بہو اور معاشرے کا ذمے دار فرد ہونے کے ناتے اگر میں استعمال کرنا چاہوں تو میں کر سکتی ہوں، لیکن یہ اختیار صرف اس لیے استعمال نہیں کرتی کہ میں صرف ایک بااختیار عورت نہیں، بلکہ ان تمام رشتوں سے جُڑی ایک عورت ہوں جو بااختیار ہونے کے باوجود بھی بے اختیار ہے۔

اِرم اشفاق (مصورہ/منیجر انسٹیٹیوشنل ڈویلپمنٹ)

عورت کی جذباتی بناوٹ اللہ نے ایسی بنائی ہے کہ وہ تحفظ کے احساس میں پنپتی ہے۔ یہ اس کی فطری خواہش ہی نہیں بلکہ اس کے لیے ایک خوبصورت احساس ہوتا ہے کہ مرد اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اللہ نے مرد کو عورت پر حاکم بھی اسی لیے مقرر کیا ہے کہ اس پر عورت جیسی نازک اور مقدم ہستی کو اپنی پناہ اور حفاظت میں رکھے۔ عورت کتنی بھی طاقتور کیوں نہ ہو، وہ ایک امر بیل کی طرح ہوتی ہے جو ایک مضبوط اور تن آور درخت سے لپٹ کر پھلنا پھولنا چاہتی ہے۔

ایم اے رشید سینئر ایڈووکیٹ، کالم نگار/مصنف/ سیاسی تجزیہ کار/کارکن تحریک پاکستان کوئٹہ میڈیلسٹ

موجودہ معاشرے میں اختیار کا ہونا یا نہ ہونا اس بات کی بنیاد سے پرکھا جا سکتا ہے کہ ان اختیارات کا استعمال کیسے ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ ایسے اختیارات استعمال کرنے

کے لیے جو ذرائع چاہئیں، ان کا میسر نہ آنا خواتین کو بے اختیار محسوس کرواتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ اگر ایک بیوہ یا ایسی خاتون جو اپنے خاوند کی سرپرستی سے محروم ہے تو قانون اسے اختیار دیتا ہے کہ شرعی طور پر وہ اور اس کے بچے کفالت کے حقدار ہیں، انھیں یہ حق حاصل کرنے کے لیے بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہی اسے بے اختیار ہونے کا احساس کراتا ہے۔

مقصود عامر (شاعر/بانی ادبی تنظیم کردار، لاہور)

دراصل عورت کو اختیار نہیں مرتبے کی ضرورت تھی، جو اُسے ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی شکل میں عطا ہوا ہے۔ اگر اختیار مردوں پر حکومت کا نام ہے تو عورت کی یہ خواہش غلط ہے کیونکہ اپنے مرتبے کے لحاظ سے وہ کہیں احترام کے قابل ہے، کہیں خاندان کی عزت ہے، کہیں ناموس کی علمبردار ہے اور مرد کی نسل کی امین بھی ہے اور اس کے دل پر راج بھی کرتی ہے۔ اب اور کیا اختیار چاہیے عورت کو جسے قدرت نے آدھی گواہی کہا ہے۔

ریحانہ ظریف (صدر معلمہ)

دورِ جدید میں خواتین خاصی بااختیار ہونے کے باوجود بے اختیار بھی ہیں۔ وہ اس لیے کہ مردانہ معاشرے میں قدم قدم پر ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں مثلاً میں ایک سرکاری سکول کی صدر معلمہ اور گریڈ ۱۸/ کی اعلیٰ سرکاری افسر تھی۔ خواتین اساتذہ تو میرا کہنا مان لیتیں لیکن ایک مرد چپراسی اور ایک کلرک کو میں قواعد وضوابط کا پابند اس لیے نہیں بنا سکی کہ ان کا تعلق ایک خاص گروہی ولسانی تنظیم سے تھا۔ اس طرح شوہر اور بیوی کے حقوق برابر مگر گھر کے معاملات میں حتمی حکم ''شوہر صاحب'' (مرد) کا ہی چلتا ہے۔ مگر اس کی ہماری اپنی اجازت اور مرضی ہوتی ہے بے اختیاری نہیں۔

پروفیسر ایوب ندیم (شاعر/ڈرامہ نگار/ گورنمنٹ دیال سنگھ کالج، لاہور)

ہمارے معاشرے کے مختلف طبقوں میں خواتین کی حیثیت مختلف ہے۔ یقیناً ایسے طبقات بھی ہیں، جن میں خواتین کی حیثیت ایک تماشائی کی ہے یا پھر کنیز کی۔ لیکن ایسے طبقات کی بھی کمی نہیں، جہاں خواتین نہ صرف اپنی مرضی سے زندگی بسر کرتی ہیں، بلکہ بہت سے گھریلو معاملات میں ان کے فیصلوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔

رخشندہ خالد (جنرل سیکرٹری لیڈیز کلب، ماڈل ٹاؤن، لاہور)

یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ مرد کی محکوم ہے، اللہ تعالیٰ نے اُسے ایسے ہی پیدا کیا ہے اور ویسے بھی مرد کو تو پروردگارِ عالم نے ایک بلند رتبہ عطا کیا ہے۔ جہاں تک بااختیار ہو کر بھی بے اختیار محسوس کرنے والی بات ہے تو اگر ہم سوچیں اور غور کریں تو یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ ہمارے صدیوں سے جو معاشرتی رویے رہے ہیں اور عورت کی تربیت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ مرد کی حاکیت کو دل سے قبول کر چکی ہے اور وہ اسی میں ہی خوش اور راضی برضا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اسی میں خیر ہے۔ ہم نے دوسری صورتیں بھی دیکھی ہیں۔ بہت وسائل اور دُکھ ہوتے ہیں اس اختیار میں۔

ڈاکٹر فاخرہ شیرازی (بانی چیئرپرسن بزم خواتین اقبال، ایوانِ اقبال، لاہور)

اصل وجہ یہ ہے کہ خواتین اپنے حقوق کو نہ پہچانتی اور نہ ہی اپنے فرائض جانتی ہیں۔ وہ دو تہمد بیوں میں اُلجھ

گئی ہیں۔ انھیں پتا ہی نہیں چلتا کہ ہماری اسلامی اقدار کیا ہیں؟ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے عورت کو اعلیٰ مقام دیا ہے۔ اسے تخلیق کا وارث بنایا ہے۔ اس لیے اس کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ لیکن اب ہمارا معاشرہ ایسا ہوگیا ہے کہ خواتین کہیں سے گزر نہیں سکتیں اور اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتیں۔

نیلم احمد بشیر (افسانہ نگار)

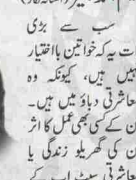

سب سے بڑی بات یہ کہ خواتین بااختیار نہیں ہیں، کیونکہ وہ معاشرتی دباؤ میں ہیں۔ ان کے کسی بھی عمل کا اثر ان کی گھریلو زندگی یا معاشرتی سیٹ اپ کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں وہ اتنی بااختیار نہیں جتنی کہ ان کی ذہنی استطاعت اور قابلیت ہے۔ ہمارے مذہب اسلام نے عورت کو بہت سے حقوق دیے ہیں۔ اسلام کے لحاظ سے بیوہ عورت اور طلاق یافتہ کا فوراً رشتہ ہوجانا چاہیے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں اگر کوئی عورت بیوہ یا طلاق یافتہ ہوجائے تو وہ شادی کا نام نہیں لے سکتی۔ وہ اپنا یہ حق اور اختیار استعمال نہیں کرسکتی۔ وہ اسی ذہنی دباؤ میں رہتی ہے کہ باپ کیا کہے گا، بچے کیا سوچیں گے۔ پاکستان میں ایسا نہیں ہوتا، جبکہ سعودی عرب اور ایران میں عورت کو یہ سب حقوق حاصل ہیں۔

پروین عاطف (افسانہ نگار/کالم نگار)

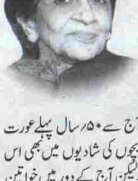

ہمارے معاشرے میں خواتین صدیوں سے نہ بہت زیادہ بااختیار تھیں اور نہ بے اختیار ہیں۔ اپنے فیصلے ذاتی طور پر انھیں کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ شادی میں عورت کی مرضی شامل ہو۔ آج سے ۵۰/ سال پہلے عورت اکیلی سفر نہیں کرسکتی تھی اور بچوں کی شادیوں میں بھی اس کی رائے نہیں لی جاتی تھی۔ لیکن آج کے دور میں خواتین تعلیم بھی حاصل کر رہی ہیں اور انھیں اقتصادی خودمختاری بھی حاصل ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنی اولاد اور اپنی زندگی کے لیے آواز اٹھانا بھی شروع کردیا ہے اور اب معاشرہ بھی انھیں اجازت دے رہا ہے۔ پہلے دور میں خواتین خود کو بے اختیار محسوس کرتی تھیں لیکن اب ۵۰/ سال تک کی خواتین اپنے فیصلے خود کرتی ہیں۔ میں اپنا واقعہ سناتی ہوں۔ مجھے ایم اے میں داخلہ والد صاحب نے اس شرط پر لینے دیا کہ میں پہلے منگنی کرالوں۔ یونیورسٹی کی طرف سے مجھے وظیفہ دے کر امریکا بھیجا جا رہا تھا لیکن والد اور شوہر (دورانِ تعلیم شادی بھی ہوگئی تھی) نے بالکل اجازت نہ دی۔

نازیہ حسن ملک (لیکچرار)

ہمارے پیارے وطن میں اکثر مرد عورت کو کوئی

> عورت کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو، اُسے سہارے کے لیے
> تن آور درخت سے لپٹ کر ہی پھلنا پھولنا ہے

حیثیت نہیں دیتے ہیں۔ عورت چاہے کسی بھی روپ میں ہو، ماں، بہن، بیٹی یا بیوی۔ حالانکہ اسلام میں عورتوں کے بہت سے حقوق ہیں۔ خود نبی کریم ﷺ کی بہت سی احادیث ہمیں عورت سے مساوات کا درس دیتی ہیں۔ جبکہ عورت کو مرد حضرات کی طرف سے گالیوں اور تشدد کا سامنا ہے، جس کی وجہ سے اس کی صلاحیتیں بُری طرح سے متاثر ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر معاشرے میں ایک فعال رکن کی طرح اپنا کردار بھی ادا کر سکتی ہیں۔ ملازمت پیشہ خواتین کو شادی کے بعد بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ اس وقت پاکستانی عدالتوں میں عورتوں سے متعلق بہت سے مقدمات چل رہے ہیں۔ حالانکہ پاکستان کی آزاد عدلیہ نے عورت کو بہت سے حقوق دینے کے لیے نئے قوانین بھی متعارف کرائے ہیں لیکن اگر عورت اپنے حق کے لیے آواز اٹھائے تو اسے بدکردار ہونے کے الزامات تک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عورت کو اس کا مقام دلانے کے لیے صرف گاندھی قوانین کی حد تک نہیں بلکہ عملی شکل دینا ہوگی تاکہ وہ باصلاحیت ہونے کے ساتھ بے اختیار نہ رہے۔

پرویش شاہین (مصنف/ڈائریکٹر گندھارا ریسرچ سینٹر، سوات)

خواتین بے اختیار نہیں بلکہ بااختیار ہیں۔ خواتین صرف احساسِ کمتری اور تن آسانی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ دراصل ان کو مردوں نے نہیں بلکہ انھوں نے اپنے آپ کو خود کمزور اور بے اختیار سمجھا ہوا ہے۔ ورنہ تاریخ ایسی بیشمار مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ خواتین نے وقتاً فوقتاً وہ کام کیے جو مرد بھی نہیں کر سکے۔ خواتین نے مختلف میدانوں میں رہبری کے فرائض انجام دیے ہیں۔ خواتین کو خود اپنی حیثیت کا احساس نہیں، اس لیے وہ اپنی قوت کا بھرپور مظاہرہ بھی نہیں کر سکتیں۔ خواتین میں بیداری پیدا کر کے بڑے بڑے جلسوں کے بجائے محلہ کمیٹی بنانے کی ضرورت ہے جہاں وہ اپنے مسائل پر بحث کر سکتی اور ایک دوسرے کے تجربے سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

کیا جھانسی کی رانی، رضیہ سلطانہ، نور جہاں، فاطمہ جناح، حسینہ واجد، اندرا گاندھی، سونیا گاندھی، محترمہ بے نظیر بھٹو، فہمیدہ مرزا، شمشاد اختر، بیگم نسیم ولی خان اور آج کل کی اسمبلی میں خواتین کی شرکت اور دوڑ دھوپ ان کے سامنے نہیں۔ خواتین کو ان کی طاقت کا احساس دلانے کی ضرورت ہے، کوئی اور آپ کی زندگی نہیں بدل سکتا، اس کے لیے خود میدان میں اترنا پڑتا ہے۔

عاصمہ مختار (پیشن)

بڑی بڑی باصلاحیت لڑکیاں اپنے گھروں میں مردوں کے سامنے بے اختیار ہوتی ہیں، وہ اپنی صلاحیت استعمال نہیں کر پاتیں اور وہ لڑکیاں جو فیلڈ میں آنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں وہ خود کو بہت بااختیار محسوس کرتی ہیں لیکن کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں انھیں اپنا آپ بے بس اور بے اختیار محسوس ہوتا ہے۔ مردوں کا بھی قصور نہیں۔ معاشرے کے عدم تحفظ کی وجہ سے سب اپنی عورتوں کا تحفظ چاہتے ہیں۔ ان کی حفاظت کے لفظ نگاہ سے بعض مرتبہ سختی بھی ہوتی ہے۔

عمر ملک (آر جے ایف ایم ۹۵- کوآرڈینیٹر جیو)

آج کی دنیا عورت کی دنیا ہے۔ اب خواتین پوری دنیا میں پر چھا چکی ہیں۔ پہلے گھر سے باہر نہیں جا سکتی تھیں اب وہ اونچی سطح پر پہنچ رہی ہیں۔ تعلیم سے لے کر حکومتی اُمور تک میں شریک ہیں۔

میں یہ بات کہتا ہوں کہ عورت اکثر زیادہ ذمے دار ہوتی ہے۔ نہ جانے خواتین خود کو بے اختیار کیوں محسوس کرتی ہیں۔ اب تو وہ دور آچکا ہے کہ مرد ذہنی تناؤ اور دباؤ کا شکار ہیں کہ عورتیں آگے نکل گئی ہیں۔ حد یہ ہے کہ ملک میں سب سے زیادہ مینیجر مشرف حیٔ بھی تو ایک عورت ہے۔

ٹی وی چینل چلانے سے لے کر جہاز اڑانے تک کون سی جگہ ہے جہاں عورت نہیں ہے۔ اتنی عزت اور آزادی اور کہاں ہے۔ عورتوں کو اپنی آزادی، عزت اور وقار کا خیال بھی رکھنا چاہیے اور اس کو بڑھانے کا بھی سوچنا چاہیے۔

مسلسل نئی تحقیقات

متواتر نئے نتائج

صحت کی دنیا

طاہرہ اعجاز ڈنگہ

شہد کا وہ مخصوص عنصر دریافت ہوگیا جو بیکٹیریا ختم کرتا ہے

قدیم زمانے سے شہد کی بیکٹیریا ختم کرنے والی اینٹی مائیکروبیل (Anti Microbial) خصوصیات دریافت ہو چکی ہیں اور پرانے زمانوں سے روایتی علاج میں شہد زخموں کو ٹھیک کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

اب پہلی دفعہ سائنسدانوں نے اس بات کا سراغ لگایا ہے کہ شہد جلد میں انفیکشن پھیلانے والے بیکٹیریا کو کیسے ختم کرتا ہے۔ یہ تحقیق جرنل FASEB کے جولائی ۲۰۱۰ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے مطابق شہد کی مکھیاں ایک ایسی پروٹین بناتی ہیں جو ان کے شہد میں شامل ہو کر اس میں اینٹی بیکٹیریل خصوصیات پیدا کرتی ہیں۔ اس پروٹین کا نام Defensin-1 ہے۔ طبی ماہرین کے مطابق ایک دن ایسا آئے گا کہ اس سے ایسی دوائیاں تیار کی جائیں گی جو جلنے اور جلد کی انفیکشن ٹھیک کرنے کے لیے استعمال ہوں گی اور ایسی دوائیاں بنائی جائیں گی جو اینٹی بائیوٹک کے اثر کے خلاف انفیکشن کو کم کریں گی۔

اس تحقیق کے ماخذ ڈاکٹر Sebastia A. J. Zaat ہیں جن کا تعلق میڈیکل سینٹر Amsterdam سے ہے۔ ان کا کہنا ہے شہد یا شہد سے حاصل کیے جانے والے اجزا بیکٹیریا سے محفوظ رکھنے اور ان کا خاتمہ کرنے کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

اس دریافت کے لیے طبی ماہرین نے بیماری پیدا کرنے والے بیکٹیریا کے خلاف شہد کی اینٹی بیکٹیریل کارکردگی کو چیک کرنے کے لیے لیبارٹری میں ٹیسٹ ٹیوب میں شہد کے اجزا کو علٰحدہ علٰحدہ بیکٹیریا کے خلاف عمل کروایا اور نتیجے میں دیکھا گیا کہ Defensin-1 پروٹین جو کہ شہد کی مکھیوں کے ایمون سسٹم کا حصہ ہے اور یہ ان کے شہد میں شامل ہو جاتی ہے، اس کی وجہ سے شہد میں اینٹی بیکٹیریل خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ تحقیق شہد کی مکھیوں کے ایمون سسٹم کی اندرونی کارکردگی پر بھی روشنی ڈالتی ہے جس کی وجہ سے شہد کی مکھیوں سے مزید اچھا

انگوروں کا رس سر اور گردن کے کینسر کے خلیے ختم کرتا ہے

ہر سال پوری دنیا میں ہزاروں لوگ سر اور گردن کے کینسر کی وجہ سے فوت ہوتے ہیں۔ ایک نئی تحقیق کے مطابق طبی ماہرین نے چوہوں اور لیبارٹری میں خلیوں پر تجربات کرنے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ انگوروں کا نیچرٹ ((Grape Seed Extract (GSE) کینسر کے خلیوں کو ختم کرتا ہے اور صحت مند خلیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔

Rajesh Agarwal پی ایچ ڈی ڈاکٹر یونیورسٹی آف کولوراڈو کینسر سینٹر کے مطابق انگوروں کا یہ اثر بہت ہی زبردست ہے۔ کینسر کے خلیے بہت تیزی سے پھیلتے ہیں لیکن جب ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جو ان کے پھیلنے کے لیے موافقت نہ ہوں تو اس کی وجہ سے وہ ختم ہو جاتے ہیں۔

انگوروں کا رس ایسی حالت پیدا کرتا ہے جو سر اور گردن کے کینسر کے خلیوں کے نشوونما اور پھیلنے کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ یہ کینسر کے خلیوں کے DNA پر حملہ کر کے ان کو نقصان پہنچاتا ہے اور ایسے عمل کو ہونے سے روکتا ہے جو کہ کینسر کے خلیوں کو ٹھیک ہونے میں مدد کرتا ہے۔ Agarwal کے مطابق کینسر کے خلیوں میں بہت سے ایسے خراب Pathways ہوتے ہیں جن پر ٹارگٹ کر کے ان کو ختم کیا جا سکتا ہے جب کہ تندرست خلیوں میں ایسا نہیں ہوتا۔

Agarwal لیب کے مطابق یہ تحقیق سر اور گردن کے کینسر کے خلاف تھراپی میں بہت مددگار ہوگی اور اس قسم کے کینسر کو ختم کرنے میں مفید ہوگی جس کا علاج پہلے بہت مشکل تھا۔

اور صحت افزا شہد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ ہم سب کو پتا ہے کہ شہد کا استعمال بہت اچھا ہے لیکن کیسے، یہ پہلے واضح نہیں تھا۔ اب اس تحقیق کے ذریعے ہمیں شہد کے اُس مخصوص عنصر کا پتا چل گیا ہے جو اس میں بیکٹیریا کو مارنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اب ہم اس کو بیکٹیریل انفیکشن کے خلاف مزید مؤثر بنا سکتے ہیں۔

سرجری سے پہلے پروٹین یا امائینو ایسڈز کا کم استعمال سرجری سے ہونے والی پیچیدگیوں کو کم کرتا ہے

ہارورڈ سکول آف پبلک ہیلتھ HSPH کی نئی تحقیق کے مطابق سرجری سے چند دن پہلے خوراک میں تبدیلی کر کے سرجری کی پیچیدگیوں سے بچا جا سکتا ہے جیسا کہ ہارٹ اٹیک یا فالج وغیرہ سے۔ اس تحقیق کو ثابت کرنے کے لیے HSPH کے طبی ماہرین نے چوہوں کے ۲ گروہوں پر تجربہ کیا۔ ایک گروہ کو ۶ سے ۱۴ دن کے لیے نارمل غذا کھلائی گئی اور دوسرے گروپ کو پروٹین اور امائینو ایسڈز فری غذا دی گئی۔ ۲ ہفتوں کے بعد چوہوں کے دونوں گروہوں کو سرجیکل سٹریس (Surgical Stress) دیا گیا جو کہ گردوں یا جگر کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ نتیجے میں دیکھا گیا کہ جو چوہے نارمل خوراک استعمال کر رہے تھے ان میں ۴۰ فیصد مارے گئے اور جو پروٹین اور امائینو ایسڈز کے بغیر والی غذا کھا رہے تھے وہ زندہ رہے۔

طبی ماہرین کے مشاہدے کے مطابق ایسے جینیں (Gene) جو کسی بھی قسم کے امائینو ایسڈ کی مقدار کو محسوس کرتے ہیں، اگر ان کو نکال دیا جائے تو بھی اس سے فائدہ ہوگا اور سرجری کے دوران پیچیدگیاں کم ہو سکتی ہیں جیسا کہ کارڈیو ویسکولر سرجریوں کے دوران سٹروک کا خطرہ ۸٪ فیصد سے ۹٪ فیصد تک ہوتا ہے، لیکن یہ سرجری پر منحصر ہوتا ہے کہ سرجری جتنی مشکل ہوگی خطرہ بھی اتنا زیادہ ہوگا اور ہارٹ اٹیک کا خطرہ ۳ فیصد سے ۴ فیصد تک ہوتا ہے۔

پچھلے کئی سالوں کے دوران مختلف تحقیقات سے

سائنسدانوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سرجری سے پہلے خوراک میں تبدیلی کرنے سے صحت کو بہتر بنایا جا سکتا ہے اور زندگی کی مدت کو بھی زیادہ کیا جا سکتا ہے۔ ان فوائد میں ذہنی دباؤ میں کمی، سوزش یا بلڈ شوگر میں بہتری اور کارڈیو ویسکولر صحت میں بہتری وغیرہ شامل ہیں۔ طبی ماہرین چوہوں کے بعد یہ تجربہ انسانوں پر کرنے والے ہیں اور امید کی جا سکتی ہے کہ انسانوں پر بھی یہ کامیاب ہوگا۔ ویمن ہاسپٹل بوسٹن میں مریضوں پر اس کو شروع کر دیا گیا ہے۔ ان کو سرجری سے پہلے پروٹین فری غذا استعمال کروائی جا رہی ہے۔ اگر انسانوں میں اس کے فوائد کی تصدیق ہو گئی تو اس کی وجہ سے بیہیدگیوں کے خطرے کے بغیر سرجریاں کی جا سکیں گی۔

کچھ لوگ مختلف خوشبوؤں سے سونگھنے سے بیمار کیوں ہوتے ہیں؟

آپ کو کبھی یہ محسوس ہوا ہے کہ پاس کھڑے شخص کے لگائے ہوئے پرفیوم سے آپ کو سر درد شروع ہو گیا ہو یا کام کے دوران کسی جگہ پر صفائی کرنے والی کیمیکلز سے آپ کی جلد میں خارش شروع ہو جائے یا کوئی بھی خوشبو آپ کو تنگ کرے؟ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کو اس خوشبو سے الرجی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایسی خوشبو کے عادی نہیں یا آپ کا دماغ اس خوشبو کو برداشت نہیں کرنا چاہتا۔ اس کو میڈیکل کی زبان میں Chemical Intolerance کہتے ہیں۔

سائیکالوجسٹ لینس اینڈرسن جو کہ Umea یونیورسٹی سویڈن میں پڑھاتے ہیں، ان کے مطابق یہ بہت زیادہ حساسیت (Hypersensitivity) اس وجہ سے ہوتی ہے کہ آپ میں یہ اہلیت نہیں ہوتی کہ آپ ان خوشبوؤں کو برداشت کر سکیں۔

عام طور پر جب کوئی انسان کسی خوشبو کو سونگھتا ہے تو اس خوشبو کا احساس کچھ دیر بعد ختم ہو جاتا ہے لیکن وہ افراد Chemical Intolerance ہوتے ہیں، ان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خوشبو بڑھتی جا رہی ہے اور کبھی ختم نہیں ہو گی۔ لینس اینڈرسن نے ایسے افراد اور نارمل حساسیت رکھنے والے افراد دونوں کے درمیان خوشبو سونگھنے کے ردِعمل کا مشاہدہ کیا اور نتیجہ اخذ کیا کہ زیادہ حساسیت رکھنے والے افراد نے خوشبو کو بہت زیادہ محسوس کیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ان کو خوشبو زیادہ تیز محسوس ہوئی حالانکہ اس کی مقدار کو زیادہ نہیں کیا گیا تھا۔

ان افراد میں ۲ ٹیسٹ، (EEG) اور (FMRI) کرنے کے بعد یہ نتائج نوٹ کیے گئے کہ زیادہ حساسیت رکھنے والے افراد میں دماغ کی کارکردگی بھی دوسرے افراد سے مختلف تھی۔ نارمل افراد کے برعکس زیادہ حساسیت والے افراد میں خوشبو کے سونگھنے کے وقت گھنٹہ بعد بھی دماغ کی کارکردگی میں کمی نہ آئی اور وہ مسلسل اس کو محسوس کرتے رہے اور وقت گزرنے کے باوجود بھی اس خوشبو سے مانوس ہونے کی اہلیت نہ ہونے کی وجہ سے دماغ کی کارکردگی برقرار رہی۔

ایسے افراد میں دماغ کے طرف خون کا بہاؤ بھی مختلف طریقے سے ہوتا ہے اور ان میں درد کو محسوس کرنے کی حساسیت بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔

سونگھنے کی حس پورے جسم پر اثر کرتی ہے۔ ایک اور تحقیق کے مطابق ایسے افراد میں ان چیزوں کا ردِعمل بہت زیادہ ہوتا ہے جو ان کے ناک اور منہ کے Mucous Lining (خلیوں کی ایک بیرونی تہہ) کو چھیڑتے ہیں۔ ایسے افراد جو کہ سرخ مرچیں کھانے کی وجہ سے بہت زیادہ کھانستے ہیں، ان کے دماغ میں بھی دوسری خوشبوؤں کی نسبت اس کی وجہ سے زیادہ ردِعمل ہوتا ہے۔

Chemical Intolerance حیرت انگیز طور پر بہت عام ہے لیکن دمہ اور الرجی کے برعکس اس کے لیے بہت کم تحقیقات کی گئی ہیں۔ لہٰذا مزید تحقیقات کی ضرورت ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی تشخیص اور علاج کے مختلف نئے طریقے ڈھونڈے جا سکیں۔

وٹامن بی سپلیمنٹ کا دل کی بیماری پر کوئی اثر نہیں ہوتا

دل کے عارضے کے خطرے سے بچنے کے لیے وٹامن بی تجویز کرنا بے کار ہے۔ طبی ماہرین کے مطابق وٹامن بی سپلیمنٹ دل کے عارضے کے خطرے کو کم یا اس سے بچا نہیں سکتا۔

اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا جو یہ ظاہر کرے کہ وٹامن بی سپلیمنٹ کے استعمال سے ہارٹ اٹیک، سٹروک یا دوسری کارڈیو ویسکولر بیماریوں کے خطرے میں کمی آتی ہے۔ چنانچہ ایسی تحقیقات ان عوامل کو سمجھنے کے لیے بہت مفید ہیں جن سے دل کی بیماریوں کا خطرہ یا اس سے موت واقع ہونے کا ڈر ہوتا ہے کیونکہ ایسی اموات دنیا بھر میں پہلے نمبر پر ہیں۔

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ بعض وٹامن بی خاص طور پر B12، B9، اور B6 خون میں موجود ایک امائینو ایسڈ ہومو سیسٹین (Homo Cysteine) پر اثر کرتے ہیں۔ اس مالیکیول کی زیادہ مقدار دل کے عارضے کے خطرے کو بڑھاتی ہے لہٰذا پہلے یہ تجویز کیا جاتا تھا کہ وٹامن بی سپلیمنٹ کے استعمال سے اس مالیکیول کا لیول کم کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے دل کی بیماریوں کا خطرہ کم ہو سکتا ہے۔ لیکن طبی ماہرین کے مطابق اس دعوے کا کوئی سائنسی ثبوت ابھی تک نہیں ملا لہٰذا اس پر نظرثانی کے لیے ۲۴،۲۱۰ افراد پر ۸ مرتبہ آزمائشی کوششیں (Trials) کی گئی لیکن کسی مرتبہ بھی اس بات کے حق میں کوئی ثبوت نہ ملا کہ وٹامن بی سپلیمنٹ دل کی بیماریوں سے بچاتے ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی اثر ہارٹ اٹیک، سٹروک یا دل کی بیماریوں سے ہونے والی اموات پر دیکھا گیا۔

طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ ان سپلیمنٹ کو دل کی بیماریوں کے لیے تجویز کرنا ٹھیک نہیں۔ جب تک کسی نئی تحقیق سے اس کا کوئی ثبوت نہ مل جائے۔

یہ کائنات بڑی مہربان ہے۔ سوچنے سمجھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ اگر اس کائنات کے مہربان مالک کی نشانیوں (Signs) پہ توجہ دی جائے اور انسانی مشاہدے کو بہتر بنایا جائے تو یہ ہمارے لیے نت نئے علوم کے دروازے کھولتی رہے گی۔ ان علوم کے بہتر استعمال سے ہم اپنی زندگی کے لیے بے شمار آسانیاں پیدا کر سکتے ہیں۔

زندگی کی الجھنوں میں مدد کرنے والا ایسا ہی ایک دل چسپ علم فریزک اینڈ مولوجی (Forensic Entomology) ہے۔ اس علم میں تفتیشِ جرم کے سلسلے میں کیڑے مکوڑوں کی ساخت اور عادات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

خودکشی یا موت کا سبب بننے والے حادثے کی صورت میں موت کا صحیح تعین اور جگہ کا تعین بہت ضروری ہوتا ہے۔ موت کے بعد مختلف قسم کے کیڑے مکوڑے انسانی جسم کا رخ کرتے ہیں اور گوشت، خون، ہڈیاں، بال اور دیگر حصوں کو اپنی خوراک بنانے لگتے ہیں۔ گلنے سڑنے کے مختلف مراحل میں مختلف کیڑے مردہ جسم پہ موجود ہوتے ہیں۔ ان کیڑے مکوڑوں سے جرم کی تفتیش میں معاون بننے والی اہم معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً موت کو کتنا وقت گزر چکا ہے؟ کیا موت کے بعد انسانی جسم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا گیا ہے؟

اس علم کی ابتدائی کتابوں میں سے ایک (Washing away of wrongs) ہے جو ۱۲۳۵ء میں چین میں لکھی گئی۔ اس میں ایک دلچسپ قصے کا ذکر ملتا ہے۔ چین کے ایک چھوٹے گاؤں میں قتل کا ایک واقعہ ہوا۔ اس میں چاول کاٹنے والی درانتی سے ایک شخص کو مارا گیا تھا۔ اس گاؤں میں چاول اگائے جاتے تھے اور ہر شخص کے پاس درانتی موجود تھی۔ اس لیے قتل کی تفتیش مشکل تھی۔ تفتیش کرنے والے اہلکار نے تمام کسانوں سے کہا کہ وہ اپنی اپنی درانتی ہاتھ میں پکڑے قطار میں کھڑے ہو جائیں۔ اہلکار نے اس قطار میں کھڑے کسانوں کا بغور جائزہ لیا اور قاتل کی نشاندہی کر دی۔ قاتل نے بعدازاں اپنے جرم کا اقرار بھی کرلیا۔ اہلکار کو ثبوت اس بات سے ملا کہ ایک خاص طرح کی مکھیاں (Green Bottle Flies) صرف اس ایک کسان کی درانتی کی طرف جارہی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ درانتی کو چاہے جتنی بھی اچھی طرح صاف کیا جائے مکھیاں خون کی باقیات کا سراغ لگا لیتی ہیں۔ موجودہ دور میں یہ علم بہت ترقی کر چکا ہے۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور ڈی این اے تحقیق سے اس علم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ٹی وی چینلز پہ اس سائنس سے تعلق رکھنے والے مختلف مقبول شوز سے عام لوگوں کی بھی اس علم سے آگاہی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پچھلے چند سالوں سے اس علم کو جرم کی تحقیق میں اہم مقام مل رہا ہے۔ اس کی مدد سے جرم کے کئی معموں کو حل کیا جا چکا ہے۔

اس علم کے استعمال کے لیے موت کے بعد کا پہلا مہینا بہت اہم ہوتا ہے۔ جب موت واقع ہوتی ہے تو اس کے چند منٹوں کے بعد ہی کیڑے مکوڑے انسانی جسم پہ پہنچ جاتے ہیں۔ اگر ان کی آمد، ساخت اور عادات کو سامنے رکھا جائے تو اس علم کی روشنی سے اہم شواہد ملنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اس علم کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موت کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس علم کی مدد سے قتل کی صحیح جگہ کا تعین بھی کیا جاسکتا ہے۔ بعض اوقات قاتل ثبوت کو مٹانے کے لیے مردہ جسم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کو مارنے کے بعد میدانی علاقے سے بلندی والے مقام پہ منتقل کیا گیا ہے تو اس علم کا ماہر جانتا ہے کہ مختلف کیڑے مختلف جغرافیائی حالتوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ تفتیشِ جرم میں اہم معلومات مہیا کرسکتا ہے۔

موت کس سبب سے ہوئی، اس حوالے سے بھی یہ علم قانون نافذ کرنے والوں کی راہنمائی کرسکتا ہے۔ مثلاً اگر موت کو ایک لمبا عرصہ گزر چکا ہو تو پولیس کے لیے موت کا سبب جاننا مشکل بن جاتا ہے۔ عام حالت میں کیڑے مخصوص جگہوں پہ انڈے دیتے ہیں لیکن اگر جسم پہ کھلے زخم ہوں تو وہ ان میں بھی انڈے دیتے ہیں۔ معمول سے ہٹ کر دیگر جگہوں پہ انڈوں کی موجودگی زخموں کی نشاندہی کرتی ہے۔

اگر اندیشہ ہو کہ قتل یا خودکشی زہر کے باعث ہوئی ہے اور موت کو اتنا لمبا عرصہ گزر چکا ہو تو جسم پہ موجود کیڑوں پر مختلف تجربات کر کے اہم معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

پیرس کے قریب رہنے والے برجیرٹ (Bergeret) (۱۸۵۵ء) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس علم کا پہلا مغربی ماہر تھا۔ اس کے زمانے میں ایک گھر سے چھوٹے بچے کا مردہ جسم ملا جسے آتش دان کے اوپر بنے چھجے میں چھپایا گیا تھا۔ تفتیش شروع ہوئی۔ اس ماہر نے مخصوص کیڑوں کی موجودگی سے اندازہ لگایا کہ اس موت کو کئی سال گزر چکے ہیں اور اس مکان کے موجودہ مکینوں کے بجائے پرانے مکینوں کے اس قتل میں ملوث ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔

ہنگری کے ایک کشتی چلانے والے شخص کو ایک ڈاکیے کے قتل کے واقعے میں عمرقید کی سزا دی گئی۔ اس ڈاکیے کی لاش ستمبر کی ایک شام کشتی پر پائی گئی۔ اس دن یہ کشتی چلانے والا شام ۶ بجے اپنی کشتی پہ پہنچا تھا اور ڈاکیے کی لاش اس کی آمد کے کچھ گھنٹوں کے بعد وہاں دیکھی گئی تھی۔ لاش کا طبی معاینہ اگلے دن ۴ بجے ہوا۔ طبی رپورٹ میں مخصوص قسم کے کیڑوں کے انڈوں اور لاروں کی موجودگی کا ذکر بھی کیا گیا۔ لیکن مقدمے کی کارروائی میں اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔ مقدمے میں کشتی چلانے والے کو عمرقید کی سزا سنا دی گئی۔ ۸/سال بعد مقدمہ دوبارہ سنا گیا۔ حشرات کا علم رکھنے والے ماہر نے ثابت کیا کہ طبی رپورٹ میں جن لاروں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے انڈے قتل والے دن شام ۶/بجے سے پہلے دیے گئے ہیں۔ اس ثبوت سے کشتی چلانے والے کو قید سے رہائی ملی۔

اس علم کی ترقی سے یہ بات روشن ہو رہی ہے کہ اس کائنات میں کوئی چیز بے کار نہیں خواہ وہ کوئی حقیر سا کیڑا یا مکھی ہی کیوں نہ ہو۔ انسان کا کام ہے کہ اپنے مشاہدے کو وسعت دے۔ چھوٹی چھوٹی تفصیلات پر توجہ دے اور بڑے بڑے نتائج اخذ کرے۔ اس طرح وہ اپنی صلاحیتوں کو انسانوں کیلئے مفید بنا سکے گا

کچھ عرصہ قبل شمالی انگلینڈ کے علاقے میں موسم سرما کے آخری دنوں میں ایک مردہ جسم ملا۔ جسم کم درجہ حرارت کے باعث محفوظ حالت میں تھا۔ عام طبی معلومات کی مدد سے کہا گیا کہ اس شخص کی ہلاکت ۲/یا ۳/ہفتے پہلے ہوئی ہے۔ اس کے برعکس مردہ جسم پر موجود کیڑوں کی مدد سے ملنے والی معلومات سے پتا چلا کہ اس شخص کو مرے ۲/ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ انکشاف دیگر شواہد سے زیادہ مطابقت رکھتا تھا لہٰذا عدالت نے اسے تسلیم کرلیا۔

بچوں کی صحت

اپنے بچوں کی آنکھوں کا خیال رکھیں

فوزیہ عباس

ڈاکٹر عامر اسرار بچوں کی آنکھوں کے مسائل اور علاج بتاتے ہیں

ذہانت

وشرارت سے چمکتی آنکھوں والے، ہنستے، مسکراتے، پیارے پیارے صحت مند بچے سب کو اچھے لگتے ہیں۔ ملکی آبادی کے ایک بڑے حصے سے تعلق رکھنے والے بچوں کی اکثریت کسی بھی بڑے مرض کا شکار ہونے کی صورت میں عدم توجہ، وسائل کی کمی، لاعلمی اور شعور و آگاہی کے فقدان کے باعث بروقت و معیاری علاج کی سہولیات سے محروم رہتے ہیں۔ خصوصاً بصارت سے محروم بچے کی زندگی کا ایسا المیہ اور عظیم نقصان ہے جس کی تلافی آیندہ زندگی میں ممکن نہیں ہوسکتی۔ بصارت سے محروم بچوں کا مستقبل ہی تاریک نہیں ہوتا بلکہ پوری زندگی اندھیروں میں گم ہو جاتی ہے۔

اپنے بچوں اور ان کی صحت سے متعلق مختلف امور کے حوالے سے ہماری مجرمانہ غفلت کا اس سے بڑا ثبوت اور لمحۂ فکریہ اور کیا ہوگا کہ ہمارے پاس ایسے کوئی سرکاری و غیر سرکاری مصدقہ اعداد و شمار ہی سرے سے موجود نہیں ہیں کہ جن سے پتا چل سکے کہ ہر سال کتنے فیصد بچے پیدائشی طور پر آنکھوں کے امراض و مسائل کا شکار ہوتے ہیں؟ ترقی یافتہ ممالک کے برعکس پاکستان میں بچوں کے آنکھوں کے امراض و مسائل کا تناسب کیا ہے یا پیدائشی طور پر بصارت سے محروم بچوں کی شرح کیا ہے؟

گزشتہ دنوں معروف ماہرِ امراضِ چشم ڈاکٹر عامر اسرار سے ۱۶ رسال تک کی عمر کے بچوں کی آنکھوں کے امراض و مسائل اور ان کے علاج کے حوالے سے ایک طویل معلومات افزا نشست ہوئی، جس کا مقصد والدین و اساتذہ میں شعور و آگاہی پیدا کرنا اور اربابِ اختیار و صاحب بصیرت افراد کی اس جانب توجہ مبذول کرانا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے ہونے والی گفتگو کے اہم نکات نذرِ قارئین ہیں۔

☆ دیگر ممالک کے برعکس پاکستان میں بچوں کی آنکھوں کے امراض و مسائل کی شرح کا کوئی درست ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ نہ ہی پیدائشی طور پر بصارت سے محروم ہونے والے بچوں سے متعلق کوئی اعداد و شمار ہیں۔

☆ پاکستان سمیت دنیا بھر میں بچوں کے ۳ رہڑے امراض نظر کمزور ہونا، بھینگا پن اور الرجی ہیں۔

☆ حاملہ خواتین کو کبھی بھی ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر خود سے یا اِرد گرد کی خواتین سے پوچھ کر دوا استعمال نہیں کرنی چاہیے کیونکہ بے شمار دوائیں ایسی ہیں جو بچے کے Optic Nerves کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ آنکھوں میں موتیا پیدا کرتی یا بچے کی نشوونما میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہیں۔

☆ پیدائش کے بعد بچوں سے ڈاکٹر خاص طور پر بچے کی آنکھوں کا معاینہ ضرور کرتے ہیں کیونکہ فرض کریں اگر نومولود کی دونوں آنکھوں میں سفید موتیا موجود ہے تو اگر ۱۵ روز یا ایک مہینے کے اندر اس کا علاج نہیں کرایا جاتا تو بچہ ساری زندگی کے لیے بصارت سے محروم ہوسکتا ہے۔

☆ کسی بھی بچے میں سب سے زیادہ جو نظر کی خرابی پیدا ہوسکتی ہے وہ پہلے ماہ میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد دوسرا ٹائم ہے پہلا سال۔ تیسرا مرحلہ ہے عمر کے پہلے ۱۰ سال۔ کسی بھی بچے میں اگر آنکھوں/نظر کی کوئی خرابی یا بیماری ابتدائی ۱۰ رسالوں کے اندر تشخیص ہو جاتی ہے تو وہ عموماً قابلِ علاج ہوتی ہے۔

☆ ابتدائی ۱۰ رسالوں میں بچے کی نظر ۱۰۰ رفیصد ہونا چاہیے جسے ہم لوگ Vision6 / 6 یا Vision 20 / 20 کہتے ہیں اور یہ Vision دونوں آنکھوں میں علیحدہ علیحدہ ہونا چاہیے۔

☆ آنکھوں کے موروثی امراض میں سب سے پہلی چیز ہے چشمہ لگنا، پھر موتیا بند کا آنا، اس کے علاوہ Retina کی Degenerations بھی موروثی امراض میں شامل ہے۔ گلوکومایا کالا موتیا بھی عام ہے۔

☆ کلر بلائنڈنیس موروثی ہونے کی وجہ سے ناقابلِ علاج ہے۔ اس میں کوئی ایک رنگ بھی ہوسکتا اور سارے رنگ بھی ہوسکتے ہیں۔

☆ نظر کا ہماری جسمانی صحت کے ساتھ ۹۹ رفیصد تعلق ہے۔

☆ وہ بچے جو کم یا غیر متوازن خوراک لیتے ہیں ان کی نظر پر اثر پڑتا ہے۔

☆ بینائی تیز کرنے/برقرار رکھنے کے لیے صحت بخش متوازن غذا کا استعمال ضروری ہے۔

☆ آنکھوں کی الرجی میں اگر تیز مرچ مسالے اور کھٹی چیزیں استعمال نہ کریں تو یہ نہیں ہوتی۔

☆ گرمیوں میں بچوں میں الرجی اور انفیکشن عام دیکھنے میں آتے ہیں۔

☆ گرمیوں میں ایک خاص وائرس پھیلتا ہے جسے ہم ایڈینو وائرل کیرٹائٹس کہتے ہیں۔ یہ واحد وائرس ہے جو Dead Objects پر بھی Survive کر جاتا اور ہاتھوں کے ذریعے پھیل کر دوسرے افراد خصوصاً بچوں کو متاثر کرتا ہے۔

☆ وبائی/متعدی امراض میں الرجی اور انفیکشن اہم ہیں۔ ان سے بچنے کا بہترین علاج یہ ہے کہ اپنے ہاتھ دھوتے رہیں۔ آنکھوں کو بلاوجہ نہ چھوئیں، اپنا تولیہ اور تکیہ الگ رکھیں۔ اس دوران جو نشوز استعمال کریں انھیں پوری طرح تلف/ضائع کریں۔

☆ وہ بچے جو لگاتار آنکھ ملتے رہتے ہیں اس سے ان کی نظر کمزور ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ ایک کنڈیشن ہے جسے ہم کیرٹوکونس کہتے ہیں۔ یہ قرینہ کا ٹیڑھا پن ہے جو آگے جا کر بہت سارے مسائل پیدا کرتا ہے۔

☆ وہ بچے جن کو چشمہ لگا ہو اور وہ نہ لگاتے ہوں، اُن کی نظر پر بھی اثر پڑتا ہے۔

☆ وہ بچے جو اندھیرے میں ٹی وی دیکھتے یا اندھیرے میں پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، اُن کی نظر بھی متاثر ہوتی ہے۔

☆ ٹی وی، کمپیوٹر اور موبائل گیمز آنکھوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے ہیں۔

☆ وہ بیماریاں جو دماغ اور اعصاب کو متاثر کر رہی ہوتی ہیں، اُن کا براہِ راست اثر آنکھوں پر بھی پڑتا ہے۔

☆ ۱۲ رسے ۱۶ ربرس کے بچے خود بھی اپنی آنکھوں کا

کنٹیکٹ لینز اچھی چیز ہے مگر بچوں کے لیے نہیں

جو بچے اندھیرے میں ٹی وی دیکھتے ہیں، اُن کی نظر ضرور متاثر ہو جاتی ہے

خیال رکھ سکتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ آنکھیں نہ ملیں، اندھیرے میں پڑھائی نہ کریں، رات کو جاگ کر والدین کے ڈر سے کمرے کی لائٹ بند کر کے کمپیوٹر یا موبائل پر گیمز نہ کھیلیں۔ اگر انھیں احساس ہو کہ ان کی آنکھ/نظر کمزور ہو رہی ہے تو بروقت والدین کو آگاہ کریں۔

☆ والدین کے برعکس اساتذہ بہتر طور پر بچے کے آنکھوں کے مسائل سے آگاہ ہوتے ہیں کیونکہ کلاس روم میں اس کا Visual Behaviour زیادہ بہتر طور پر سامنے آ رہا ہوتا ہے۔ اس لیے والدین اور اساتذہ میں باہمی مشاورت اور رابطے کا قائم ہونا ضروری ہے۔

☆ سورج گرہن کے موقع پر مختلف طریقوں سے سورج کو دیکھنے سے اگر آنکھ کے پردے کے سیل جل جائیں تو آنکھ کے درمیان میں ایک دھبہ نمودار ہو جاتا ہے جو چیزوں کو فوکس کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

☆ بچوں میں نظر کمزور ہونے کی بنیادی وجہ والدین یا دونوں میں سے ایک کا چشمہ لگانا ہے۔ آنکھوں کو بے دردی سے ملنا اور اندھیرے میں پڑھنا، ٹی وی دیکھنا وغیرہ اس کے علاوہ چوٹ لگنا، الرجی رہنا اور انفیکشنز بھی نظر کی کمزوری کا باعث ہو سکتے ہیں۔

☆ کونٹیکٹ لینز بلاشبہ اچھی چیز ہیں، لیکن ہم چھوٹے بچوں کو ان کے استعمال کی ہدایت نہیں کرتے کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی سے پیدا ہونے والی الرجی اور انفیکشنز بعض اوقات ساری زندگی کے لیے نظر/ آنکھ کو متاثر کر سکتے ہیں۔

☆ کونٹیکٹ لینز ہمیشہ کسی ماہر و مستند Prescriber کی ہدایت کے بعد خریدنا چاہیے۔

☆ لینز لگانے سے پہلے ہاتھ اچھی طرح دھونا چاہیے پھر لینز کو سلوشن سے دھوئیں۔ کیئسز کی صفائی، جس جگہ لینز کو رکھا جائے، اس جگہ کے ٹمپریچر اور صفائی کا خاص خیال رکھیں۔

☆ اگر سلوشن ختم ہوا ہو تو اس ٹائم پر ہرگز لینز استعمال نہ کریں۔ اکثر لوگ عام پانی سے دھو کر لینز لگا لیتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ ایک ذرا سی غلطی آنکھوں کو ساری عمر کے لیے ضائع کر سکتی ہے۔

☆ فیشن کے طور پر استعمال کیے جانے والے رنگ برنگے سن گلاسز اور لینز کے معیار کا خیال ضرور رکھیں۔

☆ والدین اور اساتذہ میں بچوں کے آنکھوں کے امراض و مسائل سے متعلق شعور و آگاہی پیدا کرنے کے لیے لیکچرز، ورکشاپس/سیمنارز وغیرہ کا انعقاد کیا جائے تو میرے خیال میں ۹۹ فیصد مسائل تو بروقت تشخیص کے باعث ایسے ہی حل ہو جائیں۔

☆ آپریشن سے خوفزدہ والدین سے گزارش ہے کہ جب معاملہ بچے کی صحت، زندگی اور مستقبل کا ہو تو اپنا دل سخت کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اس میں ٹائم فریم کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اپنی ہر طرح سے تسلی کر کے بروقت فیصلہ کرنے ہی میں ان کے بچے کی بہتری ہوتی ہے۔

ڈاکٹر عامر اسرار نے میڈیکل کی بنیادی تعلیم راولپنڈی میڈیکل کالج سے حاصل کرنے کے بعد آئرلینڈ کے رائل کالج آف سرجنز سے ایف آر سی ایس کیا۔ یورپین بورڈ آف گورنیو لیجیکو سرجری کی ٹیلوشپ کی تکمیل کے بعد لندن کے کالج آف ڈی لوجسٹ سے وی آر فلیو شپ کیا۔ آئرلینڈ اور برطانیہ میں تقریباً ۶ سال تک پریکٹس کرنے کے بعد ۲۰۰۰ء سے پاکستان میں پرائیویٹ پریکٹس کر رہے ہیں۔ آپ کے والد اور ایک بھائی بھی آنکھوں کے ماہر ڈاکٹر ہیں۔

آئیے بات کرتے ہیں

کتابیں سبھی پڑھے لکھے پڑھتے ہیں، ہاں کچھ کتابیں اپنے آپ کو پڑھوا بھی لیتی ہیں۔ کچھ کو ہم بھول جاتے اور کچھ یاد رہتی ہیں۔ کچھ کتابوں کا نام، موضوع، فکر، خیال اور انداز اِس قدر جاندار ہوتا ہے کہ اُنگلی پکڑے ساتھ لیے جاتی ہیں۔

اِس ماہ کا موضوع ایسی ہی شاندار کتابوں کے حوالے سے ہے

اس ماہ کا موضوع

- آپ کی زندگی میں آنے اور حیران کرنے والی کتاب کون سی ہے؟
- اُس نے آپ کی سوچ کیسے بدل دی؟
- اُس کتاب کی کون سی خاص بات ابھی تک یاد ہے؟

آپ کے جوابات ایک صفحے پر مشتمل آپ کی تصویر کے ساتھ ہمیں ۱۸/مارچ ۲۰۱۲ء سے پہلے مل جانے چاہئیں۔ آپ ہمیں جوابات editor@urdu-digest.com پر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ بذریعہ ڈاک بھجوانے کے لیے پتا نوٹ کر لیں۔

مدیر اُردو ڈائجسٹ
325/G-III جوہر ٹاؤن لاہور

DRAFT NOTICE INVITING TENDER

1. Sealed tenders are invited on item rates based on Market Rates System from the approved Contractors of Irrigation Department who have got their names enlisted / renewed in the appropriate category for the current financial year 2011-12.
2. The tenders on Form I.B will be received by the tender opening committee constituted by the Secretary Irrigation Department on 10.03.2012 at hours 11:00 AM in the office of the Executive Engineer, Khanwah Division DCC Depalpur. The tender will be opened and received by the tender opening committee on the same date and time in the presence of the Contractors or their authorized representative who care to remain present at the occasion.
3. The blank Tender Form can be purchased from the office of the Executive Engineer, Khanwah Division DCC Depalpur up to 09.03.2012 during office hours at the non refundable cost mentioned against work. No tender form will be sold on date of receipt of tenders. No tender except, those purchased from this office will be entertained / accepted.
4. The contractors / Firms who desire to obtain tender forms shall have to furnish the original documents to the Executive Engineer, Khanwah Division DCC Depalpur, regarding enlistment / renewal of their names with Irrigation Department and Pakistan Engineering Council for the current Financial Year 2011-12. Government receipts for payment of professional tax, enlistment / renewal fees etc and any other documents to his entire satisfaction along with copies of all documents duly attested by Gazetted officer. The Executive Engineer, Khanwah Division DCC Depalpur shall issue the tender form after verification of all documents.
5. All the bidders should satisfy themselves about site location, conditions prevalent at site and its accessibility because successful bidders will have to mobilize to site of work within 7-days after issuance of acceptance letter from office of the Executive Engineer, Khanwah Division DCC Depalpur.
6. The successful bidder shall have to execute the agreement with the Executive Engineer, Khanwah Division DCC Depalpur within 7-days of issuance of acceptance letter. The mobilization period is restricted to 7-days. The successful bidder is bound to deposit additional performance security equal to amount of bid if is more than 5% below of the sanction amount from any scheduled Bank or cash with the Office of the Executive Engineer, Khanwah Division DCC Depalpur. He will have to furnish a list of the site Engineer / technical staff to be deployed by him on the project before start of work at site.
7. The work will be executed according to the approved Design / Drawings by the competent authority and specification.
8. The tenders must be delivered by intending bidders in person or their authorized agents to the Tender Opening committee in sealed envelope. Any tender received by post shall not be entertained.
9. The conditional incomplete and overwritten tenders by the bidders will be liable to

rejected. The tender opening committee reserves the right to accept / reject any or all tenders without assigning any reason.
10. Earnest money @ 2% of the estimated cost as specified against the work in shape of deposit at call drawn in favour of the Executive Engineer, Khanwah Division DCC Depalpur from a scheduled bank must be accompanied with tender, failing which tender will not be entertained.
11. The successful bidder shall have to submit construction schedule within specific mobilization period for approval and will abide by the approved construction schedule thereof. In case of failure the contractor will respective to pay for the lost benefits, damages it occurred during execution and additional cost for the said work.
12. The contractor will establish all type of material testing lab for all type of relevant tests etc, in case of failure the contractor will be responsible to bear the cost of testing material from other sources.
13. The case of any dispute, the case will be referred to the Superintending Engineer, Depalpur Canal Circle Lahore, whose decision will be final and binding on both the parties.
14. The Engineer in-charge reserves the rights to drop / reduce / increase any work to any extent at any time as per site conditions or requirement without assigning any / reason.
15. The payment will be made according to the actual work done subject to the clearance by the consultant / Departmental committee or other agencies and subject to availability of funds.
16. The contractors will have no right to claim any interest on account of delay in making payment for the work done because of done receipt of funds well in time.

Sr.#	Name of work	T.S. Estimate		Earnest money @ 2% of bid price (in Rs:)	Tender Fee (in Rs:)	Completion period
		S.E, DCC Lahore No. & date	Cost (in Million)			
1	Lining of Mancharian Minor RD: 0+000 – 21+030 (Tail).	1107/69-W dated: 22.02.2012	21.452	429100	10727	3 ½ (Months)

Executive Engineer
Khanwah Division DCC
Depalpur
23-02-12

IPL # 2492

اپنا وزن سنبھالیے

اُردو ڈائجسٹ کا ایک اور قابلِ قدر سلسلہ

وزن کم کریں مگر صحت نہیں

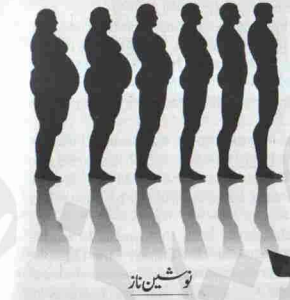

نوشین ناز

ہمیں آپ کی صحت ہی کی نہیں وزن کی بھی فکر ہے

آج کی خوبصورت، کامیاب اور بے پناہ مصروف زندگی میں ہر کام کے لیے وقت مل جاتا ہے، سوائے اپنی صحت اور وزن پر دھیان دینے کے..... پھر جب جوڑوں کے درد، شوگر، دل کے امراض جسم کا راستہ دیکھ لیتے ہیں تو جینا اور خوش رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ممتاز ماہرِ غذائیت نوشین ناز صاحبہ نے ہماری درخواست پر اس سلسلے کو باقاعدگی سے کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے

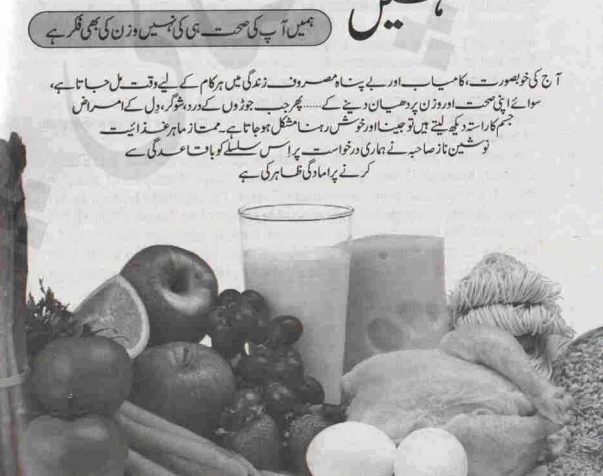

زندگی

کی سب سے بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت صحت ہے۔ اگر یہ نہیں تو کوئی بھی خوبصورتی چاہے وہ جسمانی ہو یا پھر مناظر کی، اچھی نہیں لگتی۔ اس لیے میں اپنے سب مریضوں کو کہتی ہوں کہ وزن کم ضرور کریں لیکن صحت کے ساتھ۔ کیا فائدہ آپ کے بال جھڑ جائیں، چہرہ بوڑھا دکھائی دینے لگے اور آپ خود کو اندر سے ہر وقت کمزور محسوس کریں۔ زندگی تو صحت کے ساتھ ہی پُرلطف ہو سکتی ہے، اس لیے اپنی صحت بہتر بنائیں۔ آپ کا جسم خود بخود بہتر ہو جائے گا کیونکہ مٹاپا بھی ایک بیماری ہی ہے۔

کئی قارئین نے شام کو یا اتوار کو فون کرنے کی اجازت مانگی ہے۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ براہِ کرم اتوار کو تو بالکل فون نہ کریں۔ پورا ہفتہ اس قدر مصروف اور مشین کی طرح کام کرتے گزرتا ہے کہ خود مجھے آرام کا وقت نہیں ملتا۔ میں چونکہ صبح شام ایروبکس کی کلاس بھی کرواتی ہوں تو دورانِ کلاس فون نہیں سن سکتی۔ ہاں ۱ر سے ۲ بجے تک میرا کلینک ٹائم ہے اور میں نے اُردو ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے اِن اوقات میں رابطہ کرنے کی سہولت رکھی ہے۔ فون ملانے سے پہلے مناسب ہوگا آپ اپنا ایک سوال پہلے سے سوچ لیں۔ اپنی خواہش اور مطلوبہ وزن لکھ لیں تو زیادہ اچھا ہے۔ فون کرتے ہی پہلے مطلوبہ معلومات یعنی اپنا قد، عمر، وزن، کوئی جسمانی مسئلہ، پہلے سے جاری معمول اور اب کیا خواہش ہے، بتا دیں۔

میرے لیے دوسروں کی راہ نمائی بے شک خوشی کا باعث ہوتی ہے کیونکہ جب جب مریض ٹھیک ہو کر اور اپنا مطلوبہ وزن پا کر خوشی سے فون کرتے اور ان کے پیارے دُعائیں دیتے ہیں تو یوں سمجھیں اللّٰہ رب العالمین کی دی ہوئی صلاحیت اور علم کے سچے اور صحیح استعمال کا سکہ دوبالا ہو جاتا ہے۔

آپ کو حیرت ہوگی یہ وزن کی زیادتی ایسا ظالم فیشن ہے کہ جس نے بیسیوں لوگوں کی زندگی اَجیرن (مشکل) بنا رکھی ہے۔ بچیوں کے رشتے رُکے رہتے ہیں اور وہ مایوسی میں زیادہ کھا کھا کر اور موٹی ہو جاتی ہیں۔ شادی کے بعد مٹاپے کے باعث بے بی کنسیو کرنے میں مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے ہنستی بستی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ جب بدن بے ڈول اور بھدا ہوتا ہے چاہے مرد کا ہو یا عورت کا تو صرف جسم ہی نہیں تعلقات بھی بگڑ جاتے ہیں۔

لباس ہی نہیں میاں بھی تنگ ہو چکے

سب سے پہلے عائشہ کا سوال پیشِ نظر ہے، جو راولپنڈی سے تعلق رکھتی ہیں۔

میری عمر ۴۷ر سال، وزن ۹۵ر کلو اور قد ۵ر فٹ ۲ر انچ ہے۔ میں صبح کھانے میں پراٹھے کے ساتھ آملیٹ اور چائے چینی کے ساتھ لیتی ہوں۔ پھر دوپہر میں کچھ نہیں کھاتی اور رات میں ۲ر روٹیاں اور گھر کا سالن ہوتا ہے۔ اکثر بچے باہر سے کھانا لے آتے ہیں۔ مجھے پیزا اور شوارما بہت پسند ہے اور گاجر کا حلوہ بھی شوق سے کھاتی ہوں۔ بیکری کی اشیا اور گولیاں ٹافیاں پسند نہیں، لیکن حلوے سب پسند ہیں۔ میرا وزن سال میں ۱۲ر کلو بڑھا ہے۔ حالانکہ میں پہلے بھی اس طرح بلکہ اس سے زیادہ کھاتی تھی۔ براہِ مہربانی میری مدد کریں۔ میرے لباس سب تنگ ہو چکے ہیں اور اب تو میاں بھی تنگ آ کر خاصے بُرے ریمارکس پاس کرتے ہیں۔

(عائشہ۔ راولپنڈی)

عائشہ! میں آپ کے لیے اس لیے ڈائٹ پلان کر رہی ہوں کیونکہ ایک تو آپ نے سب کچھ سچائی سے بتایا ہے اور دوسرا آپ کے سوال کے ساتھ وہ ساری معلومات موجود ہیں جو مجھے پلان کرنے کے لیے درکار ہوتی ہیں۔ میں اَدھوری معلومات کے ساتھ ڈائٹ پلان نہیں کر سکتی۔ اگر آپ کا کوئی جسمانی مسئلہ ہو تو وہ بھی براہِ کرم آپ لوگ ضرور لکھ بھیجا کریں۔ عائشہ آپ کے لیے میں جو ڈائٹ پلان کر رہی ہوں اگر آپ اسے مستقل مزاجی اور

پورے یقین کے ساتھ اختیار کریں گی تو اِن شاء اللہ آپ کو فائدہ ہوگا۔

صبح ۶/بجے: ایک چکوترا (Grape Fruit)

۸/بجے: ۲/براؤن سلائس ایک انڈے کی سفیدی اور براؤن شکر کے ساتھ چائے لیں۔

دوپہر ۱۲/بجے: ۲/امرود

۲/بجے: گھر کا بنا سالن چھوٹی کٹوری اور ایک پھلکا اور سلاد کی ایک کٹوری

۳/بجے: گرین ٹی

۴:۳۰/بجے: چائے کے بعد ۳/بادام

۶/بجے شام: چھوٹی پیالی بغیر بالائی دودھ

۸/بجے: بھاپ میں پکی سبزیوں کے ساتھ ایک پھلکا

رات ۹/بجے: ایک پیالی گرین ٹی

کوشش کریں رات کے کھانے کے بعد نماز پڑھیں اور سجدے رکوع توجہ سے ادا کریں۔ کبھی آپ نے سوچا کہ ہماری عشاء کی نماز سب نمازوں سے لمبی کیوں ہوتی ہے؟ یہ اتنی بڑی سائنس ہے اگر آپ اس پر عمل کر لیں تو کبھی بھی آپ کو کوئی جسمانی مسئلہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی قدرتی طور پر عبادت میں روحانی ہی نہیں جسمانی مسائل کے بھی حل دے رکھے ہیں۔ کوشش کر کے دن میں ایک گھنٹہ پیدل چلیں اور کم از کم ۶ سے ۸/گلاس پانی پئیں۔ خوش رہیں اور دوسروں کے لیے خوشی کا باعث بنیں۔ پھر دیکھیں وہ معجزہ جو کہ اس وقت ناممکن لگ رہا ہے۔

☆☆

جسم پر ہی نہیں، دِل پر بھی بوجھ ہے

میری عمر ۳۷/سال، وزن ۶۲/کلوگرام اور قد ۵/فٹ اور ۳/انچ ہے۔ میں شادی شدہ ہوں اور ۳/بچے ہیں۔ میرے آپریشن ہوئے۔ میں صبح ۶/بجے اٹھتی ہوں، نماز پڑھنے کے بعد ڈیڑھ گلاس پانی پیتی ہوں۔ اگر کھانا نہ کھاؤں تو دودھ کی پیالی پی لیتی ہوں۔ باقاعدگی سے پیدل چلتی ہوں مگر وزن کم نہیں ہو رہا۔ وزن سے جسم پر ہی نہیں دِل پر بھی بوجھ ہے۔

(اُم ہادی۔ میانوالی)

آپ کا وزن ۱۰/کلو زیادہ ہے۔ لیکن ۶/کلو بھی کم کریں گی تو صحت مند ہو جائیں گی۔

آپ صبح اٹھتے ہی آدھے گھنٹے کے اندر ایک کیلا کھالیں۔

پہلا کھانا، ۶/بجے: کیلا/اورنج

۷/بجے: سیب کا سرکہ اور لہسن کے ۲/جوئے

ساڑھے ۷/بجے: ایک ابلا انڈا اور چائے کی ایک پیالی

۱۱/بجے: ۲/امرود

دوپہر ۲/بجے: ایک چھوٹی کٹوری گھر کا سالن اور ایک پھلکا اور سلاد

۴/بجے: چائے کے ساتھ ایک ویٹ بسکٹ

۶/بجے شام: بالائی کے بغیر دودھ کی ایک چھوٹی پیالی

۸/بجے: ۲/شامی اور ٹماٹر کی سلاد، گرین ٹی کی ایک پیالی

اگر بھوک محسوس ہو تو ایک پھل مزید کھا سکتی ہیں اور اپنی ورزش ایک گھنٹہ ذرا تیز قدم کے ساتھ کریں۔

☆☆

۱۸/سال میں ۵۵/کلو وزن

میری عمر ۱۸/سال ہے۔ ۵۵/کلوگرام وزنی ہو گئی ہوں۔ قد ۵/فٹ ۵/انچ ہے۔ میں بہت شدت سے وزن کم کرنا چاہتی ہوں، مجھے کتنا وزن کم کرنا ہوگا۔

(زرینہ۔ بہاولپور)

آپ کا وزن کم کرنے کا ہدف ۳/کلو تک ہے اور آپ بہت آسانی سے کر سکتی ہیں۔ بس اپنی طرزِ زندگی میں قدرے تبدیلی لائیں۔ بازاری کھانوں سے پرہیز کریں۔ آپ کی عمر کم ہے۔ اس عمر میں میٹابولزم بہت تیز ہوتا ہے جو کہ آپ کو وزن کم کرنے میں جلد مدد دے گا۔ آپ ایک گھنٹہ پیدل چلیں۔ اپنے کھانوں میں سبزیوں کا استعمال کریں۔ جب بھوک زیادہ لگے تو پھل استعمال کریں۔ پانی کا استعمال زیادہ کریں۔ آپ کو پروگرام یا پلان نہیں دے رہی۔ آپ ایک ماہ تک کھانے کا معمول بدل کر مجھ سے رابطہ کریں۔ تب تک بازاری چیزوں سے مکمل پرہیز کریں اور اس پرہیز کو زندگی کا حصہ بنا لیں۔ تبھی آپ صحت مند طرزِ زندگی اپنا سکیں گی۔

☆☆

یہ تھے اس بار کے ۳/منتخب سوال۔ بے شمار قارئین نے فون پر ہی راہ نمائی لے لی تھی۔ آپ بھی 0301-4585405 پر روزانہ ۱۲/بجے سے ۲/بجے تک رابطہ کر سکتی ہیں۔ یہ میرا کلینک کا وقت ہوتا ہے۔ شام میں ہیلتھ ایروبکس کلاسز لیتی ہوں، اس لیے فون نہیں سن سکتی۔ یاد رکھیے.....! ہر ڈائٹ پلان ہر کسی کے لیے موزوں نہیں ہوتا۔ یہ باقاعدہ قد، عمر، وزن اور فزیکل ایکٹیوٹی (جسمانی سرگرمیوں) کے لحاظ سے بالکل دوا کی طرح تجویز کیا جاتا ہے۔ مشورے کے بغیر استعمال سے مطلوبہ فوائد اور ہدف حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں کو بھی مٹاپے سے شدید مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں کولیسٹرول کی سطح بڑھ جاتی ہے، شریانیں تنگ ہوتی ہیں تو دل کے دورے کے امکانات اور خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ ذیابیطس، جوڑوں کا درد الگ سے زندگی تنگ کر دیتے ہیں۔

میں اپنے نئے نئے تجربات اور دنیا بھر میں اس وُسعت پذیر علم کے حوالے سے کی گئی تحقیق سے بے حد فائدہ اٹھاتی ہوں۔ پھلوں کی تعداد اور مقدار سے لے کر خوراک میں معدنی اجزا کی کمی بیشی سے بہت اچھے نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ ماشاء اللہ میری فائل اپنے کلائنٹس کی صحت کے حوالے سے اس قدر قیمتی مشاہدات اور تجربات سے بھر گئی ہے کہ ایک اثاثہ کی طرح اہم ہو گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی میں کسی بھی کام کو شوق بنا لیا جائے اور پھر اس میں مسلسل سوچنا، غور کرنا، تحقیق و جستجو کرنا جاری رکھا جائے تو بے حد عمدہ نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

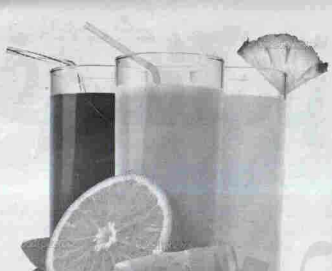

ایک زمانے میں لوگ مذاق میں کہا کرتے تھے کہ کبھی یہ وقت آئے گا کہ ہر چیز کے مخصوص معالج ہوا کریں گے۔ یہاں تک کہ ناک کے دائیں حصے کا مخصوص معالج بائیں حصے کی طرف توجہ نہیں کرے گا اور اس میں حرفِ آخر ہوگا۔ مجھے لگتا ہے اپنے اپنے شعبے میں ہم جہاں جہاں بھی ہوں جو کام بھی کر رہے ہوں، اس پر ہماری گرفت اس کا گہرا علم اور اس میں ڈوب کر کام کرنا ہمیشہ خوشی، عزت اور برکت کا باعث ہوگا۔ اس دعا کے ساتھ اجازت دیجیے کہ اللہ ربِ العالمین آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور صحت کی دولت سے پوری طرح ہم کنار کرے۔ کیونکہ غور کیجیے تو علم ہوگا کہ اچھی صحت بذاتِ خود کوئی شے نہیں ہے۔ اچھی صحت پا کر اپنے خاندان اور عام مخلوق کی بھلائی کے لیے اچھے اچھے کام کیجیے۔ خالق کو یہی پسند اور مطلوب ہے اور سنا ہے اسی کا حساب کتاب بھی ہوگا کہ اچھی صحت دی تھی۔ اس کا کیا کیا۔ کن کاموں میں کھپا دی..... سدھارنے والی زندگی ملنے سے پہلے ایک لازم سوال صحت کا ضرور ہوگا ضرور.....

یہی ہے قصۂ کوئز

دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ، یہی ہے اِس کوئز کا اصل مقصد

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

قصۂ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے اپنے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اُکسانا اور زندگی کو بامقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ اس کی سرخیلی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو پڑھیے اور پڑھنے کے آخر میں دیے گئے ۳ سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جواب دینے والے زیادہ ہوئے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور وہ خوش نصیبوں کو ''اُردو ڈائجسٹ'' کے ۶ شماروں کی انعامی و اعزازی ترسیل کے علاوہ اسی شمارے کی شاعری کی ۲ دو خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجنے کا پتہ: **مدیر ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ** 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور

گزشتہ ماہ قصۂ کوئز کے درست جوابات دینے والوں کے نام:

مریم ضیاء بنت محمد ضیاء اللہ (لاہور)، ڈاکٹر منیر احمد بھنڈر (لاہور)، محمد عرفان (لاہور)، پروفیسر محمد طاہر (سرگودھا)، محمد حمزہ قادری (حیدر آباد)
فخر النساء بنت خالد محمود (جگہ نامعلوم)، محمد خلیل چودھری (ضلع جہلم)، اقبال احمد خان (کراچی)
حبیب اللہ خان سعدی (ضلع جھنگ)، اویس علی (فیصل آباد)

گزشتہ ماہ کے درست جوابات

سوال ۱/ عطاء اللہ شاہ بخاری (ب) ملتان
سوال ۲/ قائداعظم محمد علی جناح (ب) پاکستان بنایا
سوال ۳/ انگلستان (ب) ڈاکٹر ایڈورڈ جنر
سوال ۴/ سنگیکین (ب) غرنی
سوال ۵/ جون آف آرک (ب) زندہ جلا دی گئی

قرعہ اندازی کے ذریعے جنوری ۲۰۱۲ء قصۂ کوئز میں انعام پانے والے خوش نصیبوں کے نام
پروفیسر محمد طاہر (52 سلطان کالونی، کالج روڈ، سرگودھا)
محمد حمزہ قادری (C/17-1194، افسر علی شاہ پلازا، کھاتہ چوک، بالمقابل مکہ مسجد، حیدر آباد)
آپ دونوں کو انعام مبارک ہو

قصۂ کوئز ۱/

(۱) ۱۷۱۱ء کا واقعہ ہے جب اس نے افریقا میں اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑنے کے بعد اس آبنائے کو عبور کرنے کا فیصلہ کیا جو افریقا اور یورپ کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتی ہے۔ اس کے ساتھ عربوں اور بربروں پر مشتمل بہار سپاہیوں کی ناقابل تسخیر فوج تھی۔ اس کا ہدف سمندر کے پار والا علاقہ تھا۔ سمندر کی تند و تیز موجوں سے لڑتے ہوئے آخر کار آبنائے کو کامیابی سے عبور کرلیا گیا۔ اس سے قبل کہ وہ فوج کی صفوں کو ترتیب دیتا اور لشکر کشی کرتا، اس نے محسوس کیا کہ فوج کے بعض افراد مہم کو خطرناک اور ناقابل فتح سمجھ رہے ہیں۔ لہٰذا اس نے ایک عجیب و غریب حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے اپنی تمام کشتیوں کو نذر آتش کردیا۔ اس کے بعد اس نے ایک سحر انگیز تقریر کی جس نے پوری فوج کے جذبوں میں تلاطم پیدا کردیا۔ اس نے کہا ''یاد رکھو! تمھارے سامنے دشمن ہے اور تمھارے عقب میں سمندر، تمھارے سامنے بھی موت ہے اور پیچھے بھی موت، تو پھر کیوں نہ ہم آگے بڑھ کر اس دلیری سے لڑیں کہ دشمن بھاگ کھڑا ہو۔ یاد رکھو یہ پوری زمین اللہ کی ہے اسی لیے میں یہ کہتا ہوں کہ زمین کا ہر خطہ ہمارا خطہ ہے۔'' اس کے بعد پوری فوج نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے کہ جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ مسلمان غالب آئے اور دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔

(الف) بتائیے یہ کس فاتح جرنیل کا ذکر ہے؟
(ب) مسلمانوں نے یورپ کا کون سا شہر فتح کیا؟

قصۂ کوئز ۲/

(۲) ۱۹۱۰ء میں انگلستان میں ''جوہن ورلڈ لنگ چیمپئن شپ'' کا آغاز ہوا۔ ۲۸ سالہ ہندوستانی پہلوان بھی اس چیمپئن شپ میں شرکت کرنے پہنچا مگر چھوٹے جسم کے باعث اسے مقابلے کے لیے غیر موزوں قرار دے کر خارج کردیا گیا۔ جیوری کی رائے اسے اپنے لیے ذلت اور رسوائی کا فیصلہ محسوس ہوئی۔ اس نے اعلان کردیا کہ جو پہلوان اس کے سامنے مسلسل ۵/منٹ تک ٹک کر دکھائے گا وہ اسے ۳/ پاؤنڈ بطور انعام دے گا۔ یکے بعد دیگرے ۳/ پہلوان آئے اور باری باری چت ہوتے رہے۔ پھر اس چیمپئن شپ کے مشہور پہلوان اکھاڑے میں اترے مگر کوئی بھی ۲/ یا ۳/ منٹ سے زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا۔

اس واقعے کے بعد اس کے نام کا شہرہ چار سو پھیل گیا۔ مجبوراً جیوری کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنا پڑا۔ اس چیمپئن شپ میں اس کی سب سے مشہور کشتی پولینڈ کے مشہور پہلوان ''زبیسکو'' سے ہوئی۔ اس نے چند سیکنڈ میں ''زبیسکو'' کو زمین پر دے مارا مگر کشتی کا فیصلہ نہ ہوسکا۔ لہٰذا کشتی کا ایک اور دن رکھا گیا۔ اس روز پولینڈ کا پہلوان بھاگ گیا اور مقابل نہ آیا۔ اس طرح ''جوہن بل بیلٹ'' ہندوستانی پہلوان نے جیت لی۔ اس نے ۳۰ سال سے زیادہ عرصے تک اکھاڑے پر اپنی اجارہ داری قائم رکھی۔ ایک ہزار سے زائد پہلوانوں سے کشتیاں لڑیں اور کبھی شکست نہ کھائی۔

(الف) اس ناقابل شکست پہلوان کے اصل اور معروف نام، دونوں بتائیے۔
(ب) ان کا تعلق ہندوستان کے کس علاقے سے تھا۔

قصۂ کوئز ۳/

(۳) پاکستان قائم ہوئے ابھی سال بھر بھی نہیں ہوا تھا کہ کشمیر میں بھارتی فوج کے ایک دستے نے فوجی اہمیت کی ایک پہاڑی پر قبضہ کرلیا۔ پاکستانی فوج کی پنجاب رجمنٹ کو پہاڑی واپس لینے کی مشکل مہم ملی۔ پنجاب رجمنٹ کی جس کمپنی کو پہاڑی کا قبضہ واپس لینے کے لیے بھیجا گیا، یہ نوجوان اس کمپنی کا کمانڈر تھا۔ ۲۷/جولائی ۱۹۴۸ء کو وہ اپنی کمپنی کے جوانوں سمیت آگے بڑھا۔ نصف شب گزر جانے کے بعد سخت اندھیرے اور دشوار راستوں کی تکلیف کے باوجود آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ دشمن کے مورچوں سے بہ مشکل تمام ۵۰ گز کے فاصلے پر جا پہنچا۔ کسی آہٹ سے دشمن بیدار ہوگیا اور اس نے اندھا دھند فائرنگ شروع کردی۔ فائرنگ کے باوجود آگے بڑھنے کا سحر جاری رہا۔ اس کا بازو گولی لگنے سے سخت زخمی ہوا مگر اس نے پروا نہ کی۔ خاردار تاروں نے اسے لہو میں نہلا دیا اور آخر کار وہ شہید ہوگیا لیکن آخری سانس تک آگے بڑھنے کا سفر جاری رکھا۔

اس کی شہادت کے بعد جانثار ساتھیوں نے دلیری اور شجاعت کا ایسا مظاہرہ کیا کہ دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔ پہاڑی واپس لے لی گئی۔ شہید کمانڈر کو بعد از شہادت ملک کا سب سے بڑا فوجی اعزاز عطا کیا گیا۔

(الف) ہم کس بہادر، جواں مرد شہید کا ذکر کررہے ہیں؟
(ب) انھیں شجاعت کا کون سا تمغا اور ترتیب میں کس نمبر پر دیا گیا؟

ٹینڈر نوٹس

زیرِ دستخطی پبلک ہیلتھ انجینئرنگ ڈویژن/سب ڈویژن کے منظور شدہ ٹھیکیداران/فرمیں جنہوں نے اپنے ناموں کا اندراج/تجدید کروائی ہے اور اپنی اندراجی/تجدیدی فیس برائے سال 2011-12 جمع کروادی ہے سے مندرجہ ذیل کاموں کے لئے معاقدہ کوارٹر کے مارکیٹ ریٹس شیڈول/آئٹم ریٹس کی بنیاد پر سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں۔

ٹینڈر دستاویز زیرِ ڈویژنل ہیڈکلرک سے تحریری درخواست (فرم کے لیٹر پیڈ پر) مع اصل دستاویز برائے اندراجی/تجدیدی لیٹر ہائے آرسکاری رسید بضمن ادائیگی فیس اور مروجہ ٹینڈر فیس کی ادائیگی مع زر بعانہ کے مساوی 2% ڈیپازٹ کال بجنٹ ایگزیکٹیو انجینئر، پبلک ہیلتھ انجینئرنگ ڈویژن خانیوال پیش کرنے پر حاصل کرسکتے ہیں۔ ٹینڈر مورخہ 15-03-2012 کو جاری کئے جائیں گے اور مورخہ 17-03-2012 کو دوپہر 2:00 بجے دفتر ہذا واقع 27/A، گلبرگ ٹاؤن، خانیوال میں موقع پر موجود ٹھیکیداران یا ان کے مجاز نمائندوں کی موجودگی میں درج ذیل شرائط پر وصول کئے/کھولے جائیں گے۔

ٹینڈر فارمز ان ٹھیکیداروں/فرموں کو جاری کئے جائیں گے جو اپنے ہمراہ (Power of Attorney) اتھارٹی لیٹر، اندراج/تجدیدی فیس برائے سال 2011-12 جمع کروانے کا ثبوت ساتھ لائے گا۔ ڈویژنل ہیڈکلرک کو ٹینڈر کی کاسٹ (ناقابل واپسی) نقد ادا کرچکے ہوں گے۔ اگر ٹینڈر کی کاسٹ 5 فیصد کم ہوئی تو اس کو پرفارمنس سیکیورٹی 5 فیصد کسی بھی شیڈیولڈ بنک میں بنام زیرِ دستخطی جمع کروانا ہوگی جو کہ کام کی تکمیل کے بعد واپس کردی جائے گی۔ 15 دنوں کے اندر رجع کروانے میں ناکامی کی صورت میں پرفارمنس سیکیورٹی ٹینڈر مسترد/اور زر بعانہ ضبط کرلی جائے گی۔

سادہ فارم دفتر ہذا کے ہیڈکلرک سے ہرکام کے مقابل درج فیس ناقابل واپسی ادائیگی پر دفتری اوقات میں حاصل کرسکتے ہیں۔ تاریخ وصولی کے دن کوئی ٹینڈر فروخت نہیں کیا جائے گا۔ بذریعہ ڈاک یا دیگر کسی ذریعے سے وصول ہونے والی پیشکشیں/ٹینڈر زقبول نہیں کئے جائیں گے۔ مشروط، نامکمل اور اوور رائٹنگ والے ٹینڈر زاپیشکشیں مسترد کردی جائیں گی۔ زیرِ دستخطی بالاختیار ہے کہ بلاوجہ کسی ایک یا تمام ٹینڈر زکو قبول یا مسترد کردے۔

نمبر شمار	نام سکیم	تخمینہ لاگت (ملین)	سیکورٹی اور ضمانت 2%	ٹی۔ایس نمبر اور تاریخ	ٹینڈر فیس
۱	تعمیر/ٹف ٹائل، کھالہ، سوئنگ اور نالی بلاک نمبر 5 اینڈ جیس آباد خانیوال۔	1.848	0.037	EE, PHE Division Khanewal No. 951 dated: 23-02-2012	-/924روپے
۲	تعمیر/ٹف ٹائل، سوئنگ اور نالی گرین ٹاؤن اینڈ بخاب پمپ خانیوال۔	1.534	0.031	EE, PHE Division Khanewal No. 955 dated: 23-02-2012	-/767روپے
۳	تعمیر/ٹف ٹائل شاہدان ٹاؤن اینڈ پرانا خانیوال، تحصیل/ضلع خانیوال۔	1.390	0.028	EE, PHE Division Khanewal No. 959 dated: 23-02-2012	-/695روپے
۴	تعمیر کھالہ، سوئنگ اور نالی بستی احمد گھر اینڈ بانی سیال، تحصیل/ضلع خانیوال۔	1.022	0.020	EE, PHE Division Khanewal No. 963 dated: 23-02-2012	-/511روپے

کچھ آسامیاں ورک چارج سپروائیزر برائے سپروژن برائے کام دکار ہیں دفتر زیرِ دستخطی میں درخواستیں وصول کرنے کی آخری تاریخ 15-03-2012 مقرر ہے۔

ملک محمد فراز
ایگزیکٹو انجینئر
پبلک ہیلتھ انجینئرنگ ڈویژن
خانیوال۔

IPL # 2591

زندگی کی سب سے قیمتی متاع اچھی کتاب سے زیادہ کچھ اور نہیں

مطالعے کی میز پر

آیئے..... !کتابوں کی صحبت میں کچھ وقت گزاریئے یہ کالم آپ کو کتابوں پر تبصرے سے کافی مختلف لگے گا۔ اس میں کتاب اور صاحب کتاب دونوں کا تذکرہ رہے گا اور ہر بار خود فکر کے لیے کچھ موتی آپ کی نذر کرتے رہیں گے

نوید اسلام صدیقی

ادب زندگی کا حسن ہے۔ اسی سے زندگی کی تہذیب ہوتی ہے اور مہذب معاشرے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کی خوبصورت تحریروں سے بہتر کوئی اور چیز زندگی کو خوبصورت بنانے والی نہیں ہوتی۔ ایسے اہل قلم کی تخلیقات نہ صرف زندہ رہتی بلکہ ہمیشہ تر و تازہ رہتی ہیں۔ ایسی ہی مثبت سوچ رکھنے والے اہل قلم کی بلند پایہ کتب کا تعارف آپ سے کرواتے ہیں

شعورِ حیات

کئی کتابیں اس قابل ہوتی ہیں کہ قاری انہیں خوبصورت سے خوبصورت انداز میں دیکھنا چاہتا ہے۔ بلا مبالغہ محمد یوسف اصلاحی کی تحریر کردہ کتاب شعورِ حیات کے بارے میں بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے۔ قبل ازیں یہ کتاب تین حصوں میں شائع ہوتی رہی ہے لیکن اب تمام مضامین کو اعلیٰ معیاری گیٹ اپ اور سیٹ اپ کے ساتھ ایک جلد میں جمع کردیا گیا۔

مولانا یوسف اصلاحی کو اللہ تعالیٰ نے زبان و بیان پر ایسا عبور دیا ہے کہ اُن کی تحریر سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔ آپ نے اپنی بات سمجھانے کے لیے قرآن و حدیث کو ہر جگہ اپنے پیش نظر رکھا، نیز دلچسپ واقعات و امثال کتاب میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ آپ کی دلچسپی کے لیے کچھ واقعات ذیل میں درج کیے جارہے ہیں:

علامہ اقبالؒ نے زندگی کے آخری ایام میں اپنے ایک عزیز کو قبول اسلام کے واقعات جمع کرنے اور کتاب ترتیب دینے کا مشورہ دیا اور پھر خود ہی دو نہایت مؤثر واقعات بھی سنائے۔

”بمبئی میں کسی خوش حال مسلمان نے اپنے حلقۂ تعارف کے کچھ اونچے لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ ان میں ایک عیسائی انگریز بھی تھا۔ دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے چنے ہوئے تھے اور قاب میں پلاؤ بھی تھا، عیسائی انگریز نے پلاؤ نہایت شوق سے کھایا، کھانے سے فارغ ہوگئے اور گفتگو چھڑی تو انگریز عیسائی نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ صاحب خانہ سے درخواست کی کہ مجھے

میں عیش وعشرت اور آرام و آرایش کا ہر سامان موجود تھا، اونچی سوسائٹی میں عزت حاصل تھی۔ ایک دن یہی افسر گھر آئے تو ان کی بیوی نے کہا، میں نے تو اسلام کا کلمہ پڑھ لیا، آپ بھی پڑھ لیجیے اور اپنے اللہ سے ہی بندگی کا عہد کیجیے۔

افسر دیر تک بیوی کا منہ تکتے رہے، پھر بولے آخر کیوں؟ اس انقلاب کی وجہ کیا ہے؟

بیوی نے کہا ''ہمیں دنیا کی ہر نعمت حاصل ہے، زیور کی کمی ہے نہ زرق برق لباس کی، پھر جن لوگوں سے ہمارا رابطہ ہے، وہ بھی خوش حال اور دولت مند ہیں، میں جس تقریب میں بھی گئی بے فکری کے قہقہے سنے، زرق برق لباس دیکھے، سونے کے زیور دیکھے، عیش کے نغمے سنے، لیکن یہ عجیب وغریب بات ہے کہ پھٹے کپڑوں اور ٹوٹی چپلوں میں آنے والی غریب دھوبن کی زندگی میں جو اطمینان، سکون اور خوشی میں نے دیکھی، وہ مجھے کہیں دیکھنے کو نہیں ملی۔ میں اس سے پریشان حالی کی بات کرتی ہوں اور وہ نہایت اطمینان کے ساتھ مسکرا کر جواب دیتی ہے'' اللہ مالک ہے، اس کا بڑا شکر ہے، وہ بڑا مہربان ہے، اس کے شکر کا حق ادا نہیں ہوتا، بی بی کوئی فکر کی بات نہیں، سب کا اللہ مالک ہے۔''

اور میں سوچنے لگتی ہوں کہ جو خوشی اور اطمینان اس غریب اور خستہ حال دھوبن کو حاصل ہے، دنیا کی ہر چیز ہوتے ہوئے بھی مجھے وہ حاصل نہیں۔ ضرور یہ اس کے دین کی برکت ہے اور اس کا دین واقعی اللہ کا سچا دین ہے..... اسی لیے میں نے اپنے اللہ کا کلمہ پڑھا اور اس پر ایمان لائی۔ آپ بھی اپنے اللہ کا کلمہ پڑھیں اور اس پر ایمان لائیں۔''

ہندوستان کے مایۂ ناز محدث حضرت مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے ایک لائق شاگرد مولانا علی احمدؒ بھی حدیث پر گہری نظر رکھتے تھے، آپ نہایت ہی معمولی اور کمزور جثے کے مالک تھے۔ چھوٹا سا قد، سیاہی مائل رنگ، معمولی ناک نقشہ، کمزور و ناتواں، بظاہر ان کی شخصیت میں کوئی کشش نہ تھی۔

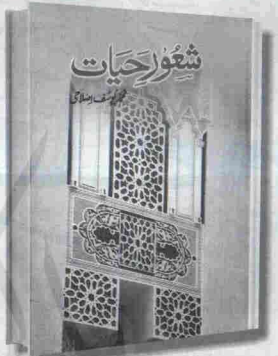

کلمۂ توحید پڑھا کر دائرۂ اسلام میں شامل کر لیجیے۔

صاحب خانہ حیران تھے عام قسم کی دعوت میں کس چیز نے انگریز کے دل کی دنیا بدل دی۔ اس نے حیرت ومسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سوال کیا، آپ کو کس چیز نے اس وقت متاثر کیا؟

''پلاؤ نے..... پلاؤ کھاتے وقت میرے ذہن نے یہ سوچا کہ جس قوم کا ذوق کھانے کے معاملے میں اتنا اچھا اور اونچا ہے، دین کے معاملے میں اس کا ذوق کتنا حسین اور بلند ہوگا۔ چنانچہ میرے دل نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا۔'' انگریز نے جواب دیا۔

حاضرین کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور سبحان اللہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ صاحب خانہ نے خوشی میں کہا ''پلاؤ زندہ باد''!

انگریز نے جواب دیا، ''نہیں اسلام زندہ باد!''

علامہ اقبالؒ نے اپنے عزیز کو دوسرا واقعہ سناتے ہوئے کہا:

''ایک غیر مسلم کسی اونچے عہدے پر فائز تھے، گھر

ایک دن دورانِ درس بڑے تاثر کے ساتھ مزے لے لے کر اپنا ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ واقعہ اس قدر سبق آموز تھا کہ آج تک اس کا اثر دل پر باقی ہے۔ مولانا نے بیان فرمایا:

''میں اعظم گڑھ میں مقیم تھا، عصر کی نماز پابندی سے شہر کی جامع مسجد میں پڑھتا تھا۔ نماز پڑھ کر جب مسجد سے نکلتا تو مسجد کی سیڑھیوں پر ایک نوجوان کھڑا ملتا، میں بے اختیار چند لمحے رک کر اسے رشک سے دیکھتا رہتا۔ نوجوان واقعی قدرت کا عجیب وغریب شاہ کار تھا، بلند و بالا قد، متناسب اعضا، سرخ و سفید کھلتا ہوا رنگ، دلکش ناک نقشہ، بہترین صحت۔

''میں اسے دیکھتا تو اپنا وجود نہایت حقیر معلوم ہوتا۔ احساسِ کمتری میں مبتلا، افسردہ اور مضمحل بوجھل قدموں کے ساتھ گھر کی راہ لیتا۔ راستے میں عجیب عجیب باتیں سوچتا۔ مجھے ایسا لگتا جیسے میرا دل حقیر اور اور معمولی جثے پر اللہ سے شکایت کر رہا ہو۔ میں کوشش کرکے خیالات جھٹک دیتا مگر اگلے روز یہ احساسات پھر کچھ اور زیادہ قوت کے ساتھ تازہ ہوجاتے۔

یہ سلسلہ ایک عرصے تک چلتا رہا۔ میں مسجد سے باہر آتا۔ نوجوان کھڑا ملتا اور میں اشتیاق سے اس پر نظریں جما دیتا۔ نوجوان کی شخصیت بڑی ہی دلآویز تھی، مگر اس نے کبھی مجھے نظر بھر کر نہ دیکھا، نہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی خاص فکر میں ہے۔ کبھی وہ فضا میں تاکتا جیسے اسے گہرے غم نے گھیر رکھا ہو، کبھی کسی سمت ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ آنے جانے والوں سے بالکل ہی بے نیاز اپنی فکر میں مگن ہے۔

کافی دن بعد ایک روز میں حسبِ معمول مسجد سے باہر آرہا تھا کہ یکایک وہ میری طرف لپکا۔ میں ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا۔ میرے دل کی دھڑکن کسی قدر تیز ہوگئی۔ جب وہ میرے قریب آیا تو مجھے اپنا بھدا اور کمزور وجود کچھ اور زیادہ حقیر معلوم ہونے لگا۔ نوجوان نے کسی تمہید کے بغیر بڑی عاجزی اور لجاجت سے کہا'' مولانا صاحب! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، مجھے کوئی دعا بتائیے یا کوئی تعویذ دے دیجیے۔ شاید اللہ مجھ پر کرم فرمائے۔''

میں حیرت سے اس کے بے خلاف توقع جیلے سنتا رہا۔ پھر میرے دماغ نے نہایت چابک دستی سے یہ فیصلہ کیا کہ نوجوان ضرور دل کے ہاتھوں مجبور ہے۔ مجھے دلچسپی ہوئی۔ میں نے اس کے حسین چہرے کی طرف نظر اٹھاتے ہوئے پوچھا ''بھائی آپ کس کام کے لیے دعا اور تعویذ مانگ رہے ہیں؟''

''مولانا صاحب! میرے جسم کے ایک ایک جوڑ میں درد ہے، نہ بیٹھ سکتا ہوں نہ کوئی کام کرسکتا ہوں..... برسوں سے علاج کرا رہا ہوں، سیکڑوں ڈاکٹروں اور حکیموں کو دکھا چکا مگر کوئی افاقہ نہیں..... روز بروز حالت خراب ہوتی جارہی ہے۔ گھر میں طبیعت گھبراتی ہے تو یہاں آکر کھڑا ہوجاتا ہوں۔ مولانا صاحب کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔ زندگی سے بیزار ہوں، مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میری زندگی میں کوئی سکھ نہیں۔'' نوجوان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے، آواز بھرا گئی اور کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہوگیا۔

''میں حیران وششدر یہ سب سن رہا تھا۔ کچھ دیر تو میں بت بنا خاموش کھڑا رہا اور پھر اسے کوئی جواب دیے بغیر اس طرح وہاں سے بھاگا جیسے میں نے کوئی بڑا جرم کیا ہو، میں نہایت تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ بے اختیار میری زبان پر شکر کے کلمات جاری تھے، آج مجھے اپنا مختصر سا وجود بڑا قیمتی محسوس ہورہا تھا۔ میری آنکھیں کھل گئی تھیں اور آج اللہ کے شکر میں میسر وہ لذت تھی جو اس سے پہلے مجھے کبھی میسر نہیں آئی۔''

ہدیہ: 550 روپے
ناشر: البدر پبلی کیشنز 23 راحت مارکیٹ
اردو بازار لاہور فون: 042-37225030

مایوس ہونا چھوڑیے

سویٹ مارڈن کی کتاب Coping With Despair کا یہ ترجمہ ڈاکٹر امجد علی بھٹی نے کیا ہے۔

ذیل میں کتاب سے کچھ منتخب تحریریں آپ کی دلچسپی کے لیے پیش ہیں۔

مسکرانا: جس طرح ہم کمانے کی طاقت بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں، اسی طرح ہمیں مسکرانے کی طاقت کو بھی بڑھانا چاہیے۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر انسان کو اُبھارنے والی طاقت کوئی اور نہیں۔ انسانی پریشانیوں کی اس سے بڑی دوا آج تک نہیں بن سکی۔

ہر طرح کے حالات میں لطف اندوز ہونے کی عادت اپنا لینے سے ہماری زندگی کی کایا ہی بدل جاتی ہے، ہم ہر بات، ہر چیز کو نئی روشنی میں دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ کوئی انوکھی عادت نہیں بلکہ خوش مزاجی کا ہی نیا رُوپ ہے۔ چھوٹے بچوں میں ہنسنے، کلکاریاں مارنے کی قدرتی عادت کو دبانے کی کوشش کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ بچوں کے چہرے پر سنجیدگی کی تو تمنا بھی نہیں کرنی چاہیے۔ کسی معصوم کے لٹکے چہرے کو کون دیکھنا پسند کرے گا؟ یہ تو قدرت کے اصولوں کے خلاف ہے۔

☆ نیکی کرنے کی عادت اپناؤ۔ ہر روز کسی نہ کسی کی مدد ضرور کرو۔ اگر کچھ اور نہیں کر سکتے تو کسی سے ہمدردی کے دو بول ہی بول لو۔ دو میٹھے لفظ بولنے سے تمہیں اپنی زندگی قابلِ فخر محسوس ہوگی۔

☆ دنیا میں پیسا ہی سب کچھ نہیں۔ بہت ساری چیزیں ایسی بھی ہیں جو پیسے سے بھی قیمتی ہیں۔ ان پر کچھ بھی خرچ نہیں ہوتا۔ انہیں دینے کے لیے صرف انسان میں دل چاہیے۔

☆ ضرورت سے زیادہ وقت کی پابندی بھی مصیبت بن جاتی ہے۔ خاوند گھر دیر سے آئے یا بچے سکول سے تاخیر سے آئیں تو کیا آفت آجاتی ہے؟ نوکر بازار سے کچھ لے کے آنے میں کچھ منٹ زیادہ لگا دے تو کون سا پہاڑ ٹوٹ جائے گا؟ اس قسم کی فکروں سے زندگی گزارنے کے لائق نہیں رہتی۔

☆ زندگی سے بہت کچھ لینا سیکھو۔ اس کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ کسی چھوٹی موٹی کامیابی کو لے کر مطمئن نہ ہو جاؤ۔ اپنی امیدوں کی جھولی ہمیشہ اتنی پھیلائے رکھو کہ وہ کبھی پوری طرح بھر نہیں پائے تاکہ آپ مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں۔

دنیا میں آج تک جتنی بھی ترقی ہوئی ہے اور تعلیم و تعلّم کی جتنی بھی نئی تحقیقات ہوئی ہیں، ان سب کے پیچھے سب سے بڑا سبب یہی رہا ہے۔ محققین اور ماہرینِ تعلیم نے کبھی اطمینان کا سانس نہیں لیا اور زندگی کی آخری سانس تک بے اطمینانی کی آگ لیے آگے لپکتے چلے گئے۔

ہم میں سے زیادہ تر لوگ اپنے اردگرد دیوارِ چین بنا لیتے ہیں۔ ایسا صرف ہماری غلط سوچوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہمارے چھوٹے اور گھٹیا کاموں کی وجہ سے ہوتا ہے اور دیوار میں چنی اینٹوں کے نام ہیں: شک، حسد، جلن، مایوسی اور وہم اور ان اینٹوں کی تعمیر ہوتی ہے فکرمندی کے گارے سے۔ یہ دیوار ہم اتنی اونچی بنا لیتے ہیں کہ سورج کی کرنوں کی روشنی ہم تک نہیں پہنچتی اور ہم ایک دم اندھیروں میں گھر کے رہ جاتے ہیں۔

ضمیر کی آواز: آپ کے اندر کی آواز سے بڑھ کے

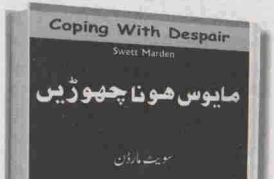

دنیا میں کوئی نہیں جس کے ساتھ آپ اپنی کارگزاری یا نکمے پن کا تجزیہ کر سکیں۔ آپ کچھ بھی کرنا چاہتے اور شش و پنج میں ہیں کہ کروں یا نہ کروں تو کسی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی کسی کے ساتھ مشورے یا حوصلہ مندی لینے کے چکر میں پڑیں، بس صرف اپنے اندر جھانک کے اپنے من کی بات پر کان دھریں۔

باطن کی منظوری حاصل کرنے کے لیے ایمانداری بہت ضروری ہے۔ ایمانداری نہیں برتیں گے تو روح کی منظوری نہیں ملے گی۔ بے ایمان آدمی کو بھی اس کا ضمیر ہر وقت کوستا رہتا ہے، لیکن وہ اپنے ضمیر کی پھٹکاریں سننے کا عادی ہو جاتا اور چھوٹے موٹے فائدوں کے لیے اسے پیٹتا پھرتا ہے۔ لیکن یہ مطلب نہیں کہ وہ پُرسکون رہ پاتا ہے۔ ایک پل کے لیے بھی اندرونی سکون اسے نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی اپنے ضمیر کی آواز سن کر چلتا ہے تو، وہ چاہے جو بھی کھوئے پھر بھی امیر رہتا ہے کیونکہ اس کے پاس خوشی کا خزانہ موجود ہے۔

صفحات: ۱۶۵

قیمت: ۲۰۰ روپے

ناشر: فکشن ہاؤس، مزنگ روڈ، لاہور

قرآن، اسلام اور عقائد

تبسّم بنتِ زاہد کی تحریر کردہ یہ کتاب اتفاق سے نظر سے گزری۔ انہوں نے اپنی اس چھوٹی سی کتاب میں کچھ بڑے بڑے نکات اُٹھائے ہیں۔ پہلے اُن کا بیان کردہ ایک واقعہ پڑھیے:

''میں ایک ملنے والے پاکستانی کے گھر گئی۔ وہ محترم کچھ دن پہلے پاکستان سے واپس آئے اور وہاں سے ایک قرآن پاک بھی لائے۔ باتوں کا سلسلہ چلا تو میں نے قرآن پاک دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا، وہ محترم قرآن پاک لے کر آئے۔ میں نے پکڑنا چاہا تو جھڑک اُٹھے اور کہنے لگے کہ آپ پہلے وضو کر کے آئیں، پھر ہاتھ لگانے دوں گا۔ میں نے بارہا کہا کہ میں نہا دھو کر آئی ہوں اور پاک صاف ہوں۔ مہربانی سے مجھے صرف دیکھنا ہے کہ اس کی کتابت کیسی ہے لیکن وہ محترم قرآن پاک کو تھامے دور کھڑے رہے اور مجھے دیکھنے تک نہ دیا۔ بس ایک بات بار بار کہہ رہے تھے کہ وضو کر لیں، قرآن کو وضو کے بغیر چھو بھی نہیں سکتے۔''

انسان خدا سے زیادہ اپنی رائے پر اصرار کرتے اور اُسی کو دین بنا لیتے ہیں۔ سیدھی بات میں باریک باریک نکتے نکالنا اور دلیلیں دینا مشغلہ ہے۔ جس طرح قرآن پاک میں گائے کے ذبح و قربانی کا ذکر آیا، کہ ایک سیدھے سادے حکم پر بنی اسرائیل نے بے شمار سوالات اٹھائے۔ حضرت موسیٰ کا ذوالقرنین سے بار بار سوال کرنا یا جیسے اصحابِ کہف کے قصے میں اس بات کا ذکر نہیں کہ وہ غار کہاں ہے۔ پھر بھی مفسّرین نے اس کی تکلیف اٹھائی ہے۔ کوئی کہتا ہے نینوی کے پاس ہے، کوئی کہتا ہے روم میں ہے، بلتا میں ہے جبکہ اصل علم اللہ ہی کو ہے کہ وہ کہاں ہے۔

دیکھا جائے تو اگر اس میں کوئی دینی مصلحت یا ہمارا کوئی مذہبی فائدہ ہوتا تو یقیناً اللہ تعالیٰ ہمیں بتلا دیتا اور

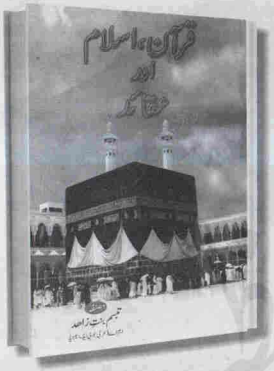

۴/ روپے روزانہ

قطب الدین ایک شکار کھیلتے ایک کھیت میں جا پہنچا۔ وہاں اسے ایک کسان ہل چلاتے ہوئے نظر آیا۔ اس نے کسان سے پوچھا ”تم دن میں کتنا کماتے ہو؟“ کسان نے جواب دیا ”حضور! ۴/ روپے روزانہ کما لیتا ہوں۔“

بادشاہ نے دوبارہ سوال کیا ”تم ان روپوں کو کس طرح خرچ کرتے ہو؟“

کسان بولا ”حضور پہلا روپیہ خرچ کرتا ہوں۔ دوسرا اُدھار دیتا ہوں۔ میرا تیسرا روپیہ قرض اتارنے میں صرف ہوتا ہے اور چوتھا روپیہ کنوئیں میں پھینک دیتا ہوں۔“ بادشاہ کسان کی باتیں سن کر حیران رہ گیا اور بولا ”میں تمھاری ان باتوں کا مطلب نہیں سمجھا۔“

کسان نے کہا ”پہلا روپیہ مجھ پر اور میری بیوی پر خرچ ہوتا ہے۔ دوسرا روپیہ میں اپنے بچوں پر صرف کرتا ہوں۔ تیسرا اپنے والدین پر خرچ کرتا ہوں۔ چونکہ انھوں نے مجھے پالا ہے، لہٰذا ان کا قرض ادا کرتا ہوں۔ چوتھا روپیہ خیرات کرتا ہوں اور دنیا میں اس کا انعام نہیں چاہتا۔

(محمد راشد سیال، ملتان)

اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کی زبانی بیان کراتا۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

”تمھیں جو جو کام اور چیزیں جنت سے قرب اور جہنم سے دور کرنے والی تھیں، ان میں سے ایک بھی ترک کیے بغیر میں نے بتلادی ہیں۔“

اب یہ بات نہ جانے کس نے پھیلائی اور منہ در منہ نسل در نسل چلی آرہی ہے کہ حضرت آدمؑ نے اناج کا دانہ کھایا اور جنت سے نکال دیے گئے۔ قرآن پاک میں اللہ کا فرمان ہے ”پس ان دونوں نے جو درخت چکھا ظاہر ہو گیا ان دونوں کے لیے پردہ ان کا۔“ (سورہ الاعراف آیت ۲۲) اور بھی جگہ لفظ ”الشجرۃ“ آیا۔ الشجرۃ درخت کو کہتے ہیں جبکہ اناج زمین میں اگتا ہے نہ کہ درخت پر۔ اس طرح انجیل میں ہے کہ سیب کا درخت تھا۔ بھئی اتنی بحث کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ کوئی پھل ہوگا جو حضرت آدم وحوا نے کھا لیا، چکھ لیا۔ کیا ان باریک بینیوں میں جائے بغیر اسلام کا راستہ اختیار کرنا اور اس پر چلنا دشوار کن ہے؟

ہر دور میں محدثین، مجتہدین، علما و فقہاء پیدا ہوئے، کتب لکھی گئیں، مستند امام بھی ہوئے اور محدث بھی۔ ہر ایک کا نظریہ الگ الگ لیکن سب قرآن کی تحریر اور اس کی سچائی پر متفق رہے۔ سب کا دین اور مذہب تو ایک ہی ہے، پھر ان حضرات کے نام پر مذاہب کیوں بنا لیے گئے؟ تفاسیر پڑھیں تو لکھا ہوتا ہے:

امام محمدؒ کا مذہب ہے، عطاؒ کا قول ہے، زہریؒ کہتے ہیں، امام مالکؒ فرماتے ہیں، امام شافعی کا مذہب ہے۔

بیان کو اپنے ناموں کے ساتھ منسوب کرنا کیا ضروری تھا اور ہے؟ ہم یہ کیوں نہ پڑھیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہ فرمایا ہے۔ یہ کیوں پڑھیں کہ فلاں امام، محدث، محقق، مفتی اور عالم کا قول ہے۔ یہ تو پھر قرآن کے اصل معانی چھوڑ کر ان محترم حضرات کے معانی و مطالب اور فہم و فراست کی پیروی ہوگئی۔ ایسا کیوں نہیں ہے کہ جو صریح بیانات قرآن پاک میں بیان ہوئے، انہیں بلا چون و چرا مان لیا جائے۔

سورہ قمر (آیت ۱۷) میں ارشاد خداوندی ہے ”یقیناً ہم نے قرآن کو آسان کر دیا، نصیحت والوں کے لیے، پس کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔“ (پھر مشکل کیوں بنا دیا؟)

اور آخر میں یہ بھی پڑھ لیں..... پھر ایک کتاب ”مرنے کے بعد کیا ہوگا“ منظر عام پر آئی۔ لکھنے والے نے ایسے لکھی کہ جیسے محترم نے وفات پا کر خود مشاہدہ کیا اور پھر زندہ ہو کر اپنے مشاہدے کو لوگوں تک پہنچایا۔ ایسی منظر کشی اللہ اللہ!

صفحات:	۱۲۰
قیمت:	۱۵۰/روپے
سٹاکسٹ:	افتخار اینڈ سنز، اردو بازار، لاہور

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

ایک شکوہ، ایک شکایت

ادبی، معلوماتی، دینی، سیاحتی، معاشرتی تحریریں پڑھکر ہمیشہ میرا شوق رہا ہے۔ بلاشبہ اُردو ڈائجسٹ نے مجھے ایک ہی مقام پر سب کچھ دیا جو لائقِ تحسین ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میری زندگی میں میرے کردار میں اُردو ڈائجسٹ کا بہت بہت عکس ہے۔ لیکن مجھے ایک شکایت بھی ہے، گلہ بھی ہے۔ رسالہ میں سب کچھ ہے نہیں ہے تو زراعت کے لیے کچھ نہیں حالانکہ ایک زرعی ملک ہونے اور ۸۰/فیصد آبادی کا زراعت سے وابستہ ہونا اور ایک کثیر الاشاعت ماہنامہ میں کچھ صفحات زراعت، باغبانی، گل بانی کے لیے بھی ہونے چاہئیں۔

(مہر صاحب! تجویز اچھی ہے۔ آپ ہی آغاز کریں۔ کچن گارڈن اور صحن میں اُگائی جانے والی سبزیوں پر کچھ راہنمائی کیجیے۔)

(مہر محمد عظیم تریانہ۔ صدر کسان بورڈ تاندلیانوالہ)

ارفع - اللہ کا احسان تھا - اسی کا مال تھا

ارفع کریمؒ پر فیچر بے حد متوازن، معیاری اور تفصیلی تھا۔ ہمیں تو اس بچی کے بارے میں زیادہ پتا ہی نہیں تھا۔ حد یہ ہے کہ بی بی سی لندن کی وسعت اللہ خاں نے اس پر ایک تعزیتی مضمون لکھا تو اس میں صرف ایک سطر ارفع کریمؒ، باقی سارا مضمون ماسٹر مدن کے گانوں اور موت پر لکھ ڈالا۔ ایک محبت کرنے والے باپ نے اس کی قدر کی، محبت کی، اس پر توجہ دی باقی تو سارا اللہ کا احسان تھا۔ اس نے کیا۔ اس کا مال تھا اس نے واپس لے لیا۔ بہرحال اُردو ڈائجسٹ نمبر لے گیا۔ جس جس نے پڑھا، پسند کیا۔

(محمد ابوبکر۔ جامعہ دارالعلوم کراچی)

سورائسس کی مریضہ کے مسئلے کا حل

فروری کے شمارے میں ”مشورہ حاضر ہے“ میں سورائسس کی مریضہ کا مسئلہ شائع ہوا جو کہ بی ایس سی کی طالبہ ہیں۔ میں اس سلسلے میں اپنی معلومات قارئین کو فراہم کرنا چاہتا ہوں۔ ڈیڑھ ماہ قبل میں نے ایک روزنامہ میں پڑھا تھا کہ اس مرض میں سالہا سال سے مبتلا ایک صاحب نے لاکھوں روپیہ اس مرض کے علاج پر خرچ کر دیا لیکن شفا نہ دارد۔ ان کے بقول ایک حکیم صاحب نے انہیں مسلسل مولی کھانے کا مشورہ دیا۔ مسلسل مولی کھانے سے کچھ عرصے کے لیے افاقہ ہو گیا لیکن جب مولی کا موسم ختم ہوا تو مرض پھر عود آیا۔

موصوف کسی کمپنی میں ملازم تھے۔ وہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں لاہور دوائیں بنانے والی ایک کمپنی میں گئے۔ کمپنی کے مینیجر بھی اس مرض میں مبتلا رہ چکے تھے۔ مینیجر صاحب نے انہیں بتایا کہ آپ ٹائمن ای کا مکمل استعمال کریں، ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب میں نے ٹائمن ای کا استعمال کیا تو میرا مرض غائب ہوگیا اور آج میں ایک صحت مند زندگی بسر کررہا ہوں۔ وہ لاکھوں روپے خرچ کر چکے تھے لیکن ان کی شفا ایک عام ٹائمن میں موجود تھی۔

آخر میں اخبار کے رنگین صفحے پر لکھا تھا کہ یہ مسئلہ مفادِ عامہ کے تحت شائع کیا جارہا ہے۔ اُردو ڈائجسٹ کی وساطت سے میرا بھی ایک جسمانی مسئلہ جو کہ دردوں کے متعلق تھا حل ہوا تھا تب دعا دی تھی۔ اسی فکرمندی سے حل بھیج رہا ہوں۔

(سید طیب علی۔ چک عبدالخالق، دوبنہ)

اَبامیاں کی یاد میں

ڈھاکہ سے ۸۰۰۰ پاکستانی جنگی قیدی جس میں فوجی اور سویلین عورت، مرد اور بچے بھی شامل تھے، میرٹھ کے ۴ کیمپوں میں رکھے گئے۔ جب حافظ نظام الدین کو یہ اطلاع ملی کہ ان کے ڈھاکہ کے ایک عزیز بھی اس کیمپ میں ہیں، آپ اسے ملنے قیدیوں کے کیمپ میں گئے۔ آپ نہ صرف اپنے عزیز سے ملے بلکہ دوسرے قیدی بھی ایک سویلین کو دیکھ کر پاس آگئے اور سبھی اپنی اپنی دردبھری پریشانیاں، مشکلات اور پھر ضروریات بتانے لگے۔ ان پاکستانی قیدیوں کے حالات اور ضرورتیں دیکھ کر آپ ان کی مدد سے انکار نہیں کر سکے۔ ان قیدیوں کی ضروریات اس وقت تک پوری کرتے رہے جب تک قیدی واپس پاکستان نہیں چلے گئے۔ یہی مزاج تھا میرے اَبامیاں کا، جن پر اب میں نے اور میری بہن نے ''اَبامیاں'' کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ اس میں اُردو ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے بہت کچھ سیکھنے اور پڑھنے کو۔

(شیخ صاحب! ہم نے کتاب پڑھ ڈالی ہے۔ دلچسپ اور دُکھی کردینے والی یادیں ہیں۔) (فصیح الدین شیخ۔ ریڈنگ، امریکا)

اَرفع کی موت میں سازش تھیوری

میں احتیاطاً یہ نہیں لکھ رہا کہ بل گیٹس یا امریکیوں نے ارفع کریم کو کھانے میں ملا کر ایسی زہریلی دیر سے اثر کرنے والی مہلک دوائیں کھلائی ہوں گی جس کی وجہ سے اس کی یہ نازک حالت ہوگئی۔

ایک صحت مند، چاق چوبند اور جسمانی لحاظ سے مضبوط لڑکی کو اچانک کیسے موت کی وادی میں دھکیلنے والے عوارض لاحق ہوگئے! صفحہ ۴۳ پر وقار خالق اور ماسٹر مدن کے بارے میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ ان کے دشمنوں کو ان کی عزت و شہرت ہضم نہیں ہوئی اور وہ کم عمری میں مار دیے گئے۔ یہی کچھ ارفع کریم کے ساتھ امریکا میں ہوا ہوگا، لیکن کیا ہمارے ڈاکٹر اس بات کو افشا کرنے کی جسارت کر سکتے ہیں۔ جو ہر وقت امریکا جانے کے چکر میں مبتلا رہتے ہیں۔

سمع خراش کے لیے بےدل سے معذرت خواہ ہوں۔

(عبدالقیوم صاحب! معذرت تو بنتی ہے۔ اچھے بھلے آنکھوں کے سامنے ہوئے واقعہ میں ''سازش تھیوری'' آپ نے کس آسانی سے ڈال دی۔ اللہ زندگیوں کے مالک ہیں۔ انہیں بندوں کو واپس بلانے کے لیے کسی اجازت یا سازش کروانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا مال تھا، واپس لے لیا۔ دُکھ میں بھی توازن برقرار رکھنا مسلمانوں پہ واجب ہے۔ ہمیں تو افسوس بھی تین دن کا بتایا گیا۔ بہت بڑے، کارآمد اور مصنف خرم جاہ مراد نے اپنے بیٹے حسن صہیب مراد کے نام تھیوری یا رول کا آپریشن کروانے کے لیے لندن جاتے ہوئے ایک وصیت لکھی تھی کہ بتا اگر اللہ نے مجھے واپس بلا لیا تو تعزیت کرنے کے لیے آنے والے کوئی آپریشن کو میرے مرنے کی وجہ بتائے گا۔ کوئی ڈاکٹروں کو الزام دے گا۔ تم کسی کو ہاں مت کہنا۔ میری موت کا فیصلہ اللہ کا ہوگا، اپنے وقت پہ ہوگا۔ اسے کسی بہانے کی نہ حاجت ہے نہ ضرورت۔ اسے دل سے مانا خالی اہلِ ایمان پہ واجب ہے۔

(عبدالقیوم۔ اٹک)

کیا کوئی گونگی قوم بھی ترقی کر سکتی ہے؟

میں ایک ایسے پہلو کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لیے لکھ رہا ہوں کہ جسے ہم بھولے ہوئے ہیں۔ وہ ہے ہماری تعلیمی پالیسی۔ ہماری تعلیمی پالیسی میں تبدیلی سے نہ صرف ہم بحیثیت قوم آگے جا سکتے ہیں بلکہ قوم کو الگ الگ نظامِ تعلیم نے جس طرح توڑ رکھا ہے، اس کا بھی ازالہ ہو سکے گا۔ ہمارا مسئلہ ایک جامع تعلیمی پالیسی کا ہے جس کی بنا پر ہم نہ صرف اپنے وطن سے محبت سیکھیں بلکہ اس کے نظریے کو بھی اپنا لیں اور تحقیق کے میدان میں آگے جائیں۔ ہمیں اپنی تعلیمی پالیسی میں خاص طور پہ اساتذہ کی تربیت، دورِ حاضر تہرے تعلیمی نظام کے خاتمے اور قومی زبان کو بطور ذریعہ تعلیم اختیار کرنے کے لیے فوقیت دینا ہوگی۔ ساری قوم انگریزی پڑھ پڑھ کر پاگل ہو رہی ہے۔ کیا سب نے انگریزوں کی خدمت کے لیے برطانیہ چلے جانا ہے یا ساری دنیا سے سیاح سارے کام چھوڑ کر ہماری طرف آنے والے ہیں کہ انگریزی کے بغیر سنبھالے نہیں جا سکیں گے؟ انگریزی تو کیا تبھی ہم اُردو سے بھی گئے۔ کیا کوئی گونگی قوم بھی ترقی کر سکتی ہے؟

(حافظ فراز محمود۔ رول آف آنر۔ بی سی لاہور)

مضمون ضبطِ تحریر میں آچکا ہے

بہت عرصہ قبل ایک مضمون بعنوان ''گُل داؤدی'' ارسالِ خدمت کیا تھا۔ شاید گنجائش نہ ہونے کے باعث شائع نہ ہوسکا۔ دوسرا مضمون بعنوان ''گلاب'' ضبطِ تحریر میں آ چکا ہے۔ اگر اشاعت میں گنجائش ہو تو اِذن فرمائیے تاکہ اَرسال کرسکوں۔

(آپ اپنا مختصر مضمون اور ضروری تصاویر ضرور بھجوائیں۔ جب جب بھی کوئی اچھی چیز لکھیں، تو فون پہ بات کر کے بھجوا دیا کریں۔ یوں پوچھنے اور ہاں کہلانے میں کئی مہینے لگ جاتے ہیں۔)

اُردو کے اَنجانے محافظوں پر تحریر

جہاں تک نئے سلسلوں کا تعلق ہے، مجھے ۳ رنئے سلسلے بہت زیادہ پسند آئے۔ ان میں سے پہلا، نوجوان قیادت اور بزنس میں ترقی کرنے والے پُرعزم لوگوں کی داستان اور انٹرویوز ہمیں بھی مستقبل میں کچھ کرنے کے لیے ابھارتا ہے۔ دوسرا منفرد سلسلہ قصۂ کوئز کا ہے جو تحقیق کی جانب ہمارے قدم بڑھانے پر مجبور کردیتا ہے۔ تیسرا کیریئر کونسلنگ پر مضمون بھی ہم طالب علموں کے لیے بہت مفید ہے۔ اس کے لیے زیادہ صفحات مختص کریں۔ مزید یہ کہ اُس شعبے میں درپیش چیلنجز بھی بتا دینے چاہئیں۔ باقی وڈ میں اُردو کے انجانے محافظوں پر مضمون لکھ کر آپ نے بہت سے لوگوں کی سوچ کا دائرہ وسیع کردیا ہے اور معاملات کو مثبت طریقے سے دیکھنے کا سلیقہ سکھایا حالانکہ آج تک باقی وڈ کے مسلمان اداکاروں پر تنقید ہی سننے کو ملی ہے۔ ایرانیوں کی ڈرون کنٹرول کرنے کی جرأت بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرگئی۔ مجموعی طور پر رسالہ بہت اچھا تھا تاہم پاکستان توڈے کے اشتہار کے حوالے سے آپ کو قوم کے عقائد کا خیال رکھنا چاہیے۔

(اویس علی۔ فیصل آباد)

۲ رسادہ سی تجاویز مگر

اُردو ڈائجسٹ کے لیے ۲ رتجاویز پیشِ خدمت ہیں کہ آپ پرچے میں تلفظ کی بہتر ادائی کے لیے تمام الفاظ پر اعراب کے لیے کوشش کیجیے۔ دوم پرچے میں لسانی اُصولوں کے مطابق جدید املا کو رائج کیجیے۔ اُردو ڈائجسٹ میں اعراب اور جدید املا کے رواج سے مجھ جیسے قاری کے لیے آسانی ہوگی۔ زبان و ادب کے طلبہ و اساتذہ کے لیے اس کی نوعیت انفرادی خصوصیت کی حامل رہے گی۔ اس منفرد تجربے سے ڈائجسٹ کی اشاعت و مقبولیت میں نمایاں ترین اضافے کا بھرپور امکان ہے۔

(حسن راشد صاحب! بظاہر تو پہلی والی سادہ سی تجویز ہے مگر ہمیں دو ماہ سے میں بھی ایک شمارہ مکمل نہیں لے پائے دے گی۔ عملاً ممکن نہ ہوسکے گا۔ پھر اس کا فائدہ بھی نکل نظر نہ آئے۔ جدید املا کو تو ہم پوری توجہ سے اختیار کیے ہوئے ہیں۔)

(حسن راشد۔ سیکرٹری اطلاعات، جماعتِ اسلامی ضلع حیدرآباد)

زیادہ کتابوں کی رسید

ادارہ کی ایک کتاب تبصرے کے لیے حاضر ہے۔ ایک گزارش اور ہے کہ ہمارا ادارہ ہر ماہ ۲ رہا ۳ رنئی کتب پیش کرتا ہے۔ میں وقتاً فوقتاً آپ کو بھیجتا رہوں گا۔ آپ کے پاس کافی کتابیں آتی ہوں گی۔ مناسب ہوگا کبھی کتابوں پر تبصرہ

کرنے کے بجائے وصولی کی رسید اور مختصر سا احوال دے دیا کریں۔ اس سے زیادہ کتب کا تذکرہ ہو سکے گا۔

(شکریہ۔ بے حد مناسب مشورہ ہے۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ سے ہی عمل کرتے ہیں۔)

(رضوان اشرف۔ رمیل ہاؤس اف پبلیکیشنز، راولپنڈی)

اس پر گھل کر بات کرنی پڑے گی

اُردو ڈائجسٹ سے میرا ناتا بہت پُرانا ہے۔ جب اُردو ڈائجسٹ جناب الطاف حسن قریشی کی ادارت میں ایک نئی سج دھج سے شائع ہوا تھا۔ اس وقت اوپلی پرچوں کا سورج تقریباً غروب ہو رہا تھا اور ایک نئے پرچے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ یہ اُردو کا پہلا پرچہ تھا جس نے زندگی اور بندگی کے ہر شعبے کی نمائندگی کی تھی۔ ہر طبقۂ فکر کے لوگوں کا اس طرف رجوع ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کراچی اور لاہور سے بے شمار ڈائجسٹ نکلنا شروع ہوئے مگر بانی اُردو ڈائجسٹ ہی رہا۔ میرے جیسے نو آموز لوگوں کو اس میں لکھنے کی بھی بڑی تمنا تھی، یہ تمنا پوری بھی ہوتی رہی۔ قریشی صاحب نے صحافت اور ادارت کو ایک نیا رُخ بخشا۔ لاہور میں بڑے بڑے موضوعاتی سیمینار بھی منعقد کرنے لگے۔ مجھے بھی مدعو کرتے اور تقریر کرنے کا موقع بھی دیتے تھے۔ گویا اُردو ڈائجسٹ کے ساتھ قلم اور تعلیم کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

مگر خدا جانے سلسلے ہمیشہ ایک جیسے کیوں نہیں رہتے۔ درمیان میں ایک ایسا عرصہ بھی گزرا جب اُردو ڈائجسٹ کی ترسیل..... موجودہ دور کی لوڈ شیڈنگ کی طرح ہو گئی۔

یہ سب بتانے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ جب تیسری بار مجھے ملفوف اور محفوظ شمارہ ملا تو میں نے فوراً پہلا صفحہ کھول کر دیکھا..... کہ یہ کون ہے..... جو ذہن پر دستک دیے چلا جا رہا ہے..... تمہارا نام دیکھ کر میں مُسکرا دی.....

اُردو ڈائجسٹ کی نشاۃِ ثانیہ شروع ہو گئی ہے۔ اللہ تمہیں اور سارے عملے کو یہ خوبصورتیاں، صحت و سلامتی کے ساتھ فزوں تر کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

میں ادب برائے زندگی کی قائل رہی ہوں۔ فنونِ لطیفہ کی جتنی اصناف ہیں وہ زندگی کو سمجھنے، سمجھانے، برتنے، محسوس کرنے اور راستہ دکھانے کے لیے ہوتی ہیں۔ ان میں سے اگر اخلاقیات نکل جائے تو وہ گندگی کی طرف لے جاتی ہیں۔ تم ہر بار نئے سوالات اٹھاتے ہو اور بہت اچھا کرتے ہو۔ ایک بات قابلِ تشویش ہے کہ ہمارے ہاں انسانی رویے منفی ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسروں کو بنڈر مارنے کی کھلی اجازت ہے مگر کوئی اپنے گریبان میں جھانکنا پسند نہیں کرتا۔

الیکٹرونک میڈیا کی یلغار میں تربیت کا عنصر غائب ہو گیا ہے۔ ۲۳ ادارے تھے، جو کردار سازی کا فریضہ ادا کرتے تھے: والدین خصوصاً ماں، اساتذہ اور مساجد۔ اب تربیت سازی الیکٹرونک میڈیا کر رہا ہے۔ ایجادات انسان کی بہتری کے لیے آئیں مگر مفاد پرستوں نے انہیں نشہ کا متبادل بنانا چاہا۔ ہمارے انفرادی منفی رویے سے پاکستان کی ساکھ کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے اور ہمارے اجتماعی غیر ذمے دارانہ رویے سے پاکستان کی معیشت کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے، اس پر گھل کر بات کرنی پڑے گی۔

ایک نولا ملک کے اندر ہمیشہ ہوتا ہے۔ جو مفاد پرست، ابن الوقت، راشی، بدمعاملہ اور خود غرض ہوتا ہے۔ اپنی کمائی ہوئی ساری گندگی بھی حکومت کے ڈسٹ بن میں ڈال کے سرخرو ہو جاتا ہے۔ حکومتیں عارضی ہوتی ہیں، افراد مستقل ہوتے ہیں۔ اب تم اُردو ڈائجسٹ کے ذریعے ایسے مکروہ رویوں پر بات کرو۔ وہ رویے جو ہمارے بزرگوں کی میراث تھے۔ رویے جنھوں نے پاکستان بنایا، پاکستان کے لیے خون بہایا۔ رویے جو آبا و اجداد کی حویلیاں پاکستان پر قربان کر کے آئے۔ جنھوں نے نظریۂ پاکستان پر حلف اٹھایا، صداقت، دیانت، امانت اور محبت والے رویے! ان کو دہرانے کی ضرورت ہے۔ معاف کرنا میں خط لکھتے ہوئے جذباتی ہو گئی..... تمہارے لیے بے شمار اَن گنت دعائیں۔

(بشریٰ رحمٰن۔ وطن دوست بہبودی آسیبی، لاہور)

وزیرِ اعلیٰ پنجاب کی توجہ کے لیے
ملتان روڈ کے ساتھ سروس روڈ کی ضرورت

آپ کے مؤقر رسالے کی وساطت سے وزیرِ اعلیٰ پنجاب کو ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ کروڑوں روپے سے تعمیر کردہ ملتان روڈ کے دونوں اطراف سروس روڈ کی کمی شدید طور پر محسوس ہوتی ہے۔ براہِ کرم اس طرف توجہ دیں۔ بینز فیکٹری اور واپڈا کے دفتر کا کچھ حصہ سروس روڈ کی زمین پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اسے گرا کر ملتان چونگی سے سکیم موڑ تک بالکل سیدھی سڑک بن جائے گی۔ اس طرف فوری توجہ دیں، آپ ہی یہ کام کر سکیں گے۔ جس طرح آپ نے ملتان روڈ کا بظاہر ناممکن کام ممکن کر دکھایا۔ لیکن سڑک کے درمیان سے جگہ جگہ کٹ اور موڑ سائیکل سواروں کی ملتان چونگی سے مسلسل ون وے کی خلاف ورزی کئی سنگین حادثات کا باعث بن چکی ہے۔ میری تجویز ہے کہ دو چار روز منصورہ چوک پر شام کے بعد بھی وارڈن حضرات کی ڈیوٹی لگی رہے تاکہ انتہائی خوفناک طریقے سے ون وے توڑ کر گلزارِ منصورہ مڑنے والے سواروں کو روکا اور سمجھایا جا سکے۔ یہ ان کی جان کی سلامتی کے لیے ضروری ہے اور قانون کی عمل داری کے لیے بھی۔ اسی طرح سبزہ زار مرکزی نالے (بکر منڈی) کے پل سے سڑک کا تھوڑا سا حصہ ہاتی ہے۔ اسے بنا دیا جائے تو لاہور بائی پاس شیرا کوٹ ٹول پلازہ تک پہنچنا بے حد آسان ہو جائے گا۔ جب یتیم خانہ انڈر پاس بنے گا تو یہ بے حد مناسب متبادل راستہ بن جائے گا۔

(اویس خالق۔ سبزہ زار، لاہور)

کتاب بینی کا مستقبل

رسالے کی بہت پُرانی قاری ہوں۔ اب اس میں تبدیلی اور موضوعات کی تبدیلی بھی بہت اچھی لگ رہی ہے۔ مگر ایک بات سوچ کر دل بہت پریشان ہوتا ہے کہ اب کتنے لوگ ہیں جو اخبار اور رسائل کا شوق رکھتے ہیں۔ ہم تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی دیکھیں تو وہاں اخبارات اور رسائل کی طرف سے توجہ سے کم ہو کر ٹی وی ہی ساری توجہ کا مرکز بنتا نظر آ رہا ہے۔ گھر میں رکھی کتابوں کو دیکھ کر دل ڈوب جاتا ہے کہ ہم جس قدر شوق سے اپنی کتابوں کی الماری سیٹ کرتے اور کتب پڑھتے ہیں، ہمارے بچے کمپیوٹر اور موبائل کے اس قدر شوقین ہیں۔ یہ ہی نہیں ان کے وقت کا بیشتر حصہ صرف جاننے پر خرچ ہوتا ہے۔ ان معلومات کو وہ کہاں استعمال کریں گے یا کر رہے ہیں ہمارے لکھنے والے اور آج کا متحرک اور غالب میڈیا وہاں خاموش ہے۔ کوئی نہیں بتاتا کہ اس قدر معلومات فائدہ مند بھی ہیں یا نہیں۔ معلوم نہیں ان معلومات سے معاشرہ، اخلاقیات، فرد پر کیا اچھے یا برے اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟ بظاہر اس کا جواب ہمیں ہر روز سڑک، مارکیٹ اور عام میل جول میں مل جاتا ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو سراسر علم اور جاننے کے شوق سے بے بہرہ ہیں۔ لہٰذا ان کی اخلاقیات، معاشرت دونوں ہی سوالیہ نشان ہیں اور بحیثیت مجموعی یہ ہمارا غم ہے کہ علم بھی ہے مگر عمل اور عملِ صالح دونوں ناپید ہو چکے۔

(طوبیٰ نصیر ملک۔ لاہور)

خوفزدہ کر دینے والے سپیڈ بریکروں سے بھرا شہر

میں ڈرائیونگ میں اتنی نئی بھی نہیں ہوں۔ گاڑی اچھی چلا لیتی ہوں، بچوں کو سکول لے جاتی ہوں مگر کسی کے گھر ملنے جانا ہو تو سوار ہونا پڑتا ہے۔ ہر گلی میں ۱۰/ سے ۲۰/ جگہ انتہائی فضول قسم کے سپیڈ بریکر بنے ہوئے ہیں۔ یہ کیسا شہر

ہے جس کا جی چاہے اور جب چاہے سڑک پر تھوتھان کر راستہ بند کر دے۔ نہ کسی اجازت کی ضرورت عوام کی مشکل اور وقت کا خیال۔ اسی طرح اپنے اپنے گھروں کے باہر اینٹوں کو جوڑ کر اوپر سیمنٹ بجری تھوپ کر پیڈیٹر بکر بنا دیتے ہیں۔ حکومت کو چاہیے اس لاقانونیت اور شہریوں کے حقوق کے خلاف کیے گئے کام کو فوری طور پہ ایک بلڈوزر چلا کر سڑکیں اور گلیاں صاف کروائے۔ بُرا نہ مانیں مجھ سے تو جگہ جگہ ہر پیڈیٹر بکر پر گاڑی بند ہو جاتی ہے۔ کئی بار لوگوں کو منہ کے بل گرتے دیکھ کر میں کتنی دیر خود فرو دہ کھڑی رہتی ہوں۔ تنگ آ کر خلط لکھ رہی ہوں۔ سمجھ نہیں آتی یہ مسئلہ کس سے حل کروایا جائے۔ جو سب کا مسئلہ ہے۔ حکومت کوئی فون نمبر ہی دے دیا کرے۔

(عینی نوید۔ نیو سلم ٹاؤن، لاہور)

اللہ کرے مجھ پر بھی خیر کا سایہ پڑے

میں آپ کی تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ۲۰۱۲ء کے پہلے شمارے میں ان شخصیات کی فہرست میں شامل کیا کہ جن کے ساتھ اپنا نام دیکھ کر نہ صرف مجھے بہت خوشی ہوئی بلکہ یہ احساس بھی اُبھرا کہ یہ لوگ مجھ سے کہیں بہتر اور آگے ہیں، میں آپ کی بہت ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے پاکستان کے عظیم لوگوں کے ساتھ وابستہ کیا۔ اللہ کرے ان لوگوں کی وساطت سے مجھ پر بھی خیر کا سایہ پڑے۔

کیا کہوں، آپ کا ڈائجسٹ اور اس میں شخصیات کا یہ ہار بہ اعتبار قابل قدر ہے۔ یقیناً پچھلے ۵۲ برس میں جو خدمات اُردو ڈائجسٹ نے قارئین اور بالعموم اُمت کے لیے کی ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا کرے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

(بانو قدسیہ۔ داستان سرائے، ماڈل ٹاؤن، لاہور)

حوالہ میری پسند کا۔ احتجاج احتجاج!

ماہ فروری کا ڈائجسٹ لیا، تو سب سے پہلے اپنا پسندیدہ سلسلہ دیکھا مگر وہ نہیں ملا۔ حوالہ میری پسند کا نام بھی اچھا تھا اور کلام اور انداز پیش کش تو بے حد عمدہ تھی۔ جناب سے گزارش ہے کہ اس سلسلے کو جاری رکھیں۔

(ننگ صاحب! سلسلہ تو ہمیں بھی بے حد پسند ہے اسی لیے شروع کیا تھا۔ مگر کیا کریں اکثر شعراء کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ہماری اپنی شاعری لے لیں، دوسروں کی شاعری پڑھنے اور پسند کرنے پر بھروسہ نہیں۔ پہلے تو ہم مذاق سمجھتے رہے کہ وہ تاکثر اس حوالے سے سنجیدہ ہوتے ہیں۔ خیر پھر سے کوشش کرتے ہیں۔)

(نسیمن الدین ننگ۔ بیگم کوٹ، لاہور)

قومی لباس کی بے توقیری بند کروائیں

ایک بات معاشرتی حیثیت سے جس کا تعلق ہے جس کہ طرف کسی کی اب توجہ نہیں گئی، وہ آپ کے ذریعے ارباب اختیار کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ رسالوں، اخبار اور ٹی وی کے ذریعے دیکھتا ہوں کہ نہ صرف قصر صدر، قصر وزیر اعظم اور اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں سیاسی راہنما سوٹ پہن کر گرسیوں پر براجمان ہوتے ہیں جبکہ قومی لباس شیروانی پگڑی یا جناح کیپ پہنا کر چوکیداروں کو ان کے پیچھے کھڑا کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عدالتوں میں بھی یہی حال ہے۔ اس طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

(زبیر صاحب! بہت دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے آپ نے۔ عدالتوں کے اندر معزز جج کو قومی لباس پہنا کر اس لباس کو عزت اور وقعت دینی چاہیے۔ ہمیں یقین ہے جج یہ لباس پہن کر زیادہ پُر وقار لگیں گے۔ دربان چاہے عدالتوں کے باہر ہوں یا ہوٹلوں کی راہداریوں میں فوری طور پہ ان کو قمری پیٹی سوٹ پہنا دینے چاہئیں۔ ساتر اور رنگ چھوٹا کر دیں۔ چاہے تو سر پر ہیٹ بھی کو پہنا دیں کوئی مضائقہ نہیں۔ فائیو سٹار ہوٹلوں کے اندر ویٹروں کو لیے، چھوٹے، عجیب عجیب طرح اور رنگوں کے کوٹ پہنائے جاتے ہیں۔ دربانوں کو ایڈ چڑیاں اور شیروانیاں پہنا کر دروازوں پر کھڑا رکھنا جان بوجھ کر یا نادانستہ اپنے لباس اور پگڑی کو توہین کرنا ہے۔ اسی طرح چوب داروں کو واسکٹ پہنانا اور بابوؤں کو سوٹ اور پتلون میں زیب تن کروانا، اس کو بھی سدھارنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر ملازمین کی وردیہ بندیوں میں لازم کر کے بے توقیر کرنا بہر حال پسند نہیں۔)

(سید محمد زبیر۔ کراچی)

ایسا کل میرے کس کام کا

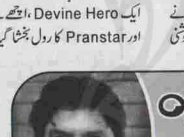

یہ ۲ ہزار سال پرانی ہندوستان کی ایک ریاست ڈھولک پور کے راجہ اندر ور ما اور اس کی بیٹی اندو متی کی نہیں بلکہ ان کی رعایا میں سے ایک بہادر بچے بھیم کی ہمت، طاقت اور سمجھداری کی داستان تھی۔ ۹ سالہ بھیم کو راجہ نے چینی ریاست کے راجہ کی درخواست پر وہاں بھیجا تھا جہاں جا کر بھیم نے لنگفو سے لے کر ہر ضروری چینی داؤ پیچ سیکھا اور پھر وقتِ مقررہ پر ریاست کے دشمن سے لڑ کر اسے شکست سے دوچار کیا۔ چینی ریاست کا راجہ لنگفو بزرگ، عوام بھی اس جیت پر نالیاں بجا رہے تھے کہ بھیم نے کس خوبی اور مہارت سے دشمن کو خاک چٹا دی تھی۔ تالیاں بجانے والوں میں میری ۴ سالہ بیٹی ''انور ے تر مین'' (نیکیوں کی روشنی پھیلانے والی) بھی شامل تھی۔ جس نے گھر پہنچ کر بریف کیس رکھتے رکھتے مجھے کھینچا تھا۔ ''بابا! بھیم آج چین گیا ہوا تھا۔ ان بے چاروں کی مدد کرنے۔''

یاد رہے بھیم ان ''چینی بے چاروں'' کی مدد سے ایک دو روز پہلے عربوں کی مدد کر کے بڑے کامیاب دورے سے لوٹا تھا۔ ''پوگو'' چینل سے ٹیلی کاسٹ ہونے والی ''چھوٹا بھیم'' کی مقبول سیریز کی کئی کہانیاں میرے بچے مجھے حرفاً حرفاً لفظاً لفظاً بلکہ سینا سینا (مُراد سین) دکھا چکے تھے۔ ان سے تو میں نے نہیں کہا، کہوں بھی تو کیا، میری اہلیہ کہتی ہیں اس طرح کی بات سمجھنے کے لیے بچے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ انہیں کچھ کہنے کے بجائے چینل بدل دیتی ہے۔

کارٹون نیٹ ورک (CN) پہ بچوں کے کارٹونوں پر ہر کچھ دیر بعد کارٹون چینل کو بڑے سکون سے Kissing کرتے دیکھ کر بچوں کو کم بڑوں کو کوفت زیادہ ہوتی ہے۔ کارٹون کردار اگر لڑکا ہے تو پورے کپڑے اور اگر لڑکی ہے تو ان کی کوشش ہوگی کہ کپڑے نام کی دھجی بنانے پر جتنا رنگ لگتا ہے، اس کو بھی بچا لیا جائے۔ سی این بند کر کے دوسرا چینل آن کیا گیا تو وہ ہندی ڈبنگ میں تھا۔ بچوں کو خوب پسند آیا۔ ہر بات سمجھ آ رہی تھی اور ساتھ میں ہندی بھی زبانوں پہ آ رہی تھی۔ یہاں سے ''پوگو'' پر منتقل ہوئے۔ بظاہر بڑا تخلیقی چینل ہے۔ بچوں میں مقبول بھی بہت ہے۔ ٹام اور جیری سے، پوپائے دی سیلر تک تو معاملہ ٹھیک رہا پھر اچانک ''کرشنا بلرام'' آ گیا۔ ۲۲ منٹ دورانیے کی یہ ۲۶ کہانیاں تھیں اور ان کا ہدف یا ٹارگٹ آڈینس تھے ۶ سے ۱۲ سال کے بچے۔ کرشنا ہندوؤں کا آٹھواں اوتار ہے۔ اسے ایک Devine Hero، اچھے بچے اور مثالی لوور (Lover) اور Pranstar کا رول بخشا گیا۔ یہ ڈنکو اور بلاؤں کو ہراتا ہے۔ بلرام اس کا بڑا بھائی ہے۔ واسودیو اور دیوکی کے ساتواں بچہ جو ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق معجزاتی طور پہ دیوکی کے پیٹ سے روئی کے پیٹ میں منتقل ہو گیا تھا۔ وہ بھی واسودیو کی بیوی تھی اور گوکل میں رہتی تھی۔ بلرام کو پہلے راما کہتے تھے اب طاقت کے سمبل کے طور پر بلرام کہلاتا ہے۔

اس سے ذرا کم بھاگے تو سامنے چھوٹا بھیم مسکراتا کھڑا تھا۔ یہ بڑے دل والا، ہمیشہ دوسروں کی مدد پہ آمادہ رہنے والا، ۹ سالہ لڑکا ہے۔ اسے لڈو بڑے پسند ہیں اور پوپائے دی سیلر کی پالک کی طرح لڈو کھا کر طاقتور ہو جاتا اور دشمنوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ یہ لڈو اس کی دوست چھٹکی اسے دیتی ہے۔ اس کے ۲ دوست اور بھی ہیں۔ ۵ سالہ راجو (جو ڈھولک پور کی فوج کی سینا پتی (سپہ سالار) کا بیٹا ہے اور بھیم کو رول ماڈل سمجھتا ہے۔) جگو (بندر ہے اور انسانوں کی طرح بولتا ہے)۔ یہ سب ہر مشکل میں ساتھ رہتے اور ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ کالیا ولن ہے اور ان کو تکلیف پہنچانے کا کوئی موقع جانے نہیں دیتا مگر بھیم

ہر بار ان کو بچالیتا ہے۔ بھیم نے کتنی ہی بار اپنی ریاست کے دشمنوں اور حملہ آوروں کو شکست دی ہے۔

دل کی بات کہوں تو بھیم نے ہم سب کو بھی شکست سے دوچار کیا ہے۔ ہمارے فکری راہنما، مذہبی سیاسی جماعتیں، میڈیا کے بڑے بڑے گروپ، سب کو بچّہ جوراہے کے ہرایا ہے۔ شکست کو ماننا اتنا آسان نہیں ہوتا مگر یہ ہوا ہے۔ چلیں پچھلے ۲۰ سال کو چھوڑ دیتے ہیں۔ میڈیا کے عروج اور افتخار کے دنوں کو ہی دیکھ لیں۔ کوئی ایک دراما، کوئی ایک کہانی، کوئی ایک کارٹون ہی قوم کو ایسا دیا ہو کہ آپ کے بچے دیکھ رہے ہوں اور آپ خوشی، آسودگی اور اطمینان کا سانس لے سکیں۔ کوئی کارٹون پکڑ کر جسے تخلیقی طور پر لکھا گیا ہو۔ بہترین دماغوں نے سوچا اور بنایا ہوتا۔ پروفیشنلی تیار کیا گیا ہوتا۔ خوبیوں کے بیچ میں ہندوستانی فلموں کے گانوں کے ٹوٹے چلانے میں کون کی تخلیقی سوچ کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ فلموں کے آئیٹم سانگز جو اپنے بچوں کو کیا بڑوں کو بھی دکھاتے ہوئے سو بار سوچنا پڑے۔ آپ نے معمول کی خبروں کا انٹرٹینمنٹ کے نام پر حصہ بنا کر گھر گھر پہنچا دیا اور پوری قوم کی جھجک اور شرم ہی ختم کردی۔ کسی ایک پروڈیوسر کی ذہنی بلّی کے ایسے مظاہرے پر ہم کیسے تالیں بجاتے ہیں اور پھر اس دوڑ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ایٹورے کے پیچ پیدا ہونے کی تفصیل سے لے کر بیاشا باسو کے بغیر شادی کے مختلف لوگوں کے ساتھ رہنے کی تصویری جھلکیاں دکھانے میں کون سی خیریت اور تخلیقی پن کا اظہار ہوتا ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ایسی حرکتوں پر شرمندہ ہونا تو دور رہا فخر وہ بھی نہیں ہوتے۔ گانوں کے ٹوٹوں سے جو سلسلہ شروع ہوا تھا اب غیر قانونی یا قانونی طور پر ہر چینل سے روزانہ بھارت کی نئی فلمیں دکھانے کی دوڑ تک جا پہنچا ہے۔

۹۰ کی دہائی میں مجھے کئی سال روزنامہ نوائے وقت کے کلچرل صفحے پر کالم لکھنے کا موقع میسر رہا۔ پی ٹی وی لاہور سنٹر آتے جاتے چائا چلا کہ ہر پروگرام، ڈرامہ اور جنگی کہ اشتہار بھی سنٹر ہوتا ہے۔ اشتہار ریلیز ہونے کے باوجود ٹیلی کاسٹ نہ ہو سکتا تھا جب تک اسلام آباد مرکز سے سنٹر ہو کر اجازت نہ مل جاتی۔ اسی ہفتے رات دیر گئے گھر پہنچا تو چینل بدلتے ہوئے ''ہم'' پر رکنا پڑا۔ رتیش دیش مکھ کی فلم کا آغاز ہو رہا تھا اور وہ دفتر جانے سے پہلے دیوار پر لگی ایک نیم عریاں نہیں عریاں تصویر کی ٹانگوں کو برکت کے لیے چوم کر دفتر روانہ ہو رہا تھا۔ اس کی تسلی نہیں ہوئی تو دوبارہ پلٹ کر آیا پھر اسی عمل کو دہرایا۔ یاد رہے یہ چینل پاکستانی خواتین کا چینل ہے۔ اس کی سربراہ ایک خاتون سلطانہ صدیقی ہیں۔ اس کی پروڈیوسر ان کی ۲ بہوئیں ہیں۔ کیا انہوں نے کسی ''سیلف سنسر'' نام کی کسی چڑیا کا نام نہیں سنا۔

کچھ عرصہ قبل انڈیا جانے کا اتفاق ہوا۔ رات شملہ میں گزری، صبح صبح ٹی وی آن کیا تو کم سے کم ۱۸ر چینل ایسے تھے جن پر ان کی مذہبی رسومات اور مجسمے جاری تھے۔ آپ جن کو رول ماڈل بناتے ہیں، جن کی پیروی کرتے ہیں، انہوں نے اپنی مہابھارت سے لے کر شیواجی کو اس خوبصورتی سے بنایا اور چلایا ہے کہ بقول ان کی سب سے نمایاں پروڈیوسر ایکتا کپور کے ''ہمارا فرض تھا کہ اپنی اقدار کو ڈرامہ کا حصہ بناتے۔ ہم نے مہابھارت کے کرداروں کو بھی آج کے عہد کے دلائل دے کر قابلِ قبول اور پسندیدہ بنا دیا ہے۔''

دور کیوں جاتے ہیں بھیم کو ہی لے لیں۔ آندھرا پردیش کے ایک قصبے سکندر آباد میں قائم گرین گولڈ اینی میڈ لمیٹڈ نے ۲۰۰۸ء میں اپنے سی ای او اجیو چیکا کے آئیڈیے پر بچوں کے لیے اس تخلیقی کریکٹر پہ کام شروع کیا۔ یہ مہابھارت کے مشہور کریکٹر کا بچپن ہے جو دنیا کا سب سے مضبوط انسان مانا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہمیں اس پر فخر ہونا چاہیے کہ چھوٹا بھیم انڈیا کے کلچر اور روایت کا اظہار ہے۔ چھوٹا بھیم اس وقت انگریزی، ہندی، تلنگو اور تامل زبانوں کے چینلوں پر انہی کی زبانوں میں دستیاب ہے اور مقبول بھی۔ آئی پیڈ پر اس کی آئی ٹیونز دستیاب ہیں۔ انٹرنیٹ پر چھوٹا بھیم کے وین سٹینڈز، گھڑیاں، سکول بیگز، کی چین، ڈی وی ڈی، کتابیں، فونو فریم، ہیر بینڈز، ہیر کلپس، ایکیونی بکس اور شرٹس دستیاب ہیں۔

۱۰۰۰ر سے زائد بچوں کی فری گیمز کے علاوہ یوگوئی وی پر ۲۲ر منٹ دورانیے کی بھیم کی وہ تمام کہانیاں بھی جو ٹیلی کاسٹ ہو چکی ہیں، دنیا بھر کے بچوں کے لیے موجود ہیں۔ چھوٹا بھیم اور اس کے معروف کرداروں کی ایک لاکھ بارہ ہزار تصاویر کا البم الگ سے ڈاؤن لوڈ کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے ہندو تخلیقی کاروں کی طرف سے اپنی قوم کے لیے یہ ایک یادگار اور بقول ان کے عظیم تحفہ ہے جس نے ان کی مہابھارت، اقدار، روایات اور کرداروں کو تب زندہ کر دیا جب سب آؤٹ آف فیشن ہو رہا تھا۔

اس سے اگلے مرحلے میں اب کہانیوں میں بھیم کے ساتھ کرشنا بھی شامل ہو کر رہے گا۔ تب یہ ایک Unstopable Force بن جائیں گے۔ ان کے عقیدے کے مطابق کرشنا بھگوان ہے۔ وہ ۱۲ر سالہ لڑکے کرشنا کے روپ میں مجبور انسانوں کی مدد کو آتا ہے۔

ہم بھی کیا لوگ ہیں۔ نہ اپنے خدا کو مانتے ہیں، نہ اس کو اپنی زندگی اور کرداروں میں آنے دیتے ہیں۔ نہ اپنی تاریخ اور روایات کو تسلیم کرتے ہیں نہ ان کا تذکرہ ہونے دیتے ہیں۔ نہ اپنے ملک کو مانتے ہیں نہ اس کی جڑوں کی مضبوطی کا سوچتے ہیں۔ ہمیں تو ۶۰ر سالوں میں سیاست کرنی بھی نہ آئی کہ ۴ر لوگوں کو رول ماڈل بنا سکتے۔ نہ ملک چلانا آیا، آدھا تڑوا بیٹھے اور اب آدھے کو بچانے کے لیے چند نوعمر بلوچی لڑکوں کے ہاتھوں یرغمال بنتے جا رہے ہیں۔ نہ میڈیا چلانا آیا، بات تو تب تھی کہ لوگ آپ کے ڈراموں، پروگراموں اور فلموں کو اپنے ہاں دکھاتے۔ اپنی خبروں میں آپ کے کارنامے چلاتے، حد تو یہ ہے کہ اپنے بچوں تک کو دکھانے کے لیے ایک کارٹون فلم، ایک کارٹون سیریز تو دور کی بات ہے ایک کارٹون کریکٹر تک نہیں بنا پائے کہ جس کو چار بچے اپنا رول ماڈل ہی بنا لیتے۔ بزنس کرنے والے اس کی ٹی شرٹوں کو تین تین سو ڈالروں میں نیٹ پر بیچ رہے ہوتے۔ چار چار زبانوں میں اس کے ترجمے ہو کر بک رہے ہوتے، کتابوں، اخباروں میں اس کے پوسٹر ہوتے۔

باتیں سٹریٹجک ڈیپتھ کی اور دعوے سارک اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی قیادت کرنے کے اور حالت یہ ہے کہ ایک بھیم نے سب کو بچّہ جورا بے رحمی سے مار گرایا ہے۔ پیپلز پارٹی بھی اس کے اندر بڑے انقلابی لیڈر اور لکھاری ہوتے تھے، نیا سوچتے اور خوب بولتے تھے۔ کوڑے بھی ان کو اپنی سوچ سے نہ ہٹا سکے تھے، آج ملک کے مالک ہیں۔ شملہ سے جنوب تک ان کے پرچم لہراتے ہیں۔ انہی کی داستانیں اور انہی کے کارنامے ہیں۔ کاش اسی کے کسی لیڈر، لکھاری کو اپنی قوم کی محبت اور مستقبل سوجھا ہوتا۔ میاں صاحبان کی مسلم لیگ (ن) احسن اقبال کی سربراہی میں ۵۰ر سالہ وژن سوچا کرتی تھی، سب خواب ہوئے۔ پی ٹی وی کے سابقہ سربراہ پرویز رشید صرف سیاسی تردیدیں کرنے اور بے مغز وضاحتیں دینے میں ۴ر سال گنوا بیٹھے ہیں۔ پوائنٹ سکورنگ سے بھی کبھی زندگی کے سنجیدہ مسائل حل ہوئے ہیں۔

جماعت اسلامی اپنی پرانی اور نئی محنتوں کو ترازو میں ڈالنے اور برابر رکھنے میں مصروف ہے۔ امیر العظیم فیوچر وژن میں کچھ کر سکتے تھے۔ سالوں پہلے ایرانی فلموں کی اُردو ڈبنگ پر انہوں نے کام شروع کیا تھا جو سیاسی مصروفیات نے کھالیا۔ کراچی میں ادارہ معارف اسلامی کے سربراہ شاہد ہاشمی پیش رفت کر سکتے ہیں اور کس سے کہوں، کس کا سوچوں۔ کاش کسی پروڈکشن ہاؤس کے مالک کو سمجھا سکتا۔

کبھی کی سوچوں کے جہاز اپنے مطلب کی سواریوں سے بھرے کھلے سمندروں میں بے سمت چلے جاتے ہیں۔ کیا براہِ راست ''شیخ دا فیوچر''، تعمیر مستقبل کا پرچم لہرانے والے، باکمال ادارے آفاق کے سی ای او، ابرار سے کہوں، یا خوابوں کی انگلی پکڑے ملک ملک پھرنے والے شاہد وارثی کو آواز دوں کہ بھیم نے اپنی مضبوطی سے مجھے، میرے اپنے بچوں کے سامنے مار گرایا ہے۔ مجھ جیسے کتنے ہی باپ سر جھکائے، ہاتھ پھیلائے منتظر ہیں کہ اتنی بڑی بڑی سیاسی و مذہبی جماعتوں، اتنے بڑے چینلوں، کاروباری و تعلیمی اداروں، تخلیق کاروں، ہنرمندوں کے ہجوم میں کسی کا ہاتھ بڑھے، ہمیں اُٹھائے، یقین چاہیے نہ دلائے بس کچھ کر دکھائے، بہت ہوئی۔ میرے بچوں تک معاملہ رہے تو اچھا ہے۔ بچوں کے بچوں تک بات گئی تو ایسا کل میرے کس کام کا۔

دکھ اور حسرت بھرا دل تو یہ بھی سوچتا ہے کہ ہمارے اکثر کاروباری ادارے اپنی مصنوعات کے اشتہار ہندوستانی اداکاروں سے، صدا کاروں ہندوستانی صدا کاروں سے، موسیقی وہاں کے گلوکاروں اور سکرپٹ انہی کے تخلیق کاروں سے کروانے دبئی اور بمبئی پہنچے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے کہ جو اس خواہش اور کام کو کارپوریٹ سوشل ریسپانسیبلٹی (CSR) سمجھ کر ہی کچھ ڈرامے اور کارٹون فلمیں ان سے بنوا دے۔ میں نے تو ان کا پتا بھی نوٹ کر لیا ہے۔ کیا کریں تاریخ یہی بتاتی ہے۔ اپنے خدا، اپنی تہذیب، اقدار، روایات اور تاریخی کرداروں کو بھلانے والوں کو ہمیشہ دوسروں کے ہی کردار اور اپنے نوٹ کرنے پڑتے ہیں۔